زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان

کتابی سلسلہ

ثـالـث

جلد ۔ ۵ شمارہ ۔ ۱۷

جنوری تا مارچ ۲۰۲۱ء

مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد

مدیر ثالث آفاق صالح

تزئین کار: اعجاز رحمانی

سرورق: محمد نعیم یاد (پاکستان)

رابطہ: : شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر۔۸۱۱۲۰۱

Mob.+91 9430667003

email.eqbalhasan35@yahoo.com

www.salismagazine.in

● پرنٹر، پبلیشر، پروپرائٹر ایڈیٹر ثالث آفاق صالح نے صائمہ پبلیکیشنز، سبزی باغ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۴ سے چھپوا کر شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ مونگیر ۸۱۱۲۰۱ سے شائع کیا۔

● 'ثالث' کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

قیمت۔فی شمارہ : .....۲۰۰ روپے/

سالانہ : .....۸۰۰ روپے/

خصوصی تعاون : .....پندرہ ہزار روپے یا ۳۰۰/امریکی ڈالر

'ثالث' غیر ممالک میں

'ثالث' کی خریداری کی سہولت کے لئے ہم مختلف ممالک میں زرتعاون کی ذیل میں صراحت کر رہے ہیں۔

امریکہ	:	ستر (۷۰) امریکی ڈالر
کناڈا	:	اسّی (۸۰) کناڈا ڈالر
آسٹریلیا	:	پچاس (۵۰) امریکی ڈالر
برطانیہ	:	پچاس (۵۰) برطانوی پاؤنڈ
یو۔اے۔ای	:	ایک سو ساٹھ (۱۶۰) یو۔اے۔ای درہم
عمان	:	بیس (۲۰) عمانی ریال
سعودی عرب	:	ایک سو پچاس (۱۵۰) ریال
قطر:	:	دوسو (۲۰۰) ریال
کویت	:	تیس (۳۰) کویتی دینار
پاکستان	:	دو ہزار پانچ سو (۲۵۰۰) پاکستانی روپے

جن ممالک میں Western Union یا منی گرام کی سہولت ہے وہاں سے مدیر اعلیٰ کے پتے پر رقم بھیجی جا سکتی ہے۔

TMCN اور دیگر تفصیلات درج ذیل ای۔میل پتے پر بھیجی جا سکتی ہیں۔

eqbalhasan35@yahoo.com

سالانہ ممبر شپ کے لئے ہندوستان کے کسی بھی نیشنلائزڈ بینک کے کسی بھی برانچ کے ذریعے درج ذیل اکاؤنٹ میں رقم بھیجی جا سکتی ہے۔

Eqbal Hasan Azad

Allahabad Bank

Jamalpur Branch

A/c No. 20962191966

IFSC Code-ALLA0210009

◀◀ ● ▶▶

فہرست

	اداریہ	اقبال حسن آزاد	۵
	حمد/نعت	محمد شفیع الرحمٰن شفیع	۸۔۹
غزلیں	ارشد عبدالحمید، عین تابش، ڈاکٹر ذکی طارق، فردوس گیاوی، خالد جمال		۱۰۔۱۷
نظمیں	پریمی کی پتنی کو...... پریم گیت کھلنا ٹکہ کا	خورشید اکرم	۱۸
	ثالث	کامران غنی صبا	۲۰
	رہائی	سید اقبال طالب	۲۱
	عذاب	مصداق اعظمی	۲۲
مضامین	سوالات کے آئینے میں...... ''شعر شور انگیز''	سلمان عبدالصمد	۲۳
	مرحلہ دشت میں اک عہد کی تعمیر کا تھا، منظر اعجاز	تفضیل احمد	۳۷
	ہندی فلموں میں اردو کی خوشبو	ڈاکٹر منوّر عالم	۴۲
	احتجاجی لہجے کا شاعر...... وہاب دانش	ڈاکٹر انوار ایرج	۴۹
	اسرار گاندھی کا تخلیقی ارتفاع	ڈاکٹر ارشد اقبال	۵۶
	کٹی ہوئی شاخ...... ایک تجزیہ	ڈاکٹر خالدہ ناز	۶۴
	اکیسویں صدی میں اردو زبان وادب کی اہمیت و معنویت	محمد شارب	۶۸
	''جانے پہچانے لوگ'' کا تنقیدی چہرہ	ڈاکٹر قسیم اختر	۷۸
	مولانا آزاد کی سیاسی وانتظامی صلاحیتیں	محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی	۸۳
	عبدالصمد کے ناول جہاں تیرا ہے یا میرا کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر شاذیہ کمال	۸۹
	شمیم حنفی کے ڈراموں کا فنی مطالعہ	نیر وسید	۹۷
	نسوانی جذبات کی شاعرہ...... پروین شاکر	سجاد رشید	۱۰۳

یاد رفتگاں	راحت اندوری......ایک احتجاجی شاعر	ڈاکٹر محمد یلیین	۱۱۰
خاکہ	حضرت محمد ولی رحمانی دامت برکاتہم	اقبال حسن آزاد	۱۱۶
منتخب افسانہ	کوارنٹین	راجندر سنگھ بیدی	۱۲۱
افسانے	قصاب کی محبوبہ	شموئل احمد	۱۳۰
	ہڈیاں	اسرار گاندھی	۱۳۷
	سفید لباس سیاہ راتیں	احمد رشید علیگ	۱۴۱
	وائرس	تنویر احمد تمّاپوری	۱۴۷
	کھڑکی میں اگا وجود	زویا حسن	۱۵۲
	رفاقت	آسیہ رئیس خاں	۱۵۹
	سو روپے کا نوٹ	تاج الدین محمد	۱۶۲
	شور	نشاط پروین	۱۶۶
ناول کا ایک باب	راج سنگھ لاہوریا	اقبال حسن خاں	۱۶۹
''ثالث ۱۵۔۱۶ (عالمی خواتین نمبر) پر تبصرے	سلیم انصاری، ڈاکٹر منصور خوشتر، ڈاکٹر شاہد جمیل، پروفیسر محمد ظفر الدین، سلمان عبدالصمد، ڈاکٹر شاذیہ کمال، ہاشمی فاطمہ		۱۹۴۔۲۱۵
مکتوبات	شموئل احمد، حسین الحق، مشتاق احمد نوری، نجمہ محمود، عین تابش، رینو بہل، وسیم احمد فدا، وسیم فرحت علیگ، فرحین جمال، ڈاکٹر ارشد رضا، عشرت ظہیر، بلال مختار، فوزیہ اختر ردا، نصرت بخاری، صدف اقبال، شبانہ جاوید		۲۱۶۔۲۲۴

ثالث ملنے کا پتہ

☆ بک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ (بہار) 9304888739 91+

● اقبال حسن آزاد

اداریہ

۲۰۲۰ء کا سال پوری دنیا کے لیے ایک ڈراونا خواب جیسا تھا۔ایک عالمی وبا نے زندگی کے معنی بدل کر رکھ دیئے۔انسان انسان سے ڈرنے لگا۔ گلے ملنا تو دور کی بات، ہاتھ ملانا بھی ممنوع ہوگیا۔دنیا کے سارے کاروبار یک لخت رک گئے۔ اسکول کالج سے لے کر سنیما ہال اور بازار سب بند کر دئے گئے۔ فیکٹریاں خاموش ہوگئیں۔نقل وحمل کے سارے راستے بند ہوگئے۔کھیت سونے ہوگئے۔ جانور سڑکوں پر گھومنے لگے اور انسان گھروں میں میں مقید ہوگئے۔گویا زندگی کا سارا نظام ہی درہم برہم ہوگیا۔ملک عزیز میں تو صورتِ حال اور بھی خراب ہوگئی۔سڑکوں پر اور ریل کی پٹریوں پر مزدور مرنے لگے۔اس بُرے دور میں سب سے خراب رول ہمارے بعض سیاسی رہنماؤں اور کئی ایک پرنٹ اور الکٹرونک میڈیا کا رہا۔انہوں نے عوام کو گمراہ کرنے کی کی ہر ممکن کوشش کی اور اس میں کافی حد تک کامیاب بھی رہے۔اس سے ایک طرف تو وبا تیزی سے پھیلی اور دوسری طرف ملک کی ہم آہنگی اور بھائی چارے کو بھی زبردست خطرہ لاحق ہوگیا۔ لیکن خدا شکر ہے کہ اہلِ وطن نے جوش سے زیادہ ہوش سے کام لیا اور اس طرح حالات حد سے زیادہ بگڑنے نہیں پائے۔البتہ اس نامراد وبا نے ہم سے بہت ساری ادبی شخصیتوں کو ہم سے چھین لیا۔

اُٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں
روئیے کس کے لیے کس کس کا ماتم کیجئے (آتش)

کہتے ہیں کہ ہر تصویر کے دو پہلو اور ہر سکے کے دو رُخ ہوتے ہیں۔اگر ایک طرف وبا نے پوری دنیا میں تباہی مچائی تو دوسری جانب کرۂ ارض کی آلودگی کافی حد تک کم ہوگئی۔قدرت اپنے فطری رنگ میں سامنے آ گئی۔آسمان نیلا دکھائی دینے لگا۔سمندروں کا پانی بھی صاف ہوگیا۔ چرند، پرند اور درند کھلی فضا میں سانس لینے لگے۔ جہاں تک شعر وادب کا تعلق ہے تو اس دور میں کرونائی ادب کے نام سے اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہوگیا۔اب یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ ان نگارشات میں کتنے لعل و گہر تھے اور کتنے سنگ و خشت۔اس عہد میں مشاعرے اور سیمینار پر تو بریک لگ گیا لیکن آن لائن مشاعروں اور سیمینار/ویبنیار کی ایک باڑھ سی آ گئی۔اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ شعر وادب کی رفتار رکنے نہیں پائی اور ساتھ ہی ساتھ

مقامی اور ملکی سطح کے بے شمار شاعر اور ادیب بھی ''بین الاقوامی'' ہوگئے۔

لیکن ادبی سطح پر جو کام واقعی لائق ستائش تھا وہ کتب ورسائل کی اشاعت کا تھا۔اس افراتفری کے ماحول میں بھی بعض رسالے منظر عام پر آئے۔انہی رسائل میں ''ثالث'' بھی شامل ہے جس نے ۵۹۶ صفحات کا عالمی خواتین نمبر نکال کر ایک تاریخ رقم کردی۔الحمدللہ! اس شمارے نے پوری دنیا میں شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔اس قبولیت کے لیے میں محبان ثالث کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ثالث (عالمی خواتین نمبر) کی اشاعت کے فوراً بعد ہی ثالث شمارہ نمبر۔۱۷ کی تیاریاں شروع کر دی گئی تھیں لیکن شومئ قسمت سے میں خود کرونا کا شکار ہوگیا اور لگ بھگ دو مہینے تک بستر علالت پر رہا۔اس دوران میرے گھر والوں، خاص کر میری اہلیہ، میری بیٹی اور بھائی نے جس طرح میری خدمت کی اور رشتہ داروں اور پوری دنیا میں پھیلے ہوئے دوستوں نے جس طرح میری خبر گیری کی، میرا حال چال پوچھا اور میرے لیے دعائیں کیں اس نے مجھے ایک نیا حوصلہ بخشا اور میں صحتیاب ہوتے ہی رسالے کے ادھورے کام کو پورا کرنے میں لگ گیا اور خدا کا شکر ہے کہ شمارہ بروقت آپ تک پہنچانے میں کامیاب رہا۔

''ثالث'' کے عالمی خواتین نمبر میں جناب اقبال حسن خاں کے ہنگامہ خیز اور دلچسپ ناول کی قسط شامل نہیں کی جاسکی تھی۔اس لیے اس شمارے میں اس کی دو قسطیں ایک ساتھ شایع کی جارہی ہیں۔

''ثالث'' روز اول سے ہی پرانے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کی بھی حوصلہ افزائی کرتا آرہا ہے اور اساتذہ کے شانہ بہ شانہ نوجوان قلم کی نگارشات بھی اس میں شامل ہوتی رہی ہیں۔ اس شمارے میں بھی کئی اُبھرتے ہوئے قلم کار شامل ہیں۔لیکن جن تحریروں میں زبان و بیان کی غلطیاں ہوتی ہیں انہیں رد کر دیا جاتا ہے۔ان نئے لکھنے والوں سے گزارش ہے کہ وہ اپنی تحریریں کسی استاد سے اصلاح کروانے کے بعد ہی بھیجیں۔

''ثالث'' اپنے آٹھویں سال میں قدم رکھ چکا ہے۔رسالے کی ویب سائٹ کو دم تحریر انسٹھ ہزار (۵۹۰۰) سے زائد بار وزٹ کیا جاچکا ہے۔آپ بھی درج ذیل لنک پر جا کر رسالے کے تمام شماروں کو نہ صرف پڑھ سکتے ہیں بلکہ ڈاؤن لوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

www.salismagazine.in

◂◂ ● ▸▸

چھپتے چھپتے

۲۰۲۰ء نے جاتے جاتے اردو زبان و ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ناقدر ناول

نگار/افسانہ نگار/شاعر/مترجم/مدیر جناب شمس الرحمٰن فاروقی (آمد.....۳۰/ستمبر ۱۹۳۵ء ۔رفت..... ۲۵/دسمبر ۲۰۲۰ء) کواس خونی سال نے ہم سے چھین لیا۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں (میرؔ)

شمس الرحمٰن جیسی عبقری شخصیتیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔انہوں نے کئی نسلوں کی ذہنی آبیاری کی۔انہوں نے ''شب خون'' جیسا منفرد اور معیاری رسالہ جاری کیا جس کی نظیر اردو ادب میں کہیں اور نہیں ملتی۔ان کی تصنیفات کی ایک طویل فہرست ہے۔''اثبات ونفی''،''اردو غزل کے اہم موڑ''،''اردو کا ابتدائی زمانہ ادبی تہذیب و تاریخ کے پہلو''،''افسانے کی حمایت میں''،''انداز گفتگو کیا ہے''،''تعبیر کی شرح''،''تفہیم غالب''،''شعر شور انگیز (چار جلدیں)''،''شعر غیر شعر اور نثر''،''خورشید کا سامان سفر''،''صورت و معنی سخن''،''غالب پر چار تحریریں''،''گنج سوختہ (شعری مجموعہ)''،''لغات روزمرہ''،''ہمارے لیے منٹو صاحب''،''لفظ و معنی''،''نئے نام''،''نغمات حریت''،''عروض آہنگ اور بیان''،''سوار اور دوسرے افسانے (افسانے)''''کئی چاند تھے سر آسماں (ناول)''،''چار سمت کا دریا''''آسمان محراب'' (شاعری) ہاؤ ٹو ریڈ اقبال''،''سرسید میموریل لکچر'' وغیرہ۔

''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' اردو کے بہترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ان کا ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں بھی شایع ہو چکا ہے۔اس ناول کا انگریزی ترجمہ خود فاروقی صاحب نے The Mirror of Beauty کے نام سے کیا ہے۔انہوں نے چھیالیس ضخیم جلدوں پر مشتمل داستان امیر حمزہ پر کئی جلدوں میں ''ساحری شاہی صاحب قرآنی'' لکھی۔

اُنہیں علی گڈھ مسلم یونیورسیٹی سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری تفویض کی گئی تھی۔وہ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور سرسوتی سمّان سے بھی سرفراز کیے گئے تھے۔وہ پدم شری سے بھی نوازے گئے تھے۔

اللہ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔آمین ثم آمین!

یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ ہمیں آپ کی گرانقدر رائے کا انتظار رہے گا۔(ادارہ)

◂◂ ● ▸▸

● محمد شفیع الرحمن شفیعؔ

حمدِ باری تعالیٰ

جس کی زباں پہ حمد ہو، وہ خوش نصیب ہے
اللہ ہر سوال کا اس کے مجیب ہے

دیکھا نہیں کسی نے علیم و خبیر کو
لیکن رگِ کلو سے وہ سب کے قریب ہے

انسان کو دیا ہے تجسس کمال کا
ہر کھوج خود میں آپ عجیب و غریب ہے

دانشورانِ دہر تذبذب میں آ پڑے
حیرت زدہ جہاں میں بہر سو طبیب ہے

ہے کمترین ذات میں جرثومۂ وبا
انسان کے لیے جو سراپا مہیب ہے

خود بخش دے بشر کے کبیرہ گناہ بھی
دل سے خدا کے سامنے جو بھی منیب ہے

احسن اگر عمل ہو تو ہے آخرت میں عیش
دنیا میں ہر امیر بہت ہی غریب ہے

گلزار ہے جہاں یہ سدا اس کے واسطے
حمد و ثنا میں محو جو بھی عندلیب ہے

انسان کو خدا نے نوازا شعور سے
قدرت پہ غور خوض کرے ،جو لبیب ہے

رحمان ہے،رحیم تو ، مالک ہے دین کا
آسان کر حساب مرا تو حسیب ہے

ایاک نستعین ، کسی سے نہیں غرض
تیرا نہ کوئی مثل ،نہ کوئی رقیب ہے

ہر ذرہ کائنات میں دیوانِ رب شفیع
ہر منتشر ورق پہ نشانِ ادیب ہے

◂◂ ● ▸▸

● محمد شفیع الرحمن شفیعؔ

نعت پاک

خدا نے ذکرِ احمد کو عجب رفعت عطا کی ہے
شبِ معراج اپنے عرش پر محفل سجادی ہے

بنی آدم کے ماوی اور ملجا دونوں عالم میں
شفاعت سب کی فرمائیں گے،شفقت انتہا کی ہے

طہارت میں،عبادت میں،امانت میں،صداقت میں
سخاوت میں،شجاعت میں ہر اک سیرت مثالی ہے

ہے اتنا پرکشش نامِ محمد ، جب کوئی بولے
ہوں لب،ہم بوس دوبارہ،لطافت دیرپا بھی ہے

جہانوں کے لیے رحمت،بشر کے حق میں ہیں نعمت
اطاعت کے عوض ان کی خدا کی مہربانی ہے

اگر اسلام کو بس ایک جملے میں سمجھنا ہو
محمد سے وفاداری خدا کو سب سے پیاری ہے

متمم آپ ہیں اخلاق کے اپنی رسالت میں
بہت ہی دل نشین و پرکشش کردار سازی ہے

کتاب و حکمتِ نورِ ہدایت کے معلم ہیں
ہیں امی آپ لیکن علم میں یہ سرفرازی ہے

سیاست کو نوازا آپ نے حسنِ تمدن سے
ہر اک مذہب کی عزت جس میں،پوری پاس داری ہے

خواتیں کے حقوقِ زندگی محفوظ کر ڈالے
ہر اک مذہب نے جن کو آج تک بدتر سزادی ہے

شفیع خاطی و عاصی ، درودوں کی رہے کثرت
شفاعت آپ کی مل جائے،دل سے آرزو کی ہے

◂◂ ● ▸▸

ShabnamManzil,NearMasjid,Alba
Colony,P.O.PhulwariShareef,
Patna-801505 Mob:9431448749

ارشدعبدالحمید

گل صبر کا چراغ ہوا نے نہیں کیا
دنیا سے ہوگا کیا جو خدا نے نہیں کیا

الجھیڑے اور بھی تھے مگر یہ کسک رہی
زخموں کا اندمال دوا نے نہیں کیا

اس بار بھی لہو پہ نہ باندھا کسی نے بند
اس بار بھی کرشمہ دعا نے نہیں کیا

چلتے تو اہلِ دل پہ زمیں تنگ تھی بہت
رکتے تو رحم کوہ ِ ندا نے نہیں کیا

بلوائیوں میں میرے ہی چہرے کے عکس تھے
پیوندِ خاک مجھ کو قضا نے نہیں کیا

ہم بھول جاتے اپنے بدن کی مصیبتیں
تنگ اس قدر بھی تیری قبا نے نہیں کیا

کلیوں کو مسکرانے کی ترغیب دینی تھی
اتنا سا ایک کام صبا نے نہیں کیا

◂◂ ● ▸▸

پھول پت جھڑ کے خبر دار بھی ہو سکتے ہیں
یہ اجڑ جانے کے آثار بھی ہو سکتے ہیں

ٹوٹ کر ملتے ہیں مہمان سے اس شہر کے لوگ
آپ اس شہر میں بیمار بھی ہو سکتے ہیں

آپ چاہیں تو سیاست پہ بھروسا کر لیں
آپ چاہیں تو سمجھ دار بھی ہو سکتے ہیں

اس قدر رونق ِ بازار زیادہ ہے کہ ہم
ذرا ٹھہرے تو خریدار بھی ہو سکتے ہیں

خدا پر ہے یہ موقوف کہ طوفان ِ
از رہ ِ حوصلہ پتوار بھی ہو سکتے ہیں

آپ مجرم نہیں یہ جرم ہی کافی ہے میاں
آپ ارشد ہیں گرفتار بھی ہو سکتے ہیں

◂◂ ● ▸▸

ارشدعبدالحمید

ہے یہی وقت ، اگر سخت ، وفا پر کوئی ہے
سن بھی لے تیرے درِ جود و سخا پر کوئی ہے

رات کے کان کھڑے ہو گئے , دیپک لرزا
دوست ہو یا کہ عدو پشتِ ہوا پر کوئی ہے

پھر وہی خواب ہے اور خواب میں روشن خیمہ
پھر رواں جادۂ آوازِ درا پر کوئی ہے

حبس کیسا بھی ہو رستے تو نکل آتے ہیں
روک اے یار بھلا دل کی صدا پر کوئی ہے

میں اگر دشت میں ہوں دل میں تراوٹ کیسی
کیوں یہ لگتا ہے لبِ جوے صبا پر کوئی ہے

جس نے چاہا اسے مستحضرِ امکان کیا
پہرہ اس پیکرِ تخئیل نما پر کوئی ہے

تجھ سے بچھڑا ہوں مگر جان ابھی باقی ہے
تسمہ کیا اور مرے تسمۂ پا پر کوئی ہے

◀◀ ● ▶▶

اب بات برابر ہے کسی رہ سے گزر جائیں
قانون سے ہوں قتل کہ قانون پہ مر جائیں

کیا وہ بھی خدا ہے جو دعائیں نہیں سنتا
کیا وہ بھی دعائیں ہیں جو بے فیض واثر جائیں

لاشوں پہ کسی جنگ کے رستے نہیں کھلتے
جو زندہ نہیں ہیں وہ گھروں میں ہی ٹھہر جائیں

دریا میں کسی وقت بھی اُٹھ سکتی ہیں لہریں
پانی سے جو ڈرتے ہیں وہ کشتی سے اُتر جائیں

اس راہ میں ناکامی کا خدشہ ہی نہیں ہے
جانا ہے جنھیں دار پہ بے خوف وخطر جائیں

ہیں فتح کے کاندھوں پہ ندامت کے جنازے
کس منہ سے کسی جشن میں اصحابِ ظفر جائیں

مٹی ترے ہوتے میں ہوا ہو نہیں سکتا
روشن مجھے کر دے کہ مری شمعیں سنور جائیں

◀◀ ● ▶▶

ارشدعبدالحمید

پرندوں کی قطاروں میں کہیں موجود میں بھی ہوں
چمن سے بچھڑی ڈاروں میں کہیں موجود میں بھی ہوں

نظر کے استعارے خامشی کی زندہ تشبیہیں
انھی رمزوں اشاروں میں کہیں موجود میں بھی ہوں

وہ دیکھو جن کے سائے آدمیت سے دمکتے ہیں
زمیں کے ان ستاروں میں کہیں موجود میں بھی ہوں

میں زخموں کو نمائش گاہ میں لا کر نہیں رکھتا
مگر دنیا کے ماروں میں کہیں موجود میں بھی ہوں

یہ خیموں کی طنابیں مسخرے نٹ باز کے کرتب
انھی سرکس کے تاروں میں کہیں موجود میں بھی ہوں

یہیں اونچے کیے تھے بادبانِ زندگی میں نے
اسی دریا کے دھاروں میں کہیں موجود میں بھی ہوں

جبیں اُمید کی ارشد سدا سجدے میں رہتی ہے
نمازوں استخاروں میں کہیں موجود میں بھی ہوں

◀◀ ● ▶▶

عشق کے جاننے والوں کا پتا پوچھتی ہے
یہ غزل اپنے غزالوں کا پتا پوچھتی ہے

آپ سے آپ ہی شاخوں پہ ثمر آتے ہیں
کہیں دانش بھی سوالوں کا پتا پوچھتی ہے

یہ مرے ساتھ ہے لیکن مری ہمراز نہیں
رات ہے اور اجالوں کا پتا پوچھتی ہے

یہ جو اطراف ہیں سب لازم وملزوم میں ہیں
زندگی چاہنے والوں کا پتا پوچھتی ہے

وقت وہ آن پڑا ہے کہ گواہی کے لیے
میری سچائی خیالوں کا پتا پوچھتی ہے

◀◀ ● ▶▶

Plot,No.67
FirdausNagarColony
Tonk(Rajasthan)-304001
Mob:9079863942

عین تابش

گمان و وہم مسلسل یقین ہی کم ہے
سفر میں رنج زیادہ ہے خوش دلی کم ہے

ادھر جو بڑھنے لگا ہے علاقۂ دنیا
تو اس علاقے میں لگتا ہے زندگی کم ہے

بس اک چراغ جنوں ہے اسے جلا کے رکھیں
مہیب رات ہے محفل میں روشنی کم ہے

بہت اداس ہے دل اس طرف کے موسم میں
اس ابتلا میں کسی کا خیال بھی کم ہے

کسی کے ساتھ گذرنا گلوں کی وادی سے
وہ اقتباس سفر جیسے یاد ہی کم ہے

◂◂ ● ▸▸

اب کون آرزوئے ملاقات باقی ہے
تھوڑی سی پھر بھی خوئے ملاقات باقی ہے

جیسے کہ موج کوئی چمکتی ہوخواب میں
کٹتی ہوئی سی جوئے ملاقات باقی ہے

پھر دل نے اس سے ملنے کا ڈھونڈا بہانہ اور
یعنی ابھی وضوئے ملاقات باقی ہے

باد بہار عشق خرابے میں چلتی ہے
یاد جمال کوئے ملاقات باقی ہے

جگنو سا اک چمکتا ہوا راہ عشق میں
قبلہ نمائے سوئے ملاقات باقی ہے

◂◂ ● ▸▸

عین تابش

کچھ لوگ خواب عہد گذشتہ میں کھو گئے
اور جو بچے وہ وقت کے صحرا میں کھو گئے

دیوانگی کو جن پہ بہت ناز تھا کبھی
وہ نیک بخت بھی غم دنیا میں کھو گئے

نکلے تھے سیر کوچہ و بازار کرنے ہم
پھر اس کے بعد شہر تماشا میں کھو گئے

کچھ غم نصیب گرتے مکانوں میں دب گئے
کچھ کم نصیب حیلۂ فردا میں کھو گئے

جو سر بچا رہے تھے قدم بوس ہو گئے
جو کربلا سے بھاگے تھے کوفہ میں کھو گئے

◂◂ ● ▸▸

مجھے خبر نہیں میں کس کو آزماتا ہوں
عجیب نقش بناتا ہوں اور مٹاتا ہوں

ہر ایک منظر موجود بھول جاتا ہوں
گذشتگان کی طرف جب قدم بڑھاتا ہوں

میں ایک خواب ہوں کب کس کو راس آتا ہوں
میں اک خیال ہوں دیکھوں کسے لبھاتا ہوں

تجھے بھلانے کو باہر کی جنگ لڑتا ہوں
اور اس کے بعد میں اندر سے ٹوٹ جاتا ہوں

درون وہم کوئی روشنی لپکتی ہے
پھر اس کے بعد میں سب بتیاں بجھاتا ہوں

بہ ہر فسوں مرے دشمن مجھے بلاتے ہیں
میں اپنے دوستوں کو کم ہی یاد آتا ہوں

◂◂ ● ▸▸

عین تابش

نہ جانے دھوپ کہ سایہ تلاش کس کی ہے
کبھی پتہ نہیں چلتا تلاش کس کی ہے

بس ایک عکس ہے جو ساتھ ساتھ چلتا ہے
اور ایک نقش ہے گویا تلاش کس کی ہے

بس ایک شغل ملا ہے شب فراق ہمیں
کسی کو ڈھونڈتے رہنا تلاش کس کی ہے

میں اپنی ذات کی گہرائیوں میں ڈوب گیا
یونہی کسی نے جو پوچھا تلاش کس کی ہے

یہ کون شخص ہے دیوار جان و دل کے قریب
بھٹک رہا ہے جو تنہا تلاش کس کی ہے

◀◀ ● ▶▶

SahasramCottage,Shanti Bagh,
NewKarimGunj,Gaya-823001
Mob:9234710125

ڈاکٹر ذکی طارق

میری آشفتہ مزاجی کا سبب پوچھتے ہیں
جتنے ہیں خاک بسر شہر کے سب پوچھتے ہیں

کیا گلہ صرفِ نظر کا کریں نقادوں کی
اپنے ہم عصروں کو ہم عصر ہی کب پوچھتے ہیں

چاہی ناموری کے لیے نقدِ فن بھی
ورنہ آسانی سے کب اہلِ ادب پوچھتے ہیں

وہ ہواو ٔں کی نہیں جانتے فطرت شاید
جو چراغوں کو بجھانے کا سبب پوچھتے ہیں

کیا تھے اجداد ہمارے یہ کہانی چھوڑو
دوڑتے لمحے کہاں نام و نسب پوچھتے ہیں

عمر بھر جن کے نشانے پہ رہا میرا وجود
خستہ حالی کا وہی میری سبب پوچھتے ہیں

دل کے اس قریۂ جاں میں چراغاں کیوں ہے
پھول چہرے سببِ جشنِ طرب پوچھتے ہیں

کیوں انہیں شکوہ ہے اپنی نظر اندازی کا
اُن سے کہہ دے کوئی وہ بھی ہمیں کب پوچھتے ہیں

چوٹ پہنچی ہے ذکیشاید اَنا کو اُن کی
کیوں نہیں بڑھتا مرا دستِ طلب پوچھتے ہیں

◀◀ ● ▶▶

دل پر رقم فسانہ ٔ غم کون کر گیا
آنکھیں ہماری خشک تھیں نم کون کر گیا

کس نے رسائی اوجِ ثریا پر دی مجھے
عالم تمام زیرِ قدم کون کر گیا

یہ کون ہمقدم تھا مرا راہِ شوق میں
گم گشتہ حسرتوں کو بہم کون کر گیا

ہم تو تھے منتظر کہ گل آرزو کھلے
دل کو رہینِ تلخی ٔ غم کون کر گیا

شبنم کے ساتھ گزرا ہے کوئی خجستہ جاں
حال اپنا برگِ گل پہ رقم کون کر گیا

نظریں چرا کے کون یہ گزرا قریب سے
جینے کا حوصلہ مرا کم کون کر گیا

آواز دے رہی ہیں پریشانیاں ذکی
یاد اپنی میرے سینے میں ضم کون کر گیا

◀◀ ● ▶▶

564-KelaRoad,Gaushala
Phatak,Ghaziabad-201009(U..P)
,Mob-9818860029

فردوس گیاوی

پرانے ہیں مگر کتنے نئے ہیں
ہمارے زخم تو ہر دم ہرے ہیں
مچھیرا، جال، کشتی کچھ نہیں ہے
ہوا کی دھمکیوں میں ہم پھنسے ہیں
دکھوں کی رات پھولوں سے بھری ہے
خوشی کے دن ہی بے معنی لگے ہیں
فضا میں دھول بن کر رہ گئے ہیں
غبارے خواہشوں کے جو اُڑے ہیں
تغزل ہے کسی کے آنسوؤں میں
یہی سوکھی ندی کے راستے ہیں
کوئی طوفان دستک دے رہا ہے
خموشی کے حوالے بولتے ہیں
کبھی تو خوشبوئے اُمید جاگے
جواں ہونے کو میرے حوصلے ہیں
ہوا پھولوں کی خوشبو لے نہ اُڑنا
یہ ان کی انجمن کے واسطے ہیں
چلو فردوس راہِ زندگی پر
سفر میں کیا ٹھہرنے کے لیے ہیں

◂◂ ● ▸▸

Arif Nagar,Gewal Bigha,
Gaya-823001
9546037777

خالد جمال

دیکھتے جاؤ یوں ہی بس ہاؤ ہو
اک عذاب گمرہی ہے چار سو

ہم نے کب کی تھی بھلا یہ آرزو
کھینچ دی تو نے فصیل ما و تو

دیکھ آیا شہر کی گلیاں تمام
زندگی روندی ہوئی ہے کوبہ کو

عاشقی کے رنگ کھل جاتے تمام
کاش تم ہوتے کسی دن رو بہ رو

خون کو تو رنگ دکھلانے تو دے
خاک کو ہونا ہے اک دن سرخ رو

اڑ رہی ہے وادیٔ امکاں میں خاک
ایسی کب تھی کائناتِ رنگ و بو

◂◂ ● ▸▸

B-17/33A-1
Tilbhandeshwar
Varanasi-221001 (U.P)
Mob:9838202248

● خورشید اکرم

پچھلے دنوں ہندی شاعرہ رشمی بھاردواج کی 'ایک نظم: شوہر کی محبوبہ کے نام' (ترجمہ: اسرار گاندھی، مطبوعہ ثالث شمارہ ۔۱۶۔۱۵) پڑھی۔ ایک غیر معمولی نظم جس میں ایک عورت اس عورت سے مخاطب ہے جس نے اس کا شوہر چھین لیا۔ نظم ایک طرف محبوبہ کو خطاوار بتاتی ہے تو دوسری طرف اپنی کمیوں کوتاہیوں کا بھی اعتراف کرتی ہے۔ جس حسی تناسب اور فکری توازن کے ساتھ یہ نظم لکھی گئی ہے اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ یہاں تک کہ فیض کی نظم 'رقیب سے' بھی اس کے سامنے کھڑی نہیں ہوسکتی۔ نظم کے تاثر میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک وہ عورت جواب کھلنائیکہ بن گئی ہے، اپنا سینہ کھولے میرے سامنے آ گئی اور پھر اس کے لوح دل پر جو لکھا دیکھا وہ اس نظم میں سما گیا۔

پریمی کی پتنی کو..... پریم گیت کھلنائکہ کا

تو میرے کارن دکھی ہوئی ہے/تیرے کارن میں
تو نے دیکھے اس کے/اس کی بانہوں کے کس بل، اس کی چیتا چال
رگوں میں رقصاں گلال/دیکھی اس کے سپنوں کی اڑان
تو نے دیکھے دھوپ سے اجلے دن/میں دیکھوں گی ٹھہرا/دھیمی ہوتی چال/آنکھوں میں اترتی
موتیا بند/گھٹنوں میں پلتا درد/تجھ کو کوئی غرض نہیں تھی
اس کی بنسی، اس کی وینا، اس کے مردنگ سے
میں نے سنا اس کا سار بہار/اس کے ساتھ رقص کیا/اس کے سنگ جھولی/ہوا کے جھولے پر
تو سوئی اس کے ساتھ/پھولوں سے سجائی سیج پر/میں اس کے ساتھ اڑی/اڑن کھٹولے پر
تو نے اس کے جرم دیکھے آنکھیں بند کر کے
یاد ہے وہ تیرے لیے نولکھا مالا لایا تھا/کسی کی گردن ریت کر/تو پہن کر اترائی تھی
اس نے کیا قتل اور تو نے اس کو/اپنی اوٹ میں شرن دیا
اس نے پڑوسی سے اہنکار کیا تھا تیرے لیے/اور تو نے اس کو اپنا ادھیکار سمجھا
اس کی برائیاں خرابیاں کمزوریاں/سب کو تو نے اپنے گھر کے پچھواڑے ڈالا
بس وہ تیرا بنا رہے/بچوں کی خاطر ہی جیے

انہی کی خاطر مرتا رہے/اس کے سب گناہ تو نے
کوڑے دان میں ڈال دیے/مہواری کے لتے میں لپیٹ کر
اس نے پیار کیا/اور تیرے آگے ہاتھ جوڑ کر پیار کا سار دیا
دھرتی ہل گئی، پربت ڈھہہ گئے/تو نے دھارا کالی کا اوتار
نرمنڈوں کی مالا ڈالی/اس کے سینے پر لات دھرا
جو تھا سہاگ تیرا/وہ راکھشس بن گیا/جس کا وَدھ ضروری تھا/کیونکہ.....
.....اس نے جرم کیا تھا پیار کا/'پیار سے بڑھ کر بھی کوئی جرم ہے کیا'
تیرے وکیل نے جرح کیا اور منصف نے/اسے سزا سنائی
دل نکال کر مرتبان میں رکھ دینے کی/پھر وہ رویا/پھر میں روئی
مگر ہمارے آنسو کسی عدالت کے فریادی نہ بن سکے/نہ آنسوؤں کی نمی سے کوئی دیوار سیلی
نہ گونگی چتکار سے کسی کان کے پردے پھٹے/نہ بے آواز بین سے/کسی نیند میں خلل پڑا
میں نے مانگی تھی/تیرے گھر کے آؤٹ ہاؤس میں اپنی قید/مجھے اپنی پینگ سے پیار تھا
تیرے تخت سے بیر نہیں تھا/میں تیرے چوکھٹ آئی تھی بھکشا پاتر لے کر
تو چلائی چور چور/میں آئی گیت گاتی مدماتی/تو گرم توا لے کر دوڑی/نکٹی چڑیل بھگانے کو
وہ تیرا ادھیکار تھا/میں اس کی داسی/جس سے اس نے بانٹی اپنی اداسی
میں نے پاپ کیا/اونچی باڑھ پھاند کر کودی تیرے آنگن میں
اور شیرنی کی طرح اٹھا لائی اپنے بیمار کو/اکیلی گواہی اس ایکنکار کی
میں نے اپنی سانسیں پھونک پھونک کر/اس کے دل میں دھڑکن بھر دی دوبارہ
اس کی رگوں میں بہتا خون پھر سے/اپنے پتھ پر سہج سہج چلا
مان نہ مان/بہت سنبھال کے رکھی ہے
تیری دولت، تیری پونجی، تیرا سب سامان
میں نے اپنے دل کے لاکر میں/اس لاکر کی دو چابی ہے
ہاتھ بڑھا، لے/ایک چابی تیرے پاس!

◂◂ ● ▸▸

115,Type4,Sector-3,SadiqNagar,
NewDelhi110049। Mob : 8010470440

● کامران غنی صباؔ

ثالث

فیصلہ کون کرے
کون ہم راز ہے اس تیرہ شبی کا...
میرا.....
اک طرف رات کی تاریک فضا
کتنے رازوں کو سمیٹے ہوئے تکتی ہے مجھے
اک طرف دل کہ بظاہر تو بہت روشن ہے
جیسے موجوں پہ ہو سورج کی شعاؤں کا ہجوم
اور تہ آب اندھیرا ہی اندھیرا ہر سمت
فیصلہ کون کرے؟
دونوں ہی خاموش ہیں
اور تیسرا کوئی بھی نہیں

◂◂ ● ▸▸

Dept. Of UrduNitishwar CollegeRamna,
Near Pani Tanki,Muzaffarpur-842002Mob 9835450662

راج دیو کی اَمرائی (ناول)

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر

صفحات:۲۱۶ قیمت:۲۵۰/روپے

سنہ اشاعت:۲۰۱۹ء

ربطہ:شاستری نگر، کھپولی، رائے گڑھ(مہاراشٹر)9370821955

● سید اقبال طالب

رہائی

خداوندا!
تری دنیا میں کیوں ہر سو
یہاں اب شر کا غلبہ ہے
کہیں مذہب کے دیوانے
یہاں مقتل سجاتے ہیں
کہ ناحق خوں بہاتے ہیں
ہزاروں آنکھیں کھو بیٹھی ہیں
نور آنکھوں کا رو رو کر
ہزاروں کاندھے بوجھل ہو گئے ہیں
لاشوں کو ڈھوڈھو کر
جہاں شہروں میں پہلے روشنی کا رقص رہتا تھا
خموشی کا بسیرا ہے کہ ویرانوں کا گھیرا ہے
کسے معلوم اس شر کا کیا انجام ہونا ہے
خداوندا! کلیم و منصف و دانا
عزیز و جابر و یکتا
اگر تو شر کا دشمن ہے
تو اب شر کو فنا کر دے
بہت مجبور و بے بس ہیں
ہمیں اس سے رہا کر دے

◀◀ ● ▶▶

57-BrightStreet Kolkata-700019
8420471256

● مصداق اعظمی

عذاب

اس ریا کار کی/آنکھ سے نہ دیکھو دنیا/اپنے ہر جھوٹ کی/تاثیر کو ہر لمحہ جو
زہرِ سقراط کی/توقیر میں گم کرتا ہے/اپنے چھلکائے ہوئے/جام کی مے کو ہر دم
جل وہ گنگا کا/بتانے کا جتن کرتا ہے/اپنے ترشول پہ/آویزاں سروں کو دیکھو
مسکراتے ہوئے/پھولوں کا نشاں کہتا ہے/جلتے بجھتے ہوئے/گلشن کے ہر اک منظر کو
فصلِ گل، فصلِ بہاراں کا سماں کہتا ہے/دشت در دشت/جنوں خیز مسافت کا چلن
اہلِ دل نے جو کیا عام/جنوں والوں میں/چاہنے والوں کی
راہوں میں بچھائے گئے پھول/روحِ پژمردہ پہ/اک بارِ گراں ہے اسکی
گود میں بیٹھے ہوئے/چند نجس لوگوں کے/وہ فقیروں کو بھی/ناپاک سمجھ لیتا ہے
بھوک اور پیاس کے/ماروں کی دہائی تو یہ/اس کے نزدیک/لطیفے کے سوا کچھ بھی نہیں
قتل و غارت کی/کتھاؤں کے رچیتا سارے/اسکے کاغذ میں/جلی حرف سے لکھے ہوئے ہیں
تربیت یافتہ کمزور سپاہی اس کے/توپ سے ٹینک سے
بندوق سے تلواروں سے/مارنے روز نکل آتے ہیں مجبوروں کو
روپ راون کی طرح/اس نے نہیں بدلا ہے/پھر بھی سیتا کا ہرن/کرتا ہے ہر روز یہاں
اب تو ویرانی کا وہ رقص ہے/اس کے ہوتے/گھر کے اندر ہی
چھپی ہیں کئی جنگل کی جڑیں/خوف و دہشت ہے/اجالوں میں اندھیروں والی
اس کے معصوم/اشاروں میں چھپے خنجر سے/امن کے دل میں/بچا قطرۂ خوں بہتا ہے

◀◀ ● ▶▶

Vill:Jamwan,P.O.Mejwan,Phulpur,
Dist:Azamgarh-276304
Mob:9451431700

● سلمان عبدالصمد

سوالات کے آئینے میں ''شعرشورانگیز''

شمس الرحمٰن فاروقی کے دیگر کارناموں سے قطع نظر ''شعرشورانگیز'' بھی ان کے ادبی سفر کا ایک اہم سنگِ میل ہے۔اس میں نہ صرف انھوں نے کلامِ میر کے معانی ومفاہیم متعین کیے بلکہ مطالعۂ شاعری کے لیے ایک نپے تلے ''اندازِ نقد'' کا انکشاف بھی کیا۔ اسے ہم کلاسیکی غزل کی شعریات متعین کرنے کی قابلِ تحسین کوشش کا نام دے سکتے ہیں۔کلامِ میر کی تشریح میں مشرقی شعریات اور کہیں کہیں اسلامی نظریات ومغربی تصورات کو جس طرح بروئے کار لایا گیا اس سے شعری تفہیم کا ایک نیا باب کھلتا ہے۔انھوں نے میر کو قنوطیت کے پردے سے باہر نکالا۔ان کے چونچال پن اور ان کی زندگی کی رنگینیوں کا عمدہ تجزیہ کیا۔اس طرح حزن کے پردے سے نکل کر میر نے ''معنی آفرینی اور کیفیت'' کے ایک سے بڑھ کر ایک مظہر پیش کیے۔شاراحمد فاروقی کہتے ہیں کہ میر کے شعر کی طرح فاروقی کی تنقید میں بھی شورانگیزی ہے۔ یقیناً بہت سے مقامات پر فاروقی کی تنقید میں میر کی شاعری سے زیادہ شورانگیزی نظر آتی ہے۔

''شعرشورانگیز'' کے مطالعے کے دوران جہاں ایک حساس قاری ''اسلوبِ انتقادیات'' کی ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتا ہے، وہیں اس کے ذہن میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔چوں کہ تشریح وتنقید کے باب میں (دلائل کے ساتھ ساتھ) نکتہ رسی اور باریک بینی کی حیثیت بھی مسلم ہے۔اس لیے راقم نے فاروقی صاحب کی نکتہ رسی پر غور کیا تو بہت کچھ سیکھا، سمجھا، بار بار پڑھا (پھر بھی بہت کچھ سمجھنے سے رہ گیا)۔ان کے عالمانہ رویوں سے سیکھنے کے بعد راقم نے اس کتاب پر فکری نہ سہی 'تاثراتی سوالات' قائم کیے (ضروری نہیں کہ ان سوالوں کی کوئی علمی حیثیت بھی ہو، البتہ سوال آخر سوال ہوتا ہے)۔اس کتاب پر لکھے گئے پروفیسر شاراحمد فاروقی، پروفیسر عبدالرشید اور پروفیسر شارب ردولوی کے مقالات کا میں نے گہرائی سے مطالعہ کیا۔ ان دونوں حضرات نے علمیت، تاریخی پہلو اور الفاظ ولغات کی طرف گراں قدر اشارے کیے ہیں۔ان کی نظروں سے میں اس کتاب کو دیکھنے اور پڑھنے کی کوشش نہیں کروں گا۔

پہلے مضمون ''خدائے سخن، میر کہ غالب'' میں کلامِ میر سے متعلق بہت سے مشہور مفروضات پر

منطقی بحث کی گئی۔اسی مضمون سے میر کی جامعیت، سخن طرازی اور شعری اصناف میں ان کی ہمہ گیری سامنے آنے لگتی ہے۔مفروضۂ ''خدائے سخن'' کا کسی حد تک جواز ہاتھ آجاتا ہے۔یعنی ''میر نے غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، رباعی، شہر آشوب، واسوخت اور ہجو تمام تر اصناف میں طبع آزمائی کی.....غالب کا تخیل آسمانی اور باریک تھا، میر کا تخیل زمینی اور بے لگام''۔شاید فاروقی کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ''خدائے سخن کا خطاب میر کو ہی زیب دیتا ہے۔'' چوں کہ اس مضمون میں متعدد مفروضات پر بحث ملتی ہے اس لیے اس مضمون کا نام بجائے ''خدائے سخن، میر کہ غالب''، ''مفروضاتِ میر'' ہونا چاہیے تھا۔ جب کہ اسی میں بہت سی ایسی باتیں بیان کردی گئی ہیں جن کا ''مفروضۂ خدائے سخن'' سے کوئی علاقہ نہیں۔ البتہ غالب کے متعلق فاروقی کا یہ اعتراف قابل تحسین ہے''..... اس دیوان کے مرتب ہوتے وقت ان [میر] کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔اتنی مشق کے باوجود وہ بیدل کے مضمون کو آگے نہ لے جاسکے۔اس کے برخلاف انیس بیس برس کے غالب نے بھی بیدل سے یہی مضمون لیا تو اس میں ایک بات پیدا کردی.....غالب نے جہاں جہاں میر سے مضمون یا کسی بات کا کوئی پہلو مستعار لیا ہے تو ہمیشہ اس میں نئی بات پیدا کی ہے، یا پھر مزید معنویت داخل کی ہے.....'' فاروقی یہ مانتے ہیں کہ مستعار لینے میں غالب، غالب ہیں۔انھوں نے میر (دیگر بزرگ شعرا) سے بھی کچھ لیا تو اس میں جدت اور تنوع پیدا کردی، مگر دوسرے شعرا سے میر نے استفادہ کیا تو وہ اکثر قدیم مضمون کو آگے نہ بڑھا سکے۔

دوسری بات یہ کہ اس اعتراف سے فاروقی کا مقصد فقط اثر لکھنوی اور یگانہ چنگیزی کو رد کرنا تھا (کہ غالب کا کلام ''چربۂ میر'' نہیں بلکہ انھوں نے اپنے پیش رو میر کے مضمون کو بھی آگے بڑھایا) یا پھر اس اعتراف سے ''کائناتِ خدائے سخن'' میں غالب کی حصے داری بھی ثابت ہوتی ہے؟ بندہ حقیر کا خیال ہے کہ شعرائے ماقبل کے مضمون کو غالب نے آگے بڑھایا ہے تو اس میں خود غالب کے 'تخیل آسمانی اور باریک بینی' کا کردار ہے۔اس لیے غالب کے تخیل آسمانی اور باریک بینی پر میر کے 'بے لگام تخیل زمینی' کو ترجیح دینا زیادہ مناسب بات نہیں لگتی۔

فاروقی صاحب کے اس وقیع مضمون سے کسی طور پر ''خدائے سخن'' کا مسئلہ تو حل ہوتا ہے، لیکن اس ضمن میں یہ بات بھی اہم ہوسکتی ہے کہ ادب کی مختلف اصناف (نثر یا نظم، نظم ونثر) پر طبع آزمائی سے کسی کی ہر درجہ فوقیت ثابت نہیں ہوتی۔میر کے برعکس (غالب کی طرح) چند اصناف پر کمال حاصل کرنا ہی معراج کی بات ہے، جیسا کہ اردو کو فاروقی کی تنقید سے معراج نصیب ہوئی۔البتہ مختلف اصناف پر طبع آزمائی سے تحسین کا پہلو ابھر تو سکتا ہے، مگر ''خدائے سخنی'' کے لیے بھی کوئی بڑی دلیل ہاتھ آئے، ایسا کوئی ضروری نہیں۔اصناف کی

رنگا رنگی کی وجہ سے غالب (جیسا کہ آپ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ بہت سے معاملات میں میر سے بہت آگے ہیں) پر فوقیت دیتے ہوئے میر کو 'خدائے سخن' کہنا کہاں زیب دیتا ہے۔

مضمون ''غالب کی میری'' میں کئی اہم پہلوؤں کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ اس عنوان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں فاروقی صاحب نے میر سے غالب کے استفادے کا موضوع اٹھایا ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ سترہ صفحات کے اس مضمون میں بہ مشکل دو صفحات پر یہ موضوع غالب ہے۔ ورنہ پورے مضمون میں ان دونوں عظیم شاعروں کا بھرپور موازنہ کیا گیا (یہ موازنہ میر سے استفادے کے تناظر میں نہیں)۔ بلاشبہ موازنۂ میر و غالب میں بھی بہت سے اہم مسائل زیر بحث آئے جو دوسرے ناقدوں کے یہاں کم ہیں۔ انھوں نے اس مضمون میں ''مضمون آفرینی اور بلند خیالی'' کے فرق کو جس انداز سے واضح کیا، وہ انتہائی اہم ہے۔ فاروقی کے مطابق معنی آفرینی دراصل ایسا طرز بیان ہے جس میں ایک ہی بیان میں کئی طرح کے معنی ظاہر ہوں یا پوشیدہ ہوں۔ اس کے برعکس بلند خیالی جس میں معنی کے زیادہ امکانات نظر نہ آتے ہوں۔ فاروقی نے ان اصولوں کے علاوہ کیفیت و مناسبت لفظی کی روشنی میں کلامِ میر کی تشریح کا نادر نمونہ بھی پیش کیا ہے۔

اسی مضمون میں انھوں نے آڈن اور والیری کے حوالے سے روزمرہ کی بحث قائم کی اور لکھا ''زبان کی عملی یا مجرد استعمالات میں بیان ناپائدار ہوتا ہے، یعنی زبان کی ہیئت، یا اس کا وہ طبعی ٹھوس حصہ، جسے ہم گفتگو کا عمل کہہ سکتے ہیں، افہام کے بعد قائم نہیں رہتا... والیری کا کہنا ہے کہ یہ زبان شاعری کے کام نہیں آسکتی۔ شاعری کی حیثیت زبان بنانی پڑتی ہے۔'' واضح رہے کہ آڈن اور والیری کو اس مضمون میں اس لیے موضوع بحث بنایا گیا کہ روزمرہ کی بحث کی جائے، مگر سچی بات یہ ہے کہ ان دونوں کی باتوں سے کسی بھی سطح پر روزمرے کا استعمال متعین ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی تعریف۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فاروقی صاحب نے یہاں مغربی نظریہ سازوں کے ذکر سے اپنے مضمون کے فقط عالمانہ پہلو کو واضح کیا، نہ کہ کوئی علمی بحث کی۔ واقعہ یہ ہے کہ والیری نے تشکیلاتِ زبان کے متعلق جو نظریہ پیش کیا، اس سے میر کی نہیں، غالب کی زبان قابل اعتبار نظر آتی ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں ''واضح رہے کہ والیری کی تہذیب میں 'روزمرہ' نام کی کوئی اصطلاح نہیں ہے۔ اس لیے یہ سوال بھی ہوتا ہے کہ جب والیری / آڈن کی تہذیب میں روزمرے کا ذکر ہی نہیں تو روزمرے کے تناظر میں ان کے نظریات پر بحث کی کیا ضرورت ہے؟ ان دونوں کے حوالے کے بغیر بھی روزمرے کی بحث ہوسکتی تھی۔ جیسا کہ خود انھوں نے 'میر کی زبان، روزمرہ یا استعارہ' کے تحت ان کے روزمرے کی انفرادیت ثابت کی اور پراکرت، عربی و فارسی کے مانوس فقروں کے استعمالات کو واضح کرتے ہوئے میر کی لسانی عظمت قائم کی۔ ان میں انھوں نے آڈن اور والیری کا کہیں ذکر تک نہیں کیا، مگر ''غالب کی میری''

والے مضمون میں پیوند کی طرح آڈن اور والیری کو حوالہ بنایا ہے۔

اسی مضمون ''غالب کی میری'' کے اس جملے ''.....اس وقت کی مروج شعری زبان سے انحراف اور روزمرہ کو شاعری بنانے کا علم جو میر نے سرانجام دیا، وہ غالب کے کارنامے سے کم وقیع نہیں تھا۔'' سے ایک اور بحث ہوسکتی ہے اور اسی جملے کو واضح انداز میں کچھ یوں لکھا جاسکتا ہے:

اول: زبان کو شاعری کی زبان بنانے میں غالب نے کارنامہ انجام دیا۔

دوم: میر نے اپنے زمانے کی مروج شاعرانہ زبان سے انحراف کیا۔

سوم: تشکیلِ زبان میں غالب کا کارنامہ کیوں کر سامنے آتا ہے؟ اس لیے کہ انھوں نے اپنے زمانے کی مروج زبان سے انحراف کیا۔

چہارم: یعنی میر اور غالب دونوں نے اپنے اپنے زمانے میں رائج زبانوں سے انحراف کیا۔

ان چاروں پہلوؤں کے بعد تھوڑی توجہ دیں۔ میر نے بھی زبان بنانے میں کارنامہ انجام دیا، مگر غالب سے کم۔ اب سوال یہ ہے کہ غالب کے اس کارنامے کا اطلاق کہاں ہوگا؟ میر سے بہت سے معاملات میں (سوائے اصناف کی تعداد کے) غالب، غالب ہیں تو 'خدائے سخن' میں ان کا مقام کیوں نہیں بلند ہوتا؟

اسی ضمن میں دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ میر کے زمانے میں (سودا اور حاتم کے علاوہ) زبان کے زیادہ نمونے نہیں تھے۔ جتنے بھی تھے ان سے میر نے انحراف کیا، مگر غالب کے زمانے میں بہت سے نمونے تھے۔ بہت سی روایتیں تھیں۔ جیسا کہ خود فاروقی صاحب تسلیم کرتے ہیں اور ادبی تاریخ بھی یہی ہے، مگر سوال یہ ہے کہ اپنے زمانے کے اکا دکا نمونوں سے انحراف کرنے والے کی اہمیت زیادہ ہوگی یا پھر مروج رنگا رنگ نمونوں سے خود کو منفرد و مختلف بنانے والے کی برتری تسلیم کی جائے گی؟ گویا جب غالب اس معاملے میں 'بھی' غالب نظر آتے ہیں تو غالب کے مقابلے میں میر کی عظمت کیسی؟ اپنے آسمانی تخیل کے سہارے قدیم شاعروں کے مضمون کو آگے بڑھانے میں بھی میر سے غالب کا مقام بلندتر، زبان بنانے کے معاملے میں بھی میر سے غالب افضل... اس افضلیت سے کیا خدائے سخنی میں غالب کی عظمت نہیں بڑھے گی؟

اسی مضمون ''غالب کی میری'' میں فاروقی نے انتظار حسین کے اس قول سے اتفاق کیا کہ میر میں ایک ناول نگار نظر آتا ہے، مگر آل احمد سرور سے کے اس بیان ''غالب ہمارے سامنے وہ محفل سجاتے ہیں جس میں زمین سے آسمان تک ہر چیز نظر آجاتی ہے'' کی تردید کی اور لکھا کہ ''سرور صاحب کا بیان بالکل درست ہے، لیکن غالب کی محفل محفل ہی رہتی ہے۔ کائنات نہیں بنتی ہے۔'' حالاں کہ سمجھنے والی بات یہ ہے کہ آل احمد سرور نے غالب کی محفل سے ''آسمان و زمین'' کو جوڑا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس کی شاعری میں 'آسمان و زمین

تک کی چیز' کا تذکرہ شامل ہوتو کائنات کا مفہوم ازخود شامل ہوجاتا ہے۔اس لیے سرور صاحب کی بات نہ صرف قرین عقل ہے بلکہ قریبِ کلامِ غالب بھی۔

مضمون ''غالب کی میری'' میں والیری اور آڈن کا حوالہ مناسب نہیں ہے، مگر شعر شور انگیز کی جلد دوم کی تمہید (انتہائی جامع مضمون) میں جب والیری کا حوالہ آیا تو اس میں جان پیدا ہوگئی۔ پھر ان کا ہی ذکر کیا، متن اور منشائے مصنف کے ضمن میں جتنے بھی مغربی مفکرین کے بیان کا جائزہ لیا گیا ان سب کا ذکر (حوالہ) ناگزیر تھا۔ خاص طور سے رچرڈس، الیٹ، ومزٹ، بیرڈسلی، اسپنگارن کیٹس، رومن یاکبسن، دریدا، فوکو، جیرلڈ گریف ٹھوٹھی، ولیم پرن، پال دمان وغیرہ کے نظریات کا نہ صرف تذکرہ وتجزیہ کیا گیا، بلکہ والیری اور رچرڈس سے اختلاف کے مواقع پر فاروقی صاحب نے علمیت اور نکتہ شناسی کا قابل ذکر نمونہ بھی پیش کیا۔ اس مضمون میں فاروقی کی علمیت کی شور انگیزی، علمیت کی اعلیٰ مثال پیش کرتی ہے۔ جن جن مغربی نظریہ سازوں کے جتنے حوالے پیش کیے گئے، (ایسا محسوس ہوتا ہے کہ) اگر ان میں سے کسی ایک کا بھی حوالہ چھوٹ جاتا تو شاید مضمون اور متن ومعنی کی بحث میں کسر رہ جاتی۔ اس لیے ''غالب کی میری'' والے مضمون میں آڈن اور والیری پیوند کی طرح تھے، مگر یہاں ان کے ساتھ ساتھ دیگر مغربی مفکرین وناقدین کا ذکر انتہائی ضروری تھا۔ اس طرح مشرقی نظریہ سازوں کے واقعات اور جملوں سے 'متن سے معنی کی برآمدگی' کے مسئلے پر جو نتیجہ اخذ کیا گیا، وہ نہ صرف فاروقی کی نکتہ رسی کی اعلیٰ مثال ہے بلکہ مشرقی روایات کی اہمیت (اور فکری بحث کی اولیت) بھی ثابت کرتی ہے۔

ہمیں یہ تسلیم ہے کہ میر کی شاعری میں یاسیت ومحرومی کے برخلاف متنوع موضوعات وکیفیات موجود ہیں۔ ''شعر شور انگیز'' کے مطالعے سے پہلے ان تمام موضوعات یا خصوصیات کی طرف، میر کو سرسری پڑھنے والوں کا، ذہن منتقل نہیں ہوا ہوگا۔ کیوں کہ ان پر لکھنے والوں نے بیشتر ان کی محزونیت کا اس قدر ڈنکا بجایا کہ اسی میں میر کی بہت سی منفرد آوازیں دب کر رہ گئیں، مگر اس بات سے انکار نہیں کہ یاسیت بھی شاعری کا ایک حسن ٹھہر سکتا ہے۔ یاسیت بھی قلب دلوں میں عاجزی وفروتنی کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ منشائے منصف کے برخلاف یاسیت سے لبریز شاعری میں بھی کئی معنی چھپے ہوتے ہیں۔ محزونیت کی فضا بھی بسا اوقات ایسی فضا ہوتی ہے جس سے حسی لطافت میں تازگی آجاتی ہے اور انسان کی ذہنی پرواز بھی تیز تر ہوجاتی ہے۔ میر کو گہرائی سے پڑھنے والے اس بات کو ضرور محسوس کریں گے کہ یاسیت ومحرومی میں وہ خود کو تنہا تنہا محسوس نہیں کرتے بلکہ قرأت کے دوران ایک غیر مرئی قوت ان قارئین کو مضبوطی وتازگی کا احساس دلاتی رہتی ہے، ساتھ ہی میر اپنے حزن کے برملا اظہار سے خود بھی شگفتگی آمیز لطف لیتے ہوں گے۔ (آگے کسی مقام پر چند اشعار سے اس بات کی تائید ہوجائے گی) اس لیے شاعری کے اس حزنیہ احساس سے کسی عظیم

شاعر کو کاٹ کر الگ کر دینا قرینِ عقل بات نہیں لگتی۔ میر کی متنوع خصوصیات کو اجاگر کرتے وقت وہ نہ صرف میر کے متعلق حزنیہ رائے کی تردید کرتے ہیں بلکہ میر کی اس خصوصیت کے منکر بھی نظر آتے ہیں۔ اگر کہیں دبے لفظوں میں اس حزن کا اعتراف کر بھی لیتے ہیں تو محض سرسری، گویا یہ شاعری (یا میر) کی کوئی اہم خصوصیت ہو ہی نہیں سکتی۔ میر کے کلام کی تازگی میں اس خصوصیت کو کوئی دخل ہی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ فاروقی صاحب نے میر کی زبان کو چونچال، پرلطف اور کثیر الاستعمال ثابت کرنے کے لیے روزمرہ کے موضوع پر جتنی بحث کی اور ''میر کی زبان، روزمرہ یا استعارہ'' کے عنوان سے دوشان دار مضامین تحریر کیے، اتنی ہی بحث یاس ومحرومی کے دلائل کے بطلان پر بھی کرتے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا کہ جس طرح میر کے محاورے میں قول محال اور ان کے استعاروں میں طنزیہ اسلوب نظر آتا ہے، اسی طرح میر کی یاسیت سے کوئی نغمگی یا موسیقی کی کوئی روایت بھی جڑی ہوئی نظر آتی، مگر انھوں نے شعوری طور پر میر کو اس خاص وصف محروم کر دیا۔ انھوں نے ''شعر شور انگیز'' والے مضمون میں میر کے لہجے کا دھیمان پن، نرمی، آواز کی پستی اور ٹھہراؤ کو موضوع بحث بنایا اور میر کی مروجہ ان خصوصیات کی تردید کی۔ اسی طرح وہ 'یاسیت' کے مشرقی متعلقات اور عالمی انسلاکات کو موضوع بناتے ہوئے کوئی مضمون اس کتاب میں شامل کرتے تو اس میں میر کی انفرادیت بھی واضح ہوتی اور اردو والے 'یاسیت ومحرومی' کے صحیح مفہوم سے آشنا ہوجاتے۔

جیسا کہ اوپر کہیں میر کے حزنیہ پہلو اور اس کے انفرادی مسئلے کی طرف توجہ دلائی گئی۔ اس لیے ذیل میں چند اشعار پیش کر کے ان کے حزنیہ پہلو کو اجاگر کیا جارہا ہے (شاید یہ رائے صائب ہو)۔

درہمی حال کی ساری ہے مرے دیواں میں
سیر کر تو بھی یہ مجموعہ پریشانی کا

اگر فاروقی صاحب میر کی یاسیت کو باقی رکھتے ہوئے اپنے دل نشیں انداز میں اس شعر کی تشریح کرتے تو یہ شعر کہاں سے کہاں پہنچ جاتا اور حزن کی کیفیت سامنے آجاتی۔ میر نے ''مجموعہ پریشانی'' سے بھی اپنے دکھ درد، برہمی ودرہمی اور حزنیہ لے کا اعتراف کیا ہے۔ اس لیے ان کے حزنیہ لَے سے ہمارے لیے انکار کیسے ممکن ہے۔ ساتھ ہی ساتھ میر کے حزن کی انفرادیت 'سیر کر.....تو بھی.....' سے بھی سامنے آتی ہے۔ یعنی میر اپنے حزن سے خود کو ہلاک کر دینا نہیں چاہتے۔ گھٹ گھٹ کر جینا قبول نہیں کرتے بلکہ اس کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ کہا یہ بھی جاتا ہے کہ غم کے اظہار سے غم ہلکا ہوتا ہے۔ شاید میر اسی اصول پر عمل کر رہے ہیں۔ وہ بھی کسی ایک سے دکھ کا اظہار نہیں کر رہے ہیں، بلکہ اس سے دو قدم آگے بڑھ کر اپنے دکھ درد کے مجموعے لوگوں میں بانٹ رہے ہیں۔ 'تو بھی.....' بھی تو اس جانب مشیر ہے کہ پریشانی کے باغ کی سیر کے

لیے اذن عام ہے۔ میر کے اس خوب صورت حزنیہ پہلو کو اس لیے نظر انداز کرنا کہ دوسروں نے اس پہلو کو اپناتے ہوئے رائے قائم کر لی ہے، کوئی مناسب بات نہیں لگتی۔

فاروقی کے مطابق غالب عشقیہ یا جنس کے معاملے میں میر کے مقابلے اس لیے کمزور ہیں کہ غالب کی معشوقہ تصوراتی اور تجریدی نظر آتی ہے اور جرأت اس باب میں اس لیے نہیں ٹھہر سکتے کہ ان کے یہاں چوماچاٹی کی فضا ہے۔ میر کے دیگر جنسی پہلو کے ساتھ فاروقی صاحب کو میر کا پھکڑ پن بھی بہت پسند ہے۔ سوال یہ ہے کہ پھکڑ پن اور چوماچاٹی میں کوئی بہت زیادہ فرق ہے؟ کھینچا تانی اپنی جگہ، تاہم چوماچاٹی کی قبیل سے ہی پھکڑ پن ہے۔ یہ کیسا تضاد ہے کہ ایک کے پھکڑ پن سے غایت درجہ محبت اور دوسرے کی چوماچاٹی سے نفرت! فاروقی صاحب عشقیہ اشعار میں معنویت پیدا کرنے کے لیے جرأت کو سخن طرازی کا مشورہ دیتے ہیں، مگر غالب اس باب میں سخن طرازی کا نمونہ پیش کر رہے ہیں تو بھی انھیں تصوراتی اور تخیلاتی محبوب والے کا طعنہ دے کر (بلکہ بید سے پھٹکار کر) باہر کر دیا جاتا ہے! میر کو پرکھنے کے لیے فاروقی صاحب کے بنائے گئے 'اصول' میں 'پھکڑ پن اور چوماچاٹی کے فرق' کی کوئی واضح بحث ہوتی تو شاید ہم سب بھی پھکڑ پن کی تحسین سے لطف اندوز ہوتے۔ اسی طرح، اس مضمون میں، فاروقی صاحب میر کے اس پہلو کی بہت تعریف کرتے ہیں کہ وہ محبوب کے تئیں 'نانبائی' بن جاتے ہیں، مگر اسے برہنہ نہیں کرتے ہیں، جب کہ جرأت اور ان جیسے دیگر شعرا برہنگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ دوسرے شعرا (کہیں کہیں) اپنے محبوب کو برہنہ کرتے ہیں، میر کا حال تو یہ ہے کہ وہ 'ننگا' لفظ کچھ اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ محبوب کی برہنگی سے ابکائی آنے لگتی ہے۔

مضمون 'بحرِ میر' میں میر کی اس لیے تحسین کی گئی کہ انھوں نے ایک بحر سے اردو کے دامن کو وسیع کیا ہے۔ حالاں کہ بہت سے لوگوں نے اسی بحر کو 'بحر متقارب' تسلیم کیا اور کچھ لوگ اسے ہندی سے ماخوذ سمجھتے ہیں۔ ان دونوں نظریات کے بطلان کے لیے فاروقی صاحب نے جو دلائل پیش کیے ان سے ان کی عالمانہ حیثیت واضح ہوتی ہے۔ ان کی عرق ریزی اور نکتہ رسی یہاں اس طور پر بھی سامنے آتی کہ میر نے ۱۸۳۸ غزلوں سے ۱۸۳ غزلیں زیر بحث بحر میں کہی ہیں۔ تنقید میں اس طرح اعداد و شمار پیش کرنا ایک قابل تقلید مثال ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ مصرعے بتیس حروف، ماترائیں اور مصرعہ کے وقفوں کی مثالوں سے میر کی اس بحر کو ممتاز ثابت کرنا کوئی آسان نہیں تھا مگر خود انھوں نے کئی حوالوں سے لکھا کہ علی عادل شاہ ثانی، میر جعفر زٹلی، سودا، جرأت، وغیرہ نے بھی اس بحر میں اشعار کہے (کم ہی سہی)۔ ظاہر ہے جس بحر میں قدیم شعرا نے بہت سے اشعار کہے ہوں اسی بحر کو 'بحر میر' کہنا تو شاید بہت مناسب بات نہیں ہو سکتی ہے۔

فاروقی صاحب نے ''شعر شور انگیز'' جلد دوم کی تمہید میں مولانا اشرف تھانویؒ کا برمحل حوالہ دیا

اور ژاک دریدا کا بھی۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں ''دونوں کے یہاں واضح طور پر یہ بات موجود ہے کہ اگر متن سے 'کوئی' معنی برآمد ہو سکتے ہیں تو وہ حقیقی معنی ہیں۔ دونوں کے یہاں عندیۂ مصنف کا کوئی ذکر نہیں..... گویا جو بات دریدا نے ۱۹۸۷ میں کہی اسے مولانا تھانوی ساٹھ پینسٹھ برس پہلے (۱۹۲۲) میں کہہ چکے تھے۔''

اس حوالے سے دو باتیں سامنے آتی ہیں:

(۱) متن و معنی کی بحث میں مولانا تھانوی کی رائے کی اہمیت ہے

(۲) دریدا سے کوئی چھ دہائی قبل رائے قائم کرنے کی (مزید) اہمیت

اس اہمیت کو اجاگر کرنے کے بعد 'بحرِ میر' کے موضوع پر غور کیجیے۔ یعنی میر سے پہلے بھی اسی بحر میں کئی شعرا کے کلام موجود تھے۔ لفظ و معنی کی بحث میں 'اولیت و قدامت' کے تناظر میں مولانا تھانوی کے لیے تحسین آمیز اسلوب اپنایا گیا، مگر میر سے پہلے جن شعرا نے موضوع بحث بحر کو اپنایا تو ان کی کوئی وقعت نہیں؟ اس سے انکار نہیں کہ میر نے اس بحر میں جدتیں پیدا کیں۔ جدت کی بنیاد پر کسی کو 'مجدد' تو کہہ سکتے ہیں مگر 'مخترع و بانی' نہیں۔

شعر شور انگیز جلد دوم کی طولانی نہیں 'تمہیدِ معلوماتی' پڑھ لینے کے بعد کوئی فرد منشائے مصنف سے کلام کے معنی کو جوڑنے کی قطعاً وکالت نہیں کر سکتا۔ لیکن تصوف کے حوالے سے ایک سوال ذہن میں آتا ہے جس کا تعلق منشائے مصنف سے بھی ہو سکتا ہے۔ اگر نہیں بھی ہو، تو کم از کم 'سراغِ مصنف' سے ہے ہی۔ پہلے ایک مثال:

مجھ کو نہ اپنا ہوش نہ دنیا کا ہوش ہے
بیٹھا ہوں مست ہو کر تمھارے خیال میں
تاروں سے پوچھ لو میری رودادِ زندگی
راتوں کو جاگتا ہوں تمھارے خیال میں

ان اشعار پر غور کریں تو اس میں بازاری پن ظاہر ہوگا۔ معنی میں کوئی گہرائی نہیں اور لفظیات میں بھی دل کشی نہیں۔ جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ یہ شعر کس کا ہے تو اس کے موضوع (مضمون) سے پردہ اٹھانا بہت مشکل ہے۔ اگر کسی نامور ادیب یا کسی عارف باللہ کی طرف اس کا انتساب کر دیا جائے تو از خود اس میں معنویت آ جائے گی، یعنی عشق مجازی اور عشق حقیقی۔ اگر مصنف نامعلوم ہو تو شاید اک دل جلے کا شعر تسلیم کیا جائے گا۔ سچائی یہ ہے کہ یہ اشعار مولانا عارف پرتاپ گڑھی کے ہیں اور پیر ذوالفقار نے فنافی اللہ کے تناظر میں اس کا ذکر کیا ہے۔ گویا اس کے خالق کے ذکر بعد اس شاعری کی عظمت بڑھ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں 'سراغِ مصنف' کی کیا اہمیت ہوگی؟

حصہ سوم ''شعر شور انگیز'' میں کلاسیکی شاعری کی جو شعریات متعین کی گئی ہیں، ان سے فی زمانہ شاعری کی تشریح میں مدد لے سکتے ہیں۔ کیوں کہ شعریات سے الگ ہٹ کر نہ شاعری کو مضمون آفرینی کا بہترین نمونہ بنایا جاسکتا ہے اور نہ ہی معنی آفرینی کا۔ تیسری جلد میں شامل چار مضامین (بشمول تمہید جلد سوم اور تین ابواب) ایسے ہیں جن کی قرأت کے بغیر غزلیہ شاعری کی تفہیم مشکل ہے۔ ان مضامین میں فاروقی صاحب نے کلاسیکی شعریات کا نہ صرف 'احیا' کیا بلکہ اس شعریات کی روشنی میں اشعار کی تشریح بھی کی۔ ان کے مطابق کلاسک کے مطالعے کے لیے تہذیبی شعور سے آگاہ ہونا لازمی ہے۔ تہذیبی شعور کے بغیر ادب کی تفہیم ممکن نہیں۔ اسی طرح ان کا خیال ہے کہ کلاسیکی اور غیر کلاسیکی ادبی سرمایہ کے جائزے کے لیے کوئی 'آفاقی اصولِ ادب' مرتب نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ ہر ادب کا الگ الگ تہذیبی پس نظر اور شعریات ہوتی ہیں۔ ان مباحث کے علاوہ استعارے کی حقیقت خوب صورت انداز میں واضح کی گئی۔ ساتھ ہی روانی اور کیفیت کو مثالوں سے سمجھایا گیا۔ معنی اور مضمون کی روایت اور ان دونوں کے درمیان پائے جانے والے فرق کو مدلل پیش کیا گیا۔

ان تمام باتوں کے علاوہ تیسری جلد میں فاروقی نے ولی اور سعداللہ گلشن کے موضوع پر روشنی ڈالی اور اس ضمن میں کئی امکانی اور عقلی دلائل پیش کیے ہیں۔ زیر بحث کتاب کے علاوہ انھوں نے اپنی معرکۃ الارا کتاب ''اردو کا ابتدائی زمانہ'' میں ولی کی آمد اور سعداللہ گلشن کے مشورے پر بحث کی ہے۔ چوں کہ دونوں کتابوں میں اندازِ پیش کش مختلف ہے (مگر منشا ایک ہے)، اس لیے پہلے ''اردو کا ابتدائی زمانہ'' سے ایک اقتباس:

> ''ہمیں اس بات پر حیرت لازمی ہے کہ آخر میاں صاحب [سعداللہ گلشن] عرصۂ دراز تک اس بات کے منتظر کیوں رہے کہ ولی، یا دہلی کے باہر والا کوئی آئے تو اسے اپنا قیمتی مشورہ دیں؟... سترہویں صدی کے اواخر کی دلی میں شاہ گلشن کا شمار بڑے فارسی گویوں میں ہرگز نہ تھا۔ ریختہ بھی وہ بس یوں ہی کہہ لیا کرتے تھے۔ اس وقت میرزا عبدالقادر بیدل (۱۶۴۴ تا ۱۷۲۰ء) خود موجود تھے، پھر دوسرے نمبر پر محمد افضل سرخوش (۱۶۴۰ تا ۱۷۲۴ء) کو رکھا جاسکتا ہے... بیدل تھوڑی بہت ریختہ گوئی بھی کر لیتے تھے... اگر کوئی شخص کسی نئے شاعر کو شاہ گلشن سے منسوب مشورہ دینے کے لیے ہر طرح سے استحقاق و مجاز رکھتا تھا، تو وہ بیدل تھے، نہ کہ شاہ گلشن۔'' (اردو کا ابتدائی زمانہ)

مشہورِ زمانہ کتاب ''اردو کا ابتدائی زمانہ: ادبی تہذیب و تاریخ کے پہلو'' میں کئی ایسے مباحث

موجود ہیں جو اردو کی عام تاریخی روایتوں سے متصادم ہیں۔ یہاں ان تمام کی طرف اشارہ مقصود ہے اور نہ ہی محمود۔ البتہ ولی سے متعلقہ باتوں پر نظر ڈالنا ناگزیر ہے۔ کیوں کہ انھوں نے ولی کی دلی آمد کے بعد سعداللہ گلشن سے ملاقات کو کوئی اہمیت نہیں دی، بلکہ اس تناظر میں چند سوالات بھی قائم کر دیے، تاہم ان سوالات کی بنیاد تاریخی نہیں محض عقلی ہے۔ اس سلسلے میں ان کا پہلا سوال یہ ہے کہ سعداللہ گلشن عرصۂ دراز تک اس بات کے منتظر کیوں رہے کہ ولی، یا دہلی کے باہر والا کوئی آئے تو اسے اپنا قیمتی مشورہ دیں؟ فاروقی صاحب کے اس سوال کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے:

اول، یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ سعداللہ گلشن مشورہ دینے کے لیے منتظر بیٹھے تھے۔ دوم، مشورے کا معاملہ حالات سے جڑا ہوتا ہے۔ حالات کے مدنظر کوئی کسی فرد کو مشورہ دے دیتا ہے۔ یہاں معاملہ یہ ہے کہ دہلی آمد کے بعد ولی نے سعداللہ گلشن کو اپنے چند اشعار سنائے۔ گویا نہ انتظار کا کوئی معاملہ ہے اور نہ ہی مشورے کے لیے دہلی سے باہر کے کسی فرد کا مسئلہ۔ بس ایک اتفاق تھا کہ ولی کے کلام میں میاں گلشن کو ایک امکان نظر آیا اور ولی کا کلام سن کر انھوں نے برجستہ مشورہ دے دیا کہ ''یہ سب مضامینِ فارسی، کہ بیکار پڑے ہیں، انھیں اپنے ریختہ میں استعمال کرو''۔ گویا فاروقی صاحب کے سوال کا یہ ایک جواب ہوا۔ ساتھ ہی ان کے مذکورہ سوال پر یہ سوال بھی ہوسکتا ہے کہ کیا غالب منتظر تھے کہ کوئی حالی آئے گا اور وہ ان کو شعر کہنے کا مشورہ دیں گے۔ غالب اور حالی کے معاملے میں بھی اتفاقیہ حالات کی کارفرمائی (پسندیدگی) ہے۔ اگر غالب، حالی کے یہاں امکانات نہ دیکھتے تو قطعاً مشورہ نہیں دیتے۔ بالکل یہی معاملہ ''پیر''، گلشن اور ''مرید'' ولی کا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے دوسرے سوال کا لب لباب یہ ہے کہ جو مشورہ سعداللہ گلشن نے ولی کو دیا، اس مشورے کا مجاز بیدل تھے کیوں کہ بیدل گلشن سے بڑے فارسی گو تھے۔ اس سوال کی نوعیت بھی محض عقلی ہے، تاریخی نہیں۔ کوئی بعید نہیں کہ اگر یہ سوال کلیتہً تاریخی ہوتا تو راقم کی طرح نئے لکھنے والوں کے لیے اس پر کلام بہت مشکل ہوتا، مگر عقلی ہے تو بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ فاروقی صاحب انتہائی معزز ہیں اور میرے لیے تو اِتنے کہ اُن جیسا ناقد فی الحال میری نگاہ میں کوئی نہیں۔ الہ آباد میں وہ مقیم ہیں اور وہیں سید محمد عقیل بھی مقیم تھے۔ اب کوئی اپنے اندر ادبی امکان رکھنے والا نوجوان الہ آباد پہنچ کر فاروقی صاحب سے نہ ملے اور سید محمد عقیل (یا پروفیسر فاطمی) کے یہاں حاضر ہو جائے۔ ادبی گفتگو کے دوران اگر سید محمد عقیل یا پروفیسر فاطمی انھیں کوئی ادبی مشورہ دیں تو کیا اس مشورے کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی؟ کیا ان کے اس مشورے کو یہ کہہ کر رد کر دیا جائے گا کہ الہ آباد میں فاروقی صاحب کی موجودگی

میں کوئی کسی ادیب کو کیوں مشورہ دے سکتا ہے یا پھر فاروقی کے مشورے کی ہی اہمیت ہوگی اور عقیل صاحب کے مشورے کی نہیں؟ راقم کا خیال ہے کہ ہر ذی علم فرد یہی کہے گا کہ دونوں کے مشوروں کی اہمیت ہوسکتی ہے۔ کچھ یہی صورت ہے سعد اللہ گلشن کے مشورے کی۔ یہاں پر فاروقی صاحب کی یہ بات بھی قابل توجہ ہے: ''اس بات کا قوی امکان ہے کہ ولی اور گلشن ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے رہے ہوں۔'' ((اردو کا ابتدائی زمانہ)) اگر یہ پہلو مسلّم ہے تو میاں گلشن کا مشورہ اور بھی بہتر طریقے سے سامنے آئے گا۔ بایں معنی کہ ولی کے گلشن سے مراسم تھے۔ اس لیے ولی جب آئے تو ان کے پاس (بیدل کے پاس نہیں۔ اور دلی آنے سے پہلے بھی وہ ان کو مشورہ دیتے رہے ہوں) گئے ہوں۔ میرزا بیدل کے پاس نہیں۔ ولی اور گلشن کے درمیان قربت تھی۔ چناں چہ ولی کے یہاں پائے جانے والے نئے امکانات سے سعد اللہ گلشن واقف ہوں گے، اسی لیے انھوں نے ایسا مشورہ دیا جس سے ولی کی شاعرانہ ولایت معتبر ہونے لگی۔ جہاں تک سعد اللہ گلشن کی شخصیت کا سوال ہے تو وہ اتنے حقیر، غیر معروف یا غیر ریختہ شناس اور غیر زبان آشنا نہ تھے کہ کسی کو بہتر مشورہ بھی نہ دے سکیں۔ انور سدید نے لکھا ہے ''پھر شاہ گلشن کوئی غیر معروف شخصیت نہیں تھے۔'' (7) اس لیے یہ کہنا پڑتا ہے کہ پیر سعد اللہ گلشن نے نہ صرف ولی کے گلشنِ کلام کو معطر کر دیا بلکہ ولی کی ولایت و کرامت کو بھی استحکام عطا کیا۔

یہ تمام باتیں ''اردو کا ابتدائی زمانہ'' سے ماخوذ ایک اقتباس کے مدنظر کی گئیں مگر ''شعر شور انگیز'' میں بھی ولی اور گلشن کا موضوع مکمل آب و تاب کے ساتھ موجود ہے، اس لیے اس کتاب کی ضمن میں مذکورہ باتوں کو پیش کیا گیا۔ اس بحث کے بعد ان دونوں کے حوالے سے ''شعر شور انگیز'' کے مزید چند پہلوؤں پر گفتگو لازمی ہے۔ کیوں کہ فاروقی صاحب نے ولی اور گلشن کے متعلق سلسلے وار کئی سوالات اٹھائے۔ ذیل میں چار نمبروں کے تحت من و عن فاروقی صاحب کے سوالات پیش کیے جا رہے ہیں اور ہر نمبر کے تحت لکھے گئے سوال کے بعد ''مفروضے'' کے عنوان سے راقم کی ناقص رائے بھی ہوگی۔ (۱) بقول فاروقی:

> ''اگر سعد اللہ گلشن نے ولی کے کلام کی تحسین و توصیف کی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انھیں ولی کا کلام پسند آیا۔ پھر اس بات کی کیا ضرورت تھی کہ وہ انھیں 'مضامین فارسی' برتنے کا مشورہ دیتے؟''

مفروضہ: فاروقی صاحب کے مذکورہ سوال کا جواب بہت آسان ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں کہ ہم اکثر اسی کو مشورے دیتے ہیں جس کو ہم پسند کرتے ہیں۔ غالب نے حالی کو مشورہ اس لیے دیا کہ ''حالی کا کلام'' غالب کو کسی حد تک پسند آیا۔ اسی طرح سعد اللہ گلشن نے ولی کے کلام کو پسند کیا،

اس لیے انھوں نے بھی ولی کو مشورہ دیا۔ چناں چہ یہ مطلب نکالنا کہ پسندیدگی کے بعد مشورے کا جواز ختم ہو جاتا ہے، شاید مناسب بات نہیں۔ (۲) بقول فاروقی:

> ''میاں گلشن کے مشورے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ وہ اس بات سے واقف نہ تھے کہ اردو کے شعرا عرصۂ دراز سے فارسی مضامین برت رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میاں گلشن کو اردو ادب کے بارے میں کچھ خبر نہ تھی۔ یہ بات قرین قیاس نہیں۔''

مفروضہ: بالکل، سعد اللہ گلشن کو معلوم تھا کہ ہندوستانی شعراء فارسی مضامین، اردو یعنی 'سبک ہندی' میں برت رہے ہیں۔ ولی بھی برت رہے تھے (جیسا کہ ولی کے عہد کے گجرات و دکن میں ہندوستانی اور ایرانی شعریات کی کشمکش نظر آتی ہے۔) اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ولی کے یہاں بھی ایرانی اور ہندوستانی شعریات کی کشمکش جاری ہو۔ گلشن نے ولی کے یہاں پائی جانے والی اسی 'کشمکش' کو پسند کیا ہو اور اسی 'پسندیدگی' کی بنیاد پر ولی کو مشورہ دیا ہو کہ 'اور زیادہ فارسی مضامین' اپنے اشعار میں لاؤ۔ (۳) بقول فاروقی:

> ''شاہ گلشن ایک متدین اور ثقہ شخص تھے۔ یہ بات قرین قیاس نہیں کہ انھوں نے ایسی غیر اخلاقی بات کہی ہو کہ فارسی والوں کے مضامین اردو میں لکھو، تمھیں پکڑنے والا کوئی نہیں؟ پھر جب خان آرزو، بیدل، ٹیک چند بہار سیالکوٹی مل دارستہ، آنند رام مخلص جیسے لوگ موجود تھے، جو فارسی اور اردو میں ذو لسانین تھے تو یہ کہنا بے معنی تھا کہ مضامین خوب نظم کرو، محاسبہ کرنے والا کوئی نہیں۔''

مفروضہ: اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ سعد اللہ گلشن نے فارسی مضامین کو من و عن اردو میں منتقل کرنے یعنی اپنے نام سے فقط ترجمے کا مشورہ نہیں دیا تھا۔ برتنے کا مشورہ دیا۔ 'برتنے' کے لفظ سے ترجمے یا چوری کا پہلو نکالنا قرین عقل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ یہ کہنا شاید مناسب نہیں کہ گلشن جیسے متدین شخص ولی کو 'غیر اخلاقی بات' کی تعلیم کیسے دے سکتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ استفادہ یا متقدمین کے مضمون کو آگے بڑھانے کی روایت اردو میں موجود ہے۔ میر سے غالب نے بھی استفادہ کیا۔ پھر غالب نے دیگر فارسی اور ہندی شعرا کے مضمون کو اپنے کلام میں باندھا، یعنی استفادہ کرتے ہوئے انھوں نے متقدمین کی پرانی بات میں ایک نئی بات پیدا کر دی۔ (شعر شور انگیز کی پہلی جلد کے پہلے مضمون ''خدائے سخن، میر کہ غالب'' میں بھی یہ بحث موجود ہے۔) اس لیے سعد اللہ گلشن کے مشورے کو فارسی مضامین کے ''ترجمے یا چوری'' کے پس منظر میں

دیکھنا کوئی بہتر بات نہیں۔(۴) بقول فاروقی:

''اصل بات یہ ہے کہ ولی کا اپنا کارنامہ ہے کہ انھوں نے دکن والوں کی ملی جلی طرز کو ترک کیا اور سبک ہندی اختیار کیا۔''

مفروضہ: یہ بات مسلم ہے کہ ''مشورہ'' اور ''کارنامہ'' دونوں الگ الگ چیز ہے۔ یقیناً ولی نے ''سبک ہندی'' میں فارسی مضامین کو برتا ہے تو یہ ان کا 'اپنا کارنامہ' ہی ہے۔ لیکن اتنی بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ سعداللہ گلشن کے مشورے سے ولی کا کارنامہ 'مسخ، مجروح، کم تر، ناقابل اعتبار' نہیں ٹھہرتا۔ یعنی اگر ولی ان کا مشورہ قبول کرلیں تو بھی ان کے 'کارنامے' پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ اس لیے یہ کہنے میں کوئی دقت نہیں کہ یقیناً ولی (دلی آنے) سے پہلے بھی کارنامے کا نمونہ پیش کر رہے تھے مگر زیر بحث مشورے کے بعد ولی کو 'مکمل کارنامہ' انجام دینے میں مزید آسانی ہاتھ آئی ہو۔

''شعر شور انگیز'' میں شامل تمام مضامین (بہت سے اشعار کی تشریح) پڑھنے کے بعد سلسلے وار مزید چند تاثراتی پہلوؤں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ ان پہلوؤں میں طنز بھی ہے اور کچھ حقیقت بھی، کچھ لفاظی بھی، کچھ سچائی بھی:

(۱) جس کی عربی، فارسی اور انگریزی انتہائی شان دار (تقریباً مادری-باپ کی-زبان) نہ ہوجائے، وہ اگر تنقید لکھے گا تو بلاشبہ وہ تنقید کا حق ادا نہیں کر پائے گا۔ گویا تنقید (اردو میں) لکھنے کے لیے مادری زبان کے ادب کو ہی پینا کافی نہیں بلکہ عربی و فارسی کے ساتھ ساتھ انگریزی کا دریا بہانا از حد ضروری ہے۔

(۲) مجھے ''شعر شور انگیز'' کی پہلی جلد کے علاوہ بقیہ تینوں جلدوں کے مضامین زیادہ عالمانہ معلوم ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ان مضامین میں ''کھینچم کھانچ'' کم نظر آتی ہے۔ ان سب کے اس قدر جامع ہونے کی یہ بھی وجہ ہوسکتی ہے کہ مکمل آب و تاب کے ساتھ ان میں 'ممدوح میر' موجود نہیں۔ ان مضامین میں کسی ایک بحث کو پھیلا کر اختتام میں شان دار طریقے سے مربوط کر دیا گیا یا پھر ان میں جو بحث کی گئی، اس بحث کا پورے مضمون سے گہرا ؤ لگا ؤ واضح ہوتا ہے۔

فاروقی کی تنقید کی یہ بھی انفرادیت ہے کہ وہ ایک مفروضے کو ثابت کرنے کے لیے متعدد دلائل پیش کرتے ہیں اور نتیجتاً آخر میں اسی مفروضے کو ثابت کر لیتے ہیں۔ اس لیے ان کے مضامین میں پھیلا ؤ کی صورت نظر آتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ 'غالب کی میری' اور 'خدائے سخن میر کہ غالب' میں فاروقی کی انفرادیت والا کوئی پھیلا ؤ نہیں، بلکہ ایک ہی مضمون میں کئی ایسے بیان بھی ہیں جن کا نفسِ مضمون سے کوئی تعلق نہیں، یا پھر مضمون کے لیے منتخب کیے گئے عناوین سے کوئی علاقہ نہیں۔

(۳) میرا ذاتی خیال ہے کہ کہیں کہیں کلامِ میر سے زیادہ فاروقی کے اندازِ تشریح میں دل کشی نظر آتی ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ فاروقی صاحب نے کلامِ میر کے مطالعے کے بعد اپنی رائے قائم نہیں کی بلکہ اپنی علمیت کے سانچوں میں ان کے اشعار کو ڈھال دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی علمیت حاوی نظر آتی ہے اور اشعار پھیکے (میر کی روح سے معافی)۔ اکثر غالب کے اشعار کی معنویت مجھ پر واشگاف ہوتی ہے تو ایک عجیب 'کیفیت' کا احساس ہوتا ہے، یک گونہ خوشی بھی ہوتی ہے اور غالب کی شرح بتانے والا شارح ذہن و دماغ سے اوجھل ہوجاتا ہے، غالب کے اشعار کی معنویت اور تازگی کا احساس دیر پا ہوتا ہے، مگر میر کے اشعار کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ ان کے بہت سے اشعار کی تشریح کے بعد اشعار پھسپھسے لگتے ہیں اور فاروقی کا اندازِ نقد ذہن پر چھایا رہتا ہے۔ (یہ میری ذاتی کیفیت ہوسکتی ہے)۔

(۴) رومن یاکبسن کا کہنا ہے کہ نظم [تخلیق] میں معنی اس وقت بھی پوشیدہ رہتا ہے، جب کسی نظم سے ذہین سے ذہین فرد بھی معنی نکال چکا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ ''شعر شور انگیز'' کے بعد بھی میر کے بعض اشعار میں 'امکاناتِ جہانِ معنی' موجود ہوں اور وہی فرد ان معنی کو قابو میں کر سکے جو تنقید لکھنے کا اہل ہوجائے، یعنی مختلف زبانوں کی ہزاروں کتابوں پر نوٹ لکھ کر پیش کر سکے۔

الغرض شمس الرحمٰن فاروقی کے تنقیدی امتیازات میں ان کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ یہ عظمت ان کے تنقیدی دعوؤں اور دلائل سے مترشح ہوتی رہتی ہے۔ کیوں کہ انھوں نے بے شمار مروجہ ادبی تاریخ کو الٹ پلٹ کر دیا، فکر کے روایتی بتوں کو ڈھا دیا۔ اسی طرح اندازِ تشریح، معانی کی گہرائی اور مطالب کی گیرائی سے اپنی تنقید کو امتیازی شان کا حامل بنا دیا۔ فاروقی کی تنقید کا تحقیقی و لغوی پہلو بھی اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ کیوں کہ انھوں نے تنقیدی مضامین (تشریحات) میں جس طرح لغات سے استفادے کے بعد معانی متعین کیے وہ بھی انتہائی مفید رویہ ہے۔ تاریخی حوالوں سے اپنے دلائل کو مضبوطی عطا کرنا اور اسی کے سہارے بت شکنی کرتے چلے جانا بھی ان کا ایک عجیب علمی کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ فکری، نظری اور اصطلاحی مباحث کو تجزیاتی عمل سے مدغم کرتے ہوئے مضمون کو اختتام تک پہنچانا بھی ان کی تنقید کا نادر پہلو ہے۔ ان تمام اوصاف سے متصف ہونے کے بعد ان کی تنقید میں علمیت کے ساتھ ساتھ ایک کشش پیدا ہوجاتی ہے۔ جس طرح قاری تخلیقات کی شیفتگی میں ڈوب جاتا ہے، بالکل اسی طرح فاروقی کی تنقیدی شوریدگی بھی قاری کو خود سے لپٹائے رکھتی ہے۔

◂◂ ● ▸▸

5/4 (4th floor) Near Nageena Store,Noor Nagar,
JamiaNagar ,New Delhi 110025 Mob: 9810318692

● تفضیل احمد

مرحلہ دشت میں اک عہد کی تعمیر کا تھا.....ڈاکٹر منظر اعجاز

ادب میں بہ استثنائے چند عموماً تمام اہل قلم، نظم ونثر دونوں اصناف کو اپنی کشت تحریر بناتے ہیں۔لیکن عام مشاہدہ یہ ہے کہ جب ان کے فکری سرمائے کی قدر و قیمت کے تعین اور محاسبے کا مرحلہ پیش آتا ہے تو ناقدین وقت زیادہ تر ان کے شہرت یافتہ پہلو کو ہی مدنظر رکھتے ہیں۔دیگر اصناف میں انہیں ویسی خاطر خواہ اہمیت نہیں ملتی جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہوتے ہیں۔پروفیسر سید منظر اعجاز کی تخلیقی جہت بھی کچھ اسی روش کا شکار نظر آتی ہے۔

اردو کے حالیہ انتقادی ادب میں منظر اعجاز اپنی قابل ذکر پہچان کے ساتھ ایک نمایاں مقام پر فائز ہیں۔وہ اپنے مخصوص طرز تجزیہ، انداز تفہیم اور رواں دواں تبصروں کے سبب خاصے معروف بھی ہیں۔عام قاری اس بات سے کم واقف ہوں گے کہ ان کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہی ہوا تھا، اور ہنوز یہ کافر منھ سے لگی ہوئی ہے۔کچھ عرصہ بعد وہ افسانہ نگاری کی طرف بھی مائل ہوئے اور تقریباً دس افسانوں کی اشاعت کے دوران ہی وہ ادبی صحافت سے منسلک ہو گئے۔رسالہ 'انجو' (۱۹۷۷ء) اور رسالہ 'انعکاس' مظفر پور کے فراق نمبر (۱۹۸۳ء) تک کئی سنگ میل نصب کرنے کے بعد انہوں نے اردو میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی اور بہار یونیورسیٹی سروس کمیشن کے ذریعہ منتخب ہو کر ۱۹۹۲ء میں ایس یو کالج، ہلسہ (ضلع نالندہ) میں درس و تدریس کی ذمہ داریوں میں مشغول ہو گئے۔یہ فضا انہیں بہت راس آئی، جہاں طبیعت اور ماحول کی مناسبت سے انہوں نے تنقید نگاری کی دنیا میں قدم رکھا۔پھر تو یہ حال ہوا کہ تنقید و تجزیہ کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔البتہ انہی کے لفظوں میں وہ ''شاعری کی وفا شعاری سے ہمیشہ زیر بار بھی رہے۔'' فرماتے ہیں۔

سفر پہ نکلا تو عزم سفر پہ رکھی نگاہ　　نہ میں فال نکالی نہ استخارہ کیا

چار دہائیوں سے زیادہ طویل اپنی ادبی جنوں خیزی میں تقریباً ۱۵ر کتابوں کی صورت میں فکری روشنائی کی نہریں بہانے والے تیشہ گر کی صرف ایک سبیل ''ورق ورق اجالا'' کی شکل میں شعری آبجو کا نمونہ بن کر ۲۰۰۹ء میں جاری ہوئی۔ان کی تنقیدی نگارشات سے کمّیت میں مقابلتاً قلیل ہونے کے باوجود ۶۴ر غزلوں پر مشتمل یہ مجموعہ اپنی کیفیت کے اعتبار سے اہل ذوق کی دعوت قلب ونظر کا خاصا سامان رکھتا ہے۔

یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ منظر اعجاز کی تنقید جہاں ایک طرف دوٹوک، غیر جذباتی، تاویلاتی اور تفہیمی تحریر کی نمائندہ ہوتی ہے، وہیں ان کی شعری کاوشوں کا خمیر گہرے احساس و جذبات، تخیل و تفکر اور زندگی کی ناہمواریوں کے فنی مشاہدے سے اُٹھا ہے۔ان کا شعری اسلوب بھی مروجہ زمانے کی روش سے ہٹ کر ایک مرصع زبان سے بنا ہے جو قاری کو ایک ایسی کلاسیکی، فارسی آمیز، اضافتوں سے مزّین اور فلسفہ رُنگ دنیا سے روبرو کراتا ہے جسے آجکل ماضی کا اثاثہ سمجھا جانے لگا ہے۔مزے کی بات یہ ہے کہ منظر اعجاز کے یہاں یہی طرزِ سخن نئے تخلیقی پیرائے اور فنی حسن کے پیرہن میں جگمگا رہا ہے۔۔یہاں یہ بات بھی قائم نہیں رہتی کہ مشکل زبان تنقید نگاری کو زیادہ راس آتی ہے۔منظر اعجاز نے معمولی زبان سے اجتناب کرتے ہوئے فارسی لفظیات کو اپنی شاعری میں امتیاز عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ایسا بھی نہیں کہ وہ اس طرز کو ہمیشہ اپنا وطیرہ بنائے رہتے ہیں بلکہ اظہار کی ضروریات اور موقعے کی مناسبت سے سادہ اور سلیس انداز بھی اپناتے ہیں۔

منظر اعجاز کے شعری اسلوب کی تعمیر میں شعوری یا لاشعوری طور پر وسعت مطالعہ کا گہرا اثر پڑا ہے۔وہ بیک وقت روایت، کلاسیکیت، عہد اقبال، ترقی پسندی اور جدیدیت تمام رجحانات و رویوں سے مسلسل استفادہ کرتے ہوئے حسبِ خاطر لفظوں اور موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں۔

جوازِ معنیٔ امکان ہے بہ رنگ نظر　　بیاں کا حسن نہاں حرف کے لباس میں ہے

منظر اعجاز کے ذہنی اور فکری پس منظر کی تعمیر کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو جن عناصر اور حالات نے اس میں نمایاں کردار نبھائے ہیں ان میں بچپن کی جھیلی ہوئی محرومیاں، والدہ کی علمی، صوفیانہ اور خوددار مزاجی، صبر و قناعت اور پُرتحمل تربیت، اسلامی ماحول اور اس کے ساتھ بے سایہ دھوپ کا کڑا سفر جیسے عوامل شامل رہے ہیں۔ان سب کے زیر اثر جو نفسیاتی اور علمی شخصیت تیار ہوئی اس میں متانت اور سنجیدگی، انکساری، قوت برداشت، حق گوئی، مزاحمت اور جد و جہد کی روش، رکھ رکھاؤ اور علم و ادب کی شدید پیاس جیسی خصوصیات نے جگہ بنالی۔مزید یہ کہ چند ادبی دوستوں کی صحبتیں بھی ان کی شخصیت کو دو آتشہ بنانے کا سبب بنیں جن میں بطورِ خاص ظفر عدیم اور ڈاکٹر مرتضیٰ اظہر رضوی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

منظر اعجاز کی غزلیں حقیقت و مجاز اور گمان اور یقین کے دو ساحلوں کے درمیان ہم آہنگی، توازن، مفاہمت اور اعتدال کی تلاش کی غزلیں ہیں۔یہ غزلیں انسان دوستی کے جذبے سے مزّین، تضادات میں سانس لیتی زندگی کی بے اعتدالیوں کی کشاکش، قدروں کی پاسپانی کا مرحلہ، آب و سراب کی دورنگیوں سے نبرد آزما ہیں۔وہ ہر جگہ اپنے زندہ اور موجود ہونے کا احساس دلاتے جاتے ہیں۔البتہ قاری کو ہر بیانیے کے پیچھے ایک وسیع محزونی کی فضا کا تجربہ بھی ہوتا رہتا ہے۔

نشیب کون ومکاں میں منظر فراز منزل کو سوچتا ہوں — یہ حوصلہ خود کو دے رہا ہوں تسلسل ارتقا نہ ٹوٹے
تہذیب کر رہا ہوں شعورِ جمال کی — ترتیب دے رہا ہوں دلِ خود نگر کا رنگ
میں ایک قطرۂ شبنم ہوں صفحۂ گل پر — شعاعِ نور ملی ہے تو کچھ ثبات ملے

ظفر عدیم ان کی شاعری کے متعلق رقم طراز ہیں۔

''منظر اعجاز کی شاعری موجِ تہ آب اور تحریر بین السطور کی صورت منظر سے نہیں پسِ منظر سے ابھرتی ہے۔ جسے دیکھنے، سمجھنے کے لیے تھوڑا رکنا، ٹھہرنا ضروری ہے۔ منظر اعجاز کی فکر قطرۂ نیساں کی طرح صدف میں دھیرے دھیرے گہر بنتی ہے۔ اس لیے اس کی آب و تاب کو محسوس کرنے کے لیے یکسوئی کی ضرورت ہے۔''

اس اظہارِ خیال کے سلسلے میں مندرجہ ذیل چند اشعار دیکھیں۔

آیا ہوا کا جھونکا تو ویران ہو گئیں — تھیں سطحِ آب پر جو حبابوں کی بستیاں
منظر طلوعِ صبح کا آنکھوں میں بھر گیا — شب کتنی خوشگوار تھی عرفانِ ذات کی
پہلے دیکھے گئے آشفتہ سری کے احوال — پھر مجھے سونپی گئی دشتِ جہاں کی تعمیر

منظر اعجاز یاسیت اور رجائیت کے مابین اپنی موجودگی کو معتدل رکھنے کی تگ و دو میں ایک طرف خود سے بھی برسرِ پیکار ہوتے ہیں تو دوسری طرف مختلف پسِ منظروں میں منہمک رہتے ہیں۔ یہ کوشش کیفیات اور حالات سے اخذ کی ہوئی تخلیقیت کا رنگ بھی جماتی ہے۔

بلندیوں پہ ہو تعمیر قتل گاہ کوئی — کہ میرے قد کے برابر فصیلِ دار نہیں
خودی کے سوز سے خالی جو سازِ جاں ہوتا — عجب نہیں کہ میں گم کردۂ نشاں ہوتا
سر میں سما رہا ہے نئی آگہی کا درد — پھر پھیلنے لگی ہیں حدیں ممکنات کی

پروفیسر وہاب اشرفی نے منظر اعجاز کا شعری تجزیہ کرتے ہوئے ان کی شاعری کو Paradox,Irony اور Contradiction کی شاعری قرار دیا۔ جس سے یہ گمان گزرتا ہے کہ منظر اعجاز کا فن غزل گوئی غیر واضح اور بے معنویت کا شکار ہے۔ یہ الفاظ انسانی زندگی کی معکوس اور منفی باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جبکہ اس طرح کا فنی سقم ان کے یہاں نہیں ملتا۔ لیکن آگے چل کر وہاب اشرفی نے اپنی بات کی صراحت کرتے ہوئے لکھا۔

''(منظر اعجاز) کے یہاں Contradiction کا اجتماع اور ادغام عام ہے۔ وہ سامنے کے لفظوں سے Irony کی کیفیت پیدا کرنے میں بے حد چابکدست

ہیں۔'' پھر مزید لکھتے ہیں۔ 'وہم و اعتبار اگر یکجا ہو جائیں تو جو چیز سامنے آئے گی وہ دونوں پر یقین رکھے گی چاہے ان کی جگہ بدل دی جائے۔''

یہ حقیقت ہے کہ حیات انسانی نا موزونیت، غیر آہنگی اور تضادات سے مل کر ہی مکمل ہوئی ہے۔ لیکن یہی چیزیں تعمیری اور تخلیقی حسوں کو جگاتی بھی ہیں۔ لہٰذا فنکاری یہ نہیں کہ متضاد لفظوں کو یکجا کر کے چھوڑ دیا جائے بلکہ ان کے استعمال سے وہ کیفیت پیدا کی جائے کہ قاری بھی اس احساس سے لطف اندوز ہو سکے۔

منظر اعجاز کے یہاں صنعت تضاد کا رنگ لفظی سطح سے گزر کر معنوی سطح پر نمایاں ہو جاتا ہے۔

تو اپنے پردے کی خاطر نہ مجھ کو عریاں کر — ترے ہی غیب کا امکان ہے ظہور مرا
آئی نہ آج تک وہ حریم قیاس میں — شبنم کی شعلگی ہے جو پھولوں کی پیاس میں
قہقہہ زاروں میں ہے آج بھی وہ خندہ لبی — زیرِ لب دل کے سسکنے کی صدا آج بھی ہے

''ورق ورق'' کے مطالعے سے شاعر کے تین واضح رجحانات کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ اول تو مذہبی پسِ منظر کی وجہ سے فلسفۂ اقبال کے گہرے اثرات قبول کرنا، دوم درس و تدریس کی ضروریات کے تحت ترقی پسند ادب کے لگا تار افہام و تفہیم کے سبب فیض احمد فیض اور جمیل مظہری سے متاثر طرز فکر و فن کا تانا بانا بُننا، سوم ادبی دنیا میں قدم رکھنے کا زمانہ، جدیدیت کے نمایاں اثرات اور اس کی زوال آمادہ صورت کا زمانہ تھا جس سے شوق مطالعہ کے سبب روبرو ہوتے رہنا۔ لہٰذا یہ تینوں پہلو ہی ان کی سخن کاری میں نہ صرف جستہ جستہ اپنی بہاریں دکھاتے ہیں بلکہ اکثر اوقات انجذاب اور تحلیل ہو کر ایک انفرادی طرز اظہار کا خوبصورت نمونہ بھی بنتے ہیں۔ اسلوب کی تعمیر کے لیے وہ فیض کی مانند علامت اور استعارہ سازی کی جوکھم میں نہیں پڑتے بلکہ معیاری لفظیات کی مدد سے اپنی بات کہہ دیتے ہیں۔ وہ علامہ اقبال کی مخصوص علامتوں اور لفظوں کو ضرور استعمال کرتے ہیں لیکن ان کے فلسفے سے کچھ ہٹ کر جمیل مظہری کی طرز فکر کو اپنا سلیقہ بناتے ہیں۔ ان کی غزلوں سے چنندہ الگ الگ رنگوں کو مندرجہ ذیل اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے۔ رنگ اقبال:

تو متاعِ اختراعِ جلوۂ ذات خودی — اندر آئینے کے بھی، آئینے کے باہر بھی
دلِ یزداں دھڑکتا ہے مرے انفاس کی لے میں — زمیں پر میں ہوں لیکن گونج میری آسماں پر ہے
اس کا امکان نہیں سوزِ بلالی کے بغیر — کعبۂ عشق میں ہو صوتِ اذاں کی تعمیر
نگاہِ نور تری، جلوہ زار طور مرا — ترے خیال سے ٹکرا گیا شعور مرا
حرفِ خدا کا حسن ہے سوز خودی کا کرب — یہ جانے وہ جو جھیلے کبھی آگہی کا کرب

ترقی پسند انداز:

تیرے کرشمے میں نے دیکھے تو بھی تماشا دیکھ مرا — تول رہا ہوں پلک پلک پر عکس اس آئینہ خانے کا

منزلیں جاگ اُٹھیں چونک کے خود راہوں میں — سیلِ رفتار سے ہر سنگ نشاں ٹوٹ گیا
اک سعیٔ لا حاصل کے سوا منزل کی تمنا کیا ہوگی — جب ذوقِ سفر بیدار نہیں جب پاؤں جنوں رفتار نہیں

جدیدیت کے اثرات:

خوشبوؤں کو کھرچ کے سانسوں میں — زرد موسم گلاب کا جھیلوں
سفر طویل ہے کب تک میں اس سفر میں رہوں — یہ وہ جگہ ہے جہاں سمتیت بھٹکتی ہے
ریزہ ریزہ ہوئے تابندہ خیالوں کے ورق — تیرگی چاٹتی جاتی ہے اُجالوں کے ورق

منظر اعجاز تہذیبی اور اخلاقی قدروں کے بھی امین ہیں اور ان کی شکست و ریخت سے دل برداشتہ بھی ہوتے ہیں۔ ایک جانب ان کے قلم میں تنقیدی تجزیے کی قوت ہے تو دوسری جانب وہ قوت متخیلہ کی توانائیوں سے بھی خوب کام لیتے ہیں۔ لہٰذا وہ مضامین اور موضوعات کو برتنے کے لیے نئی تشکیلات کا کام سامنے کی لفظیات سے ہی لیتے لیتے ہیں اور اپنا مافی الضمیر بہ آسانی بیان کر جاتے ہیں۔

مسئلہ خواب کا منظر تو کہیں تھا ہی نہیں — مسئلہ جو بھی تھا وہ خواب کی تعبیر کا تھا
آخر کار پڑے کہنہ فصیلوں میں شگاف — جدّتیں اُبھریں جہاں بھی نئی تشکیلوں میں
اُفق پہ پھیلے گی کیسے ردائے رنگ شفق — دھواں دھواں سا اگر حلقۂ سحر میں رہوں
کون سی شے تھی جو سنّاٹے کا دل چیر گئی — چونک کر جاگ پڑا چین سے سونے والا

مجموعی طور پر منظر اعجاز کی غزلوں کے متعلق اتنی بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ وہ کسی ایک عہد یا رجحان کی موضوعاتی نمائندگی سے اپنے کلام کو محدود نہیں کرتے بلکہ ان کا دائرۂ فکر تقریباً پورے اردو ادب کی زرخیزیوں کو خود میں سمیٹ لینے کی سعی سے عبارت ہے۔ جہاں وہ انسانی ہمدردی کے بہاؤ میں عالمی نابرابری کو نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے وہیں وہ مقامی سطح پر زندگی کی ستم ظریفیوں اور ظلم و استحصال کے خلاف بھی صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ ان سب کے ساتھ ساتھ وہ عرفانِ ذات اور داخلیت کے مراحل سے بھی بحسن و خوبی عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ اس طرح جو کینوس ''ورق ورق اُجالا'' کے پیکر میں برش ہوا ہے اس میں جذبۂ تخلیق نے طرح طرح کے رنگ بھر دیے ہیں۔ انہوں نے غزلوں کے علاوہ نظمیں اور قطعات بھی کہے ہیں لیکن وہ شاعری کو خاطر خواہ وقت نہیں دے پاتے۔

روح مانوس تھی خوشبو سے جو بدلی نہ کبھی — رنگ گرچہ گل و لالہ نے بھی اکثر بدلے

◂◂ ● ▸▸

C/o- Homoeo Medicins,Ganja Chowk,P.O- Motihari-845401
Distt.- East Champaran (Bihar)
Mob. No.- 7004378608 / WhatsApp No.-9709802163

● ڈاکٹر منور عالم

ہندی فلموں میں اردو کی خوشبو

ہندوستانی فلموں کے گیت کا پیراہن اردو ہے۔ الفاظ کی پیش کاری کا جائزہ لیا جائے تو نغموں میں اردو الفاظ کی نہ صرف بہتات ہے بلکہ یہاں اس کی حکمرانی ہے۔ ممکن ہے اس زبان کے الفاظ کو دوسری زبان کے الفاظ مان کر استعمال کیا جاتا ہو۔ سننے والے خوش ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ گیتوں کے الفاظ اردو تہذیب و ثقافت کا اظہار ہیں۔ اتنا ہی نہیں ہندوستانی فلموں کے نغموں کا لہجہ بھی خالص اردو کا ہے۔ اردو شاعری کے مروجہ اصناف کو ذہن میں رکھا جائے اور فلمی شاعری کے بول ملاحظہ کئے جائیں تو واضح ہوتا ہے کہ ان گیتوں کا لہجہ اردو شاعری سے اخذ بھی ہے اور استفادہ بھی کیا گیا۔ گیتوں میں جذبات کو عموماً یا خصوصاً پیش کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ بتانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ حسن و عشق، مسائل زندگی، فلسفہ حیات اور عصری تقاضے اور دیگر مسائل فلم کے موضوع بنے ہیں تو ان سے وابستہ جذبات نے نغمہ کے روپ میں اپنی نمائندگی درج کرائی ہے۔ یہاں ہر طرح کے جذبات و احساسات کی کارفرمائی ہے۔ فلموں کے گیت عوام کے دل کو چھوتے ہیں اور لطافت بخشتے ہیں۔ فلموں میں گیتوں کے ذریعہ حیات و سماج کی آئینہ داری کی جاتی ہے اور ایسے ہی گیت عام لوگوں کی زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ فلموں کی کامیابی کے لئے نغمہ نگار نے ان تمام تر جذبات و احساسات کو گیتوں میں پرویا جس سے عوام روشناس تھے۔ جب شائقین نے اپنے جذبات و احساسات کو پردۂ سیمیں پر اپنے اداکاروں کے ذریعہ دیکھا تو برسوں تک اس کا ذکر کرتے رہے۔

گیت میں گانے کی کیفیت ہوتی ہے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ صنف ہے جس میں گائے جانے کو مرکزیت حاصل ہے۔ اس وجہ کر اسے غنائیت، لَے، ترنم اور ساز سے جوڑ کر دیکھتے ہیں۔ بعض مبصرین کے نزدیک یہ سنگیت کا حصہ ہے شائد اسی لئے گیت سنگیت کا لفظ ذہن میں ایک ساتھ آتا ہے۔ سنگیت کسی خیال کو صوت سے جوڑتا ہے اور جذبے کو الفاظ کا پیراہن عطا کرتا ہے۔ ہندوستانی سنیما میں جب ''عالم آرا'' کا دور آیا تب سے آج تک فلموں میں گیت کا چلن ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ فلموں میں نغمے کہانی اور سچوئیشن کے مطابق لکھے جاتے ہیں مگر یہ بھی سچ ہے کہ اردو کے نامور شعراء کا کلام فلموں میں شامل ہو کر شائقین و سامعین کے دلوں پر راج کرتا رہا ہے۔ میوزک

ڈائرکٹر کی تیار کردہ دھن پر الفاظ کی صورت گری خلق کرنا فلمی شعراء کا کمال ہے۔ وقت کے ساتھ فلموں کے موضوعات میں تبدیلی آئی۔ سائنس کی ترقی اور نئے ایجادات نے فلم کو ایک نیا موڑ دیا لیکن گیتوں کا چلن پھر بھی برقرار رہا۔ میوزک مغرب سے متاثر ہوا۔ نئے ساز آئے۔ سنگیت کا رنگ بدلا مگر گیت کاروں کی توقیر میں کمی نہیں آئی۔ نغمے فلموں کی ضرورت ہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ بغیر گیت کے فلم بنائے ہی نہیں گئے لیکن وہ برائے نام اور صرف تجربہ کے لئے تھے۔ اردو کے

مشاہیر شعراء کی فلموں سے وابستگی نے فلمی گیتوں کو معیار و وقار عطا کیا اور گیت عوام کی پسند پر کھرے اترنے لگے۔ گیتوں کا یہ سلسلہ فلموں کے حوالے سے ہنوز جاری ہے۔

۱۹۳۱ء میں اردشیر ایرانی کی فلم ''عالم آرا'' منظر عام پر آئی۔ یہ فلم ہندوستان کی پہلی بولتی فلم تھی۔ اس فلم کے ذریعہ پہلی بار سنیما کے شائقین لطف نظارہ کے ساتھ لذت سماعت سے آشنا ہوئے۔ اسکرین پر موسیقی کے ساتھ کرداروں کی زبانی جب شاعری لوگوں تک پہنچی تو فلم کا مزہ دوبالا ہو گیا۔ فلم کے ذریعہ ادب و شعر کو ایک ایسا پیرائیہ اظہار مل گیا جو فائن آرٹس کا حسین سنگم تھا۔ بولتی فلم کا پہلا نغمہ بہت مشہور ہوا۔ اس کے بول تھے۔

دے دے خدا کے نام پر گر تجھ میں دینے کی طاقت ہے یا مجھ سے کچھ لے لے اگر لینے کی طاقت ہے

اردو شاعری کی مختلف اصناف اپنی تمام تر زرخیزی کے ساتھ اس سنگم میں اس طرح حلول کر جاتی ہیں کہ ان کے بغیر ہندوستانی سنیما کے مکالمے اور گیتوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت سنیما میں مقبول ہونے والے نغمے اپنے موضوعات، تراکیب، لفظیات، محاورے اور روزمرہ بے تکلفی سے استعمال ہوتے ہیں۔ اردو شاعری کے دونوں دبستانوں کے شعراء اپنی توانائی روایت کے ساتھ فلم انڈسٹری سے وابستہ ہوتے ہیں تو اردو شاعری کا یہاں بول بالا ہو جاتا ہے۔ زیادہ تر شعری اصناف مثلاً گنگا جمنی تہذیب کی عکاس رہی ہیں۔ فلموں کے موضوعات اور برتاؤ میں یہاں کی تہذیب کو نمایاں طور پر شامل کیا جاتا رہا ہے۔ فلموں کے کردار خواہ ہندو ہوں یا مسلمان دونوں کی زبان میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ دونوں کے لہجے میں اتنی یکسانیت ہوتی ہے کہ انہیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ شیروانی پہنے، دوپلی ٹوپی لگائے، چھڑی لیے ہوئے پاکیزہ کے نواب صاحب ہوں، غرارے شرارے میں ملبوس چودھویں کا چاند کی وحیدہ رحمن ہو یا دیوداس کی نرتکی، میرے ہمدم میرے دوست کی سہیلیاں (غیر مسلم) جن کی زبان سے محبوب کی تعریف کے بول ادا ہوئے۔ سب کے رنگ اردو کی خوشبو کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ واللہ، دعا، تعویذ، آیت، خدا جیسی مذہبی اصطلاحات غیر مسلم اداکاروں، کرداروں کی زبانی سن کر آپسی یگانیت کا کنول دل میں کھلنے لگتا ہے۔ فلموں میں مسلم کردار جب ہندو مذہبی رسومات ادا کرتے ہیں تو اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ میرے ہمدم میرے دوست کا ایک مشہور گیت ہے

جس میں قوالی کا ٹھاٹ ہے اور نوک جھوک بھی ہے۔ مجروح سلطان پوری کی شاعری کا یہ رنگ کتنا بھلا ہے۔

اللہ یہ ادا کیسی ہے ان حسینوں میں روٹھیں پل میں نہ مانیں مہینوں میں

مجروح سلطان پوری کا یہ گیت فلم ''ساتھی'' کے لیے بہت مشہور ہوا۔ اس گیت کو مکیش نے فلم کے لئے گایا تھا۔ اس گیت کا مکھڑا اب تک شائقین کو یاد ہے:

حسن جاناں ادھر آ، آئینہ ہوں میں ترا میں سنواروں گا تجھے سارے غم دے دے مجھے

اس گیت کے اگلے اشعار میں ہماری ملی جلی تہذیب کی گاتھا ہے۔ اشعار سے محظوظ ہوئیے:

کتنے ہی داغ اٹھائے تونے میرے دن رات سجائے تونے
گھر تیرے دم سے ہے مندر میرا تو ہے دیوی میں پجاری تیرا
سجدے سو بار کروں آ تجھے پیار کروں میری آغوش میں آ، آئینہ ہوں میں ترا

دلی جذبات کا بیان مذکورہ گیت کی خصوصیت ہے۔ اسی طرح فلم ''دیوداس'' کے گیت میں ساحر لدھیانوی نے نرتکی کے جذبات کو بڑی ہی خوبی سے شعری قالب میں ڈھالا۔ ان کے جذبات دیکھئے:

مری بے بسی ہے ظاہر مری آہ بے اثر ہے کبھی موت بھی جو مانگی تو نہ پائی اس کے در سے
جو مراد لے کے آئے وہ دعا کہاں سے لاؤں

ایک اور فلم ''دیوداس'' (سنجے لیلا بھنسالی) میں نصرت بدر نے الفاظ کا جادو جگایا ہے۔ چندر مکھی کے لیے لکھا گیا یہ نغمہ:

یہ کس کی آہٹ، یہ کس کا ہے سایا ہوئی دل میں دستک یہاں کون آیا
ہم پہ کس نے ہرا رنگ ڈالا خوشی نے ہماری ہمیں مار ڈالا، اللہ

جذبات بیان کرنے میں اردو الفاظ سے مزین نغمے بے حد کامیاب رہے ہیں ''فلم دوستانہ'' کے لیے آنند بخشی نے نغمے لکھے۔ ان کا یہ درج ذیل نغمہ اور شاعری کی تہذیب سے آراستہ ہے۔

دعا بد دعا دے یہ ممکن نہیں مجھے تو دغا دے یہ ممکن نہیں
خدا جانے کیا ماجرا ہو گیا سنا ہے کہ تو بے وفا ہو گیا

جناب سہیل اختر خاں نے ہندوستانی فلموں کے نغموں کے بارے میں بجا طور پر لکھا ہے کہ:

''بالی ووڈ کے جدید عہد میں بھی اردو کا یہ کلچر جا بجا دیکھا جا سکتا ہے۔ قیامت سے قیامت تک، دل چاہتا ہے، جودھا اکبر، فنا، سانوریا، قربان، زندگی نہ ملے گی دوبارہ اس کی واضح مثالیں ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ جنم جنمانتر اور آواگمن کا عقیدہ اسلام اور مسلمانوں میں نہیں پایا جاتا

لیکن جب جاوید اختر صاحب ایک مسلم کردار کے لئے کہلواتے ہیں:

جو اب کئے ہو داتا ایسا نہ کجیو اب کے جنم مو ہے بیٹا نہ کجیو

''تو لڑکی کی ذات کے ساتھ ہونے والے سماجی ظلم وستم کی داستان ہی نہیں سنائی دیتی بلکہ تہذیبوں کا خوبصورت سنگم بھی دکھائی دیتا ہے۔'' (ماہنامہ ''اردو دنیا'' فروری ۲۰۱۳ء ص ۲۷)

گلزار کے گیتوں کا رنگ اردو کی خوشبو سے پڑے ہے۔ انہوں نے فلمی نغموں کے لئے اردو زبان کو چنا۔ یہ وہ اردو ہے جس کے دامن میں دوسری زبانوں کے سبک الفاظ رچ بس گئے ہیں۔

بطور خاص انہوں نے عشقیہ اشعار لکھتے ہوئے اردو شاعری کی روایت وتہذیب کو سامنے رکھا ہے ان کے نغموں سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں جن میں اردو شاعری کی دمک پائی جاتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

وہ یار ہے جو خوشبو کی طرح ہے جس کی زبان اردو کی طرح
مری شام و رات مری کائنات وہ یار مرا سیاں سیاں

اسی طرح یہ اشعار:

گلپوش کبھی اترائے کہیں مہکے تو نظر آجائے کہیں
تعویذ بنا کے پہنوں اسے آیت کی طرح مل جائے کہیں

فلم ضدی میں مشہور شاعر معین احسن جذبی کی غزل کو فلمایا گیا۔ فلموں میں اردو شاعری کی دھوم تو روز اول سے رہی ہے۔ غزل کے اشعار کو مکھڑا بنا کر نغموں کو شائقین کے دل تک پہنچایا گیا ہے۔ جذبی کی غزل نے تو اور بھی کمال کیا۔ اس غزل کے دو اشعار دیکھئے:

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے اب ایسی ظالم دنیا میں جینے کی تمنا کون کرے
جب کشتی ثابت وسالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

ہندوستانی فلموں میں اردو شاعری کے دھنک رنگ کا خوب خوب استعمال کیا گیا۔ ہندی میں نغمہ لکھنے والے نے بھی اردو سے خوب استفادہ کیا۔ جناب کرشن بھاؤک نے ایک جگہ لکھا ہے:

''ہندی فلموں کے نغمہ نگاروں نے اردو شاعری کے چیدہ چیدہ اشعار سے اپنے نغموں کے خط وخال یا نقش ونگار کی تشکیل دیتے وقت متواتر استفادہ کیا ہے۔ اگرچہ مرزا غالب کے نام سے پوری فلم ہی بنائی گئی تو بعض فلموں میں شاعروں کی غزلوں، نظموں، گیتوں کا باموقع استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً فلم ''پھر صبح ہوگی'' میں ساحر لدھیانوی کے وہ صبح کبھی تو آئے گی، لائن سے شروع مکمل نغمے کو بطور ثبوت پیش کیا جا

سکتا ہے۔ اسی طرح فلم ''امراؤ جان'' میں شامل شہریار کی، یہ کیا جگہ ہے دوستو، یہ کون سا دیار ہے، حد نگاہ تک جہاں غبار ہی غبار ہے۔ مطلع سے شروع ہوئی اور آشا بھونسلے کی شیریں آواز سے مزین غزل بے حد مقبول عام رہی ہے۔ کسی فلم میں شاعر اعظم میر تقی میر کی، پتا پتا بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے، جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے۔ (کلیات میر ص:۶۷) مطلع سے شروع ہونے والی غزل اور فلم ''لال قلعہ'' میں بہادر شاہ ظفر کا مشہور ومعروف'' لگتا نہیں ہے دل مرا اجڑے دیار میں، کس کی بنی ہے عالم ناپائیدار میں۔ مطلع دیکھیں اور گلوکار محمد رفیع اور موسیقار الیس این ترپاٹھی والی غزل اور فلم ''دھول کا پھول'' میں ساحر لدھیانوی کی موسیقی کے ساتھ این دتا کے سدا بہار نغمے ''نہ ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا، انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا'' کی ادبی صلاحیتوں کی مانند متعدد مثال بھی دستیاب ہونا عین ممکن ہے۔''

(ماہنامہ ''اردو دنیا'' فروری ۲۰۱۳ء ص:۳۱)

ہندوستانی فلموں میں جو گانے مقبول ہوئے ان کے جسم میں اردو کا خون دوڑ رہا ہے۔ ہندوستانی فلموں میں ''ہیر رانجھا'' کی مقبولیت آج بھی بدستور قائم ہے پہلی منظوم فلم ''ہیر رانجھا'' کے نغمات نے اسے نہ صرف یہ کہ خاص بلندی عطا کی بلکہ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ منظوم مکالمے اور شاعری کی وجہ سے بھی فلمیں کامیاب ہوتی ہیں اور اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ نغموں میں وہ طاقت ہوتی ہے کہ فلموں کی ضمانت بن جاتے ہیں۔ عوام میں دیر تک گنگنانے والے نغمے کی تاثیر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مذکورہ فلم کا یہ نغمہ بھلا کوئی کیسے فراموش کرسکتا ہے اس نغمے کا مکھرا یہ ہے۔ جسے کیفی اعظمی نے ایک خاص بلندی عطا کی:

یہ دنیا یہ محفل میرے کام کی نہیں

اس نغمے کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے:

ان کو خدا ملے ہے خدا کی جنہیں تلاش ہے مجھ کو بس اک جھلک مرے یار کی ملے

اس طرح کے نغموں کا ایک طویل سلسلہ ہے جو آج بھی پوری تازہ کاری کے ساتھ نسل در نسل شائقین تک رسائی حاصل کررہا ہے۔ غزلوں اور نظموں کی کہکشاں سے روشنی کی یہ قندیلیں ملاحظہ کیجئے:

مجروح لکھ رہے ہیں وہ اہل وفا کا نام ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہگار کی طرح
چراغ دل کا جلاؤ بہت اندھیرا ہے کہیں سے لوٹ کے آؤ بہت اندھیرا ہے
مرا تو جو بھی قدم ہے وہ تیری راہ میں ہے کہ تو کہیں بھی رہے تو میری نگاہ میں ہے

یہ کون آیا روشن ہوگئی محفل جس کے نام سے میرے گھر میں جیسے سورج نکلا ہے شام سے

اردو کے مشاہیر شعرا نے فلموں کے لئے گیت لکھ کر فلم اور ادب کے رشتہ کو مستحکم کیا۔ اس سے فلموں کی شاعری میں معیار بھی قائم ہوا۔ فلموں میں صحت مند شاعری کا رواج بڑھا۔ آغا حشر کاشمیری نے بھی ڈراموں کے میدان سے نکل کر فلموں کے میدان میں قدم رکھا اور اپنی قسمت آزمائی تو وہاں بھی اچھے کھلاڑی ثابت ہوئے۔ فلمی دنیا میں بھی انہوں نے گانے لکھے۔ فلم ''چنڈی داس'' جو ۱۹۳۴ء میں بنی جس کا نغمہ ملاحظہ کیجئے:

پریم نگر میں بناؤں گی گھر / میں تج کر گھر سنسار / پریم نگر میں
اور پریم کے ہونگے دیوار / پریم نگر میں
پریم سکھا ہو پریم پڑوسی / پریم میں سکھ کا سار / پریم نگر میں

(فلم: چنڈی داس ۱۹۳۴ء بحوالہ امنگ راشٹریہ سہارا، یکم جون ۲۰۱۴ء)

''فلمی گیتوں میں وطن پرستی اور مذہبی رواداری جیسے جذبوں کا بیان خوب خوب ہوا ہے۔ مذہبی بول، نعت، حمد و مناجات، سلام اور بھجن وغیرہ فلموں کے لئے لکھے گئے۔ ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی وغیرہ نے بھجن لکھ کر شائقین کے دلوں کو روح پرور بنانے میں معاونت کی۔ مشہور نغمہ نگار ابراہیم اشک نے ایک مضمون ''ہندوستانی فلموں میں موسیقی اور گیت میں بھجن کا ذکر کرتے ہوئے بڑے ہی کام کی بات لکھی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ آپسی یگانگت اور بھائی چارے کے لئے مسلم شعراء کا بھجن لکھنا نہایت کارآمد ثابت ہوا۔''

(ہندوستانی فلمیں اور اردو، ص ۱۴۱)

عورتوں کے جذبات اس کے احساسات اور اس کی صورت گری کو فلموں میں نغمے کے ذریعہ پیش کیا گیا۔ شعراء نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ عورتوں کی حمایت و اہمیت اور مردانہ ظلم و ستم اور استحصال کو ناظرین کے سامنے پیش کیا۔ اس موضوع کے لئے تو مشہور شاعر ساحر لدھیانوی کا نام قدر و احترام سے لیا جاتا ہے۔ ان کے کئی نغمے جو اس موضوع سے وابستہ تھے مقبول ہوئے۔ ایک مثال حاظر خدمت ہے۔

عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اسے بازار دیا جب جی چاہا مسلا کچلا، جب جی چاہا دھتکار دیا

ان کے علاوہ مجروح سلطان پوری کے گیتوں نے فلموں میں اردو شاعری کی دھاک جما دی۔

''فلمی نغموں کو خالص اردو لب و لہجہ دینے اور اردو کی شعری لفظیات سے ہندوستانی فلموں کے گیتوں سے رشتہ جوڑے رکھنے میں مجروح صاحب کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ فلمی نغمہ نگاری کے لئے سب سے پہلا دادا صاحب

پھالکے ایوارڈ ان کو دیا گیا۔ شکیل بدایونی کی طرح مجروح بھی مشاعروں سے فلم میں آئے تھے۔ فلمی گیتوں میں محبوب کے لیے ساجن، سجن، بالم اور بلم کی جگہ صنم کے استعمال کا رواج مجروح نے ہی ڈالا تھا۔ محبوبہ کے لئے قبلہ محترمہ کبھی شعلہ کبھی نغمہ جیسے تخاطب اور زبان یار من ترکی، و من ترکی نمی دانم، جیسے فارسی محاوروں کے استعمال سے انہوں نے اردو کو ہندوستانی فلمی شاعری کی مادری زبان بنا دیا تھا۔''

(ماہنامہ ''اردو دنیا'' دہلی، فروری ۲۰۱۳ء ص ۴۵۔۴۴)

گیتوں میں ہر طرح کے جذبات پروئے گئے۔ وقت اور حالات کے مطابق فلموں کا مزاج بدلا تو نغموں کا بھی مزاج بدلا۔ لیکن وہ کیفیات جن میں آفاقیت ہوتی ہے فلم میں اپنی جگہ بناتے رہے۔ ساحر کے گیتوں کا مجموعہ ''گاتا جائے بنجارا'' کے مطالعے سے علم ہوتا ہے کہ فلموں میں ادب و شاعری کس طرح شیر و شکر تھی۔ ہندوستانی فلموں میں نغمہ نگاری اپنے عروج پر آجاتا ہے جب گیت کے لفظیات شخصیت اور کردار کی پہچان بن جاتے ہیں۔ حسین تخیل اور اس کی پیکر سازی گیت کو کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے۔ فلموں میں گیتوں کے مقبول ہونے کے کئی اسباب ہیں مگر ان میں سب سے بڑا سبب شعری حسن ہوا کرتا ہے۔ شعری حسن بڑی مشکل سے فلمی نغموں میں آپاتا ہے۔ کبھی کبھی جو نغمہ سننے میں اچھا لگتا ہے اسے تحریر میں پڑھئے تو وہ مزہ نہیں آتا۔ دراصل فلمی گیت لکھتے وقت شاعر کے سامنے فلم کی کہانی سچوئشن اور میوزک ڈائرکٹر کے مشورے ہوتے ہیں۔ اتنی بندش کے بعد عمدہ شاعری کرنا آسان نہیں ہوتا۔ مگر چند ایسے شعراء بھی ہیں جنہوں نے شعری حسن کے ساتھ با موقع فلمی شاعری کی اور کامیاب رہے۔ گیتوں میں جذبات کی پیشی ہوتی رہی اور یہ سلسلہ ہنوز چلتا رہے گا۔ میں اس سلسلے کو ساحر لدھیانوی کے اس نغمہ پر ختم کرتا ہوں جو فلم ''کبھی کبھی'' کے لئے فلمایا گیا تھا۔ یہ وہ صادق جذبے ہیں جن کا اطلاق ہمیشہ ہوتا رہے گا:

میں پل دو پل کا شاعر ہوں
پل دو پل میری کہانی ہے
پل دو پل میری ہستی ہے
پل دو پل میری جوانی ہے

◀◀ ● ▶▶

Guest Faculty,Dept:of Urdu
R. N. College, Pandaul
Mdhubani (Bihar).
+91 9934938380, +91 9852505654

● ڈاکٹر انور ایرج

اجتہادی لہجے کا شاعر.....وہاب دانش

وہاب دانش ۱۱؍جنوری 1930ء کو رانچی میں پیدا ہوئے۔ گاسنر کالج، رانچی میں صدر شعبۂ اردو کے عہدے پر فائز رہے اور وہیں سے 31؍جنوری 1992ء کو سبکدوش ہوئے۔ انکا ایک نظموں کا مجموعہ ''لب مماس'' کے نام سے 1999ء میں جناب جابر حسین نے اردو مرکز عظیم آباد، پٹنہ سے شائع کیا۔ دوسرا مجموعہ ''ریت پہ دوڑتے قدم'' ڈاکٹر محمد طلحہ ندوی نے ترتیب دیا ساتھ ہی اپنا پی، ایچ۔ڈی کا مقالہ بھی بعنوان ''وہاب دانش.....حیات اور شاعری'' انعم پبلی کیشنز، رانچی سے شائع کیا۔

جدید شعراء کے اوّل صف میں وہاب دانش کا شمار ہوتا ہے۔ 1960ء کے بعد جدید رجحان کے حوالے سے اجتہادی لہجے کے کئی اہم شاعر جن میں باقی ظفر اقبال، میراں جی، عادل منصوری، نشتر خانقاہی، محمود ایاز اور وہاب دانش وغیرہم کے نام قابل ذکر ہیں، جو اپنے انفرادی لہجے کی وجہ سے اپنی ایک شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ وہاب دانش بھی اپنے اجتہادی لہجہ اور منفرد اسلوب کی وجہ سے دور سے ہی پہچان لئے جاتے ہیں۔ انکا لہجہ روایتی لہجے سے بالکل مختلف ہے۔

اگر آپ انکی شاعری کا اسلوبیاتی یا موضوعاتی جائزہ لیں تو یہ ضرور محسوس کریں گے کہ وہ نئی معنویت اور نئے تلازمے کے ساتھ الفاظ کو برتنے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔ انکی شاعری میں تصورات و تخیلات کی ایک ایسی دنیا آباد ہے، جس کے افق پر تشبیہات و استعارات، تلمیحات و کنایات یہ سب کے سب روشن ستاروں کی مانند جھلملاتے ہوئے نظر آئیں گے۔

وہاب دانش رمز و علائم کا ایک ایسا طلسم اپنی شاعری میں قائم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جسے آپ کسی منطقی توضیحات یا محض شعوری استدلال سے نہیں توڑ سکتے۔ دانش کی شعری کائنات میں صرف تجربات و مشاہدات یا افکار و خیالات کے ساتھ داخل ہونا کافی نہیں بلکہ ایک وجدانی و الہامی کیف و سرور کا ہونا بھی ضروری ہے تبھی آپ اس وسیع کائنات کے رموز سے واقف ہو سکیں گے۔

جدّت پسندی موصوف کی سب سے بڑی خصوصیت ہے، ظاہر ہے اس خصوصیت کے پیچھے انکا

اجتہادی اور اختراعی لہجہ ہی کارفرما نظر آئے گا۔ شاید اسی وجہ سے وہ ایک مشکل پسند شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ انکے یہاں جو شعری پختگی و بالیدگی ہے وہ انہیں تخصیصیت بخش دیتی ہے، ترسیل و ابلاغ کی خوبیوں سے وہ شعوری اجتناب نہیں برتتے اور نہ ہی عام جدید شعراء کی طرح (بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ) جدید بننے کے چکر میں بکرا سے زور لگواتے ہیں اور نہ ہی بکری سے میں میں کرواتے ہیں، بلکہ اپنے موضوعات و مطالب کو اپنے انوکھے انداز میں قاری تک پہنچانے کی سعی کرتے ہیں۔ شعر و ادب کے سنجیدہ قارئین ایسے ڈکشن اور اسلوب کو نہ صرف پسند کرتے ہیں بلکہ فکر و فن کی تہہ میں اتر کر اسکے مفہوم و مطالب کی تلاش میں غوطہ زنی بھی کرتے ہیں اور محسوسات کی ایک نئی دنیا سے روشناس بھی ہوتے ہیں۔

یوں تو وہاب دانش کو نظموں اور غزلوں پر یکساں عبور حاصل ہے اور دونوں صنف میں انکا اجتہادی اور اختراعی لہجہ اپنے انداز اور انفراد کے ساتھ سامنے آتا ہے، مگر نظموں میں انکا یہ اسلوب کچھ زیادہ نکھر کر سامنے آتا ہے۔ انکی طبعیت کی جولانی اور خیال کی فراوانی انکی جدت پسندی کو یہاں کچھ زیادہ رعنائی بخشتی ہوئی نظر آتی ہے۔

یہاں ایک بات واضح کرتا چلوں کہ وہاب دانش خود کو کسی رجحان یا تحریک سے کبھی منسلک نہیں کئے اور نہ ہی آنکھ بند کر کے اس ریوڑ میں شامل ہوئے، جس میں شامل ہو جانا باعثِ افتخار سمجھا جاتا تھا۔ حق گوئی اور بے باکی کی وجہ سے وہ نہ صرف ادبی حلقوں میں مشہور تھے بلکہ سماجی حلقوں میں بھی انکی یہی شناخت قائم تھی۔ جو لوگ انہیں جدیدیت کے کھوٹے سے باندھ کر رکھنا چاہتے ہیں، انہیں موصوف کے مزاج کو سمجھنے کے لئے ماہنامہ 'تحریک' دہلی دسمبر 1976ء کا وہ شمارہ ضرور دیکھنا چاہئے جس میں جدید رجحان کے حوالے سے مخمور سعیدی اور گوپال متل وغیرہ نے ایک سوالنامہ تیار کیا تھا اور ادب کے سنجیدہ قارئین سے شرکت کی گزارش کی تھی، اس وقت وہاب دانش کا جس طرح بے باک اور دوٹک جواب سامنے آیا تھا، وہ میری بات کی صداقت کے لئے کافی ہے۔ وہ ادب کے نام پر کسی طرح کا بٹوارہ قبول کرنے کو ہرگز تیار نہیں تھے۔ اتنی بات وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جو آج جدید ہے، وہ کل قدیم ہو جائے گا، تو پھر جدید اور قدیم کا روگ کیوں پالا جائے۔ دونوں کی اہمیت و افادیت مسلم ہے۔ وہ اس بات کو بھی بخوبی سمجھ رہے تھے کی کوئی بھی رجحان یا تحریک بیس پچیس سال میں دم بخود ہو جائے گی اسلئے اپنی تخلیق کے لئے انہوں نے ایک الگ راہ کا انتخاب کیا یہی وجہ ہے کہ انکی شاعری کسی بندھے ٹکے اصول کے تحت معرضِ وجود میں نہیں آئی لہذا، آپ انکی شاعری کو کسی دائرے یا حصار میں قید نہیں کر سکتے۔ مزید گفتگو سے بہتر ہے کہ یہ اشعار دیکھ لیں جو تمام حدود قیود کو توڑتے ہوئے نئے آسمانوں کی تلاش میں ہیں۔

نئی پسند، نئی روشنی کی چاہ مری
کہیں ٹھہر نہ سکی جدت نگاہ مری
اڑان میری نئے آسمانوں کی کھوج میں ہے
بساط اپنی تگ و دو ہے بے پناہ مری

وہاب دانش کی نظموں اور غزلوں کے تجزیئے ومطالعے کے لئے الگ الگ ضخیم مقالہ درکار ہے۔ میں حتی الامکان کوشش کروں گا کہ نہایت اختصار کے ساتھ اس وقت صرف نظموں کو حیطۂ تحریر میں لاؤں اور چند اہم نکات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انکی تخلیق کی روشنی میں فکر وفن کا ایک عمومی جائزہ پیش کروں، جس سے انکا اجتہادی لہجہ بھی سامنے آجائے اور انکے تجربات ومشاہدات میں ڈھلنے والی تخلیق کا کچھ سرا بھی ہاتھ لگ جائے، تاکہ انکے موضوعات وافکار کو مزید بہتر ڈھنگ سے سمجھا جا سکے۔ دانش کی شاعری کا مطالعہ یا جائزہ کسی تنقیدی اصول کے تحت پیش کرنا کوئی منصفانہ عمل نہیں ہوگا۔ لہذا انکی شاعری کا مطالعہ فکر وفن کی کسوٹی پر تخلیق کے حوالے سے ہی سامنے آئے تبھی ایک صحت مند تجزیہ بھی سامنے آسکے گا۔

طوالت کے خوف سے میں انکی تین چھوٹی چھوٹی نظموں پر ہی اکتفا کروں گا۔ پہلی نظم ''صراط پر'' ملاحظہ فرمائیں۔

ترا نام شہد سے لکھ کے میں/کبھی مور/مور و مگس بنوں/کبھی پر/شفالی سی بوند سے کبھی لب/خوشی سے میں رنگ لوں/کبھی رقص بن کے ادا ادا/کبھی سر/سرودِ ہوا بنوں/ترا نام شہد سے لکھ کے میں/کبھی آب دیکھوں/لہولہو/کبھی خواب دیکھوں کہ رنگ و بو/کبھی ریت، ریت/صراط پر/کبھی دجلہ دجلہ/فرات پر/کبھی شمر شاہی سراب پر/کبھی تیر پہرہ تھا آب پر/ترے ہونٹ دیکھوں کی آئینہ/ترا رخ مبین اَنا اَنا/مگر اے شہید شمائل/تری آبرو تھی علی علی/تو ہی/نیزہ نیزہ بلند تھا/ترا سر تو خضر اپسند تھا/جو جھکا تو خاک تھی مرمریں/جو کٹا ریت تو تھی احمریں/تو ی مصطفیٰ تو ی مصطفیٰ/ترا نام شہد سے لکھ کے میں/کبھی آب دیکھوں/لہولہو/کہ سراب دیکھوں/عدو عدو

اس نظم میں جو ہنرمندی اور سلیقہ مندی ہے وہ پہلی نظر میں ہی سامنے آجاتی ہے کیا اس تخلیق میں بیک وقت نظم، نعت، منقبت، اور مرثیہ کی چاشنی نہیں؟ آپ اسے کس زمرے میں رکھیں گے؟ ایک ایک لفظ شہد میں ڈوبا ہوا ہے، ایک ایک رکن میں روانی ہے۔ تلمیحات وتشبیہات کی ایسی آرائش، لفظوں کی ایسی نشست و زیبائش، استعاراتی ایمائیت کے ساتھ حرف حرف میں غنائیت، ابتداء تا انتہا ایسا اسلوبیاتی نظام، فکر کے ساتھ فن کا ایسا التزام، بہت کم شعراء کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ پوری نظم میں اجتہاد واختراع کا پہلو نمایاں ہے۔ اس

نظم میں ایک ایسا تخلیقی روّیہ سامنے آتا ہے جہاں ہم ایک ایسی وجدانی کیف وسرور کی منزل پر پہنچ جاتے ہیں، کہ بس دیوانگی کے عالم میں آدمی دیر تلک سر دھنتا رہ جاتا ہے۔ اس کے فنی وفکری طلسم کو کسی توضیح وتشریح سے توڑا نہیں جا سکتا، یہاں فنی محاسن کی دل آویزی اور تخلیقی وفور کی کارفرمائی بس محسوس کی جا سکتی ہے۔

دوسری نظم ''رسائی'' دیکھیں :

خدا/ میں نے تمہارے واسطے/مسجد بنائی موم کی/مندر اٹھایا اوم کا/گرجا سجایا/مریمی مسیح کا/ہر گوشۂ زمیں میں/فصل بوئی/ترے اجالے کی/چاند اگائے ترے نبیوں کے/ستارے سنوارے/تری کالی سیاہ کی رات کی مانگ پر/خدا میں نے تمہارے واسطے/زمیں پہ کہیں/پل صراط نہیں ابھارا/پیدل یا کسی سواری/گزرنے کی راہ ہموار نہ کی/یہاں سے گزرنے کے لئے/لیکن ترا علاقہ/دل کی رسا لگی تک/مسجد کی اس گلی سے/مندر کی اس گلی تک/سارے جہاں میں اچھا ہے آسماں ہمارا/ہے چاند ہر گلی میں آنگن میں ہے ستارا/سارا ترا علاقہ/سارا ترا جزیرہ

اس نظم کے حوالے سے ڈاکٹر طلحہ ندوی کے کچھ اعتراضات سامنے آئے ہیں، نہایت اختصار کے ساتھ اس سلسلے میں چند باتیں عرض کرتا چلوں۔ کسی بھی تخلیق کو سمجھنے کے لئے، ضروری ہے کہ تخلیق کار، خیال کے جس بلند وبالا مقام پر کھڑا ہو کر شاعری کر رہا ہے، اس مقام تک رسائی ضروری ہے۔ تخلیق کار چند مصرعوں میں ''بہت کچھ'' کہہ جاتا ہے مگر ''سب کچھ'' نہیں کہتا، ایک خلاء اور گیپ اپنے مصرعوں کے درمیان یا خیال کے درمیان ضرور رکھتا ہے، اس خیال کو پائے بغیر ہم تخلیق کی روح تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ لفظوں اور مصرعوں کو جوڑ کر یوں تو کوئی نہ کوئی معنیٰ تو نکالا ہی جا سکتا ہے، مگر ایسے نکالے گئے مفہوم ومعنیٰ اکثر دھوکا دے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد طلحہ ندوی بھی اس نظم کی تخلیقیت اور اسکی گہرائی کو سمجھنے میں کچھ دھوکا کھا گئے۔ اپنی کتاب ''وہاب دانش حیات وشاعری'' کے صفحہ 158 پر رقمطراز ہیں۔

''وہاب دانش اپنی نظموں میں کئی جگہوں پر مذہبی افکار اور اسکی پیش کش میں لغزش کے بھی شکار ہوئے ہیں مثلاً ان کے یہاں گرجا، مندر مسجد اور ناقوس واذاں سب اس طرح سامنے آتے ہیں کہ حق و باطل کے درمیان امتیاز باقی نہیں رہتا بلکہ ''سرودھرم سمان'' اور وحدت ادیان، کا تصور پیدا ہوتا ہے۔''

صفحہ 160 پر یوں معترض ہیں۔

''وہاب دانش شعوری یا لاشعوری طور پر وحدت ادیان کے نقیب دکھائی دے رہے ہیں۔ اہل ادب یہاں پر یہ اعتراض کریں گے کہ شعر وسخن میں فن سے گفتگو کی جاتی ہے نا کہ موضوع سے۔ میرے خیال میں یہ بھی فنی گمراہی ہے کیونکہ فن اسی وقت اپنا جادو جگاتا ہے، جب صحیح موضوع خواہ حقیقی ہو خیالی ایسے لبادے

میں ہمارے سامنے آئے کہ ذہین و دماغ کے ساتھ ساتھ جذبات و احساسات کو بھی دستک دیتا ہو نہ کہ انقباض پیدا کرتا ہو، بہر کیف نظم کا اکثر حصہ فکری اعتبار سے ملحدانہ ہے۔'' (بحوالہ ''وہاب دانش حیات و شاعری''، ڈاکٹر محمد طلحہ ندوی صفحہ 160,158)

طوالت سے بچتے ہوئے بس دو مختصر اقتباس درج کر رہا ہوں حالانکہ اسکے آگے بھی انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے، مجھے ایسا لگتا ہے کہ شاید وہ نظم کی روح تک پہنچ ہی نہیں پائے۔ انکا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اہل ادب شعر و سخن میں صرف فن سے گفتگو کرتے ہیں، ایسا بالکل نہیں ہے۔ ڈاکٹر طلحہ ندوی بہت ذہین اسکالر ہیں انہوں نے جس محنت اور جگر سوزی سے اپنا مقالہ پیش کیا ہے اسکی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، مگر اس نظم میں وہاب دانش سے نہیں بلکہ ان سے تھوڑی لغزش ہوگئی ہے۔

پوری نظم میں خدا کی وحدانیت کا بہترین اظہار موجود ہے۔ فکر کے اعتبار سے نظم کا کون سا حصہ ملحدانہ ہے؟ مندر، مسجد، گرجا یہ سب مختلف مذاہب کی عبادت گاہیں ہیں، جہاں سب اپنے اپنے عقائد کے اعتبار سے اپنی عبادت کرتے ہیں۔ نظم کا عنوان ''رسائی'' کیوں ہے؟ نظم کا ابتدائی لفظ ''خدا'' کیوں ہے؟ عبادت کی رسائی کہاں ہو رہی ہے؟ سب اپنے اپنے طریقے سے اپنے معبود کی ہی پرستش کرتے ہیں۔ مندر، مسجد اور گرجا کے عبادت گزاروں کا منشاء کیا ہے۔ کس کے علاقے کی رسا گلی دل تک ہے؟ کس کی رسا گلی مسجد کی اس گلی سے، مندر کی اس گلی تک ہے؟ پل صراط کے کیا صرف وہی معنی لئے جائیں گے، کیا اس نظم میں تخلیق کار کا یہ اعتراف سامنے نہیں آتا کہ آپ تک پہنچنے کے لئے جو پل صراط اور راستے ہموار کرنے تھے وہ ہم سے نہیں ہو سکا اور آخری کے تین مصرعے پر غور کریں، سارے جہاں میں اچھا ہے آسماں ہمارا آخر اس مصرعے کا یہاں جواز کیا ہے؟ آسمان کو دین سے تعبیر کریں تو سرو دھرم سمان کے ساتھ دیں کی فوقیت بھی واضح ہو جاتی ہے اور 'سرو دھرم سمان' غلط تو نہیں ہے، ہمارا مذہب تو اسکی تعلیم دیتا ہے۔ آخری مصرع سارا ترا اعلاقہ/ سارا ترا جزیرہ، سوال اٹھتا ہے کس کا علاقہ، کس کا جزیرہ؟ یہاں تخلیق کار کی ہنرمندی دیکھئے کی حرف آخر کا تعلق حرفِ اوّل 'خدا' سے جوڑ دیا اور ایک خدا کی وحدانیت کا نہایت خوبصورتی کے ساتھ اعلان کر دیا۔

خاکسار اس ناقص عقل سے نظم کا مفہوم تو یہی سمجھتا ہے، ممکن ہے کوئی صاحبِ نظر اس سے بھی بہتر مفہوم پیش کر دے سب کا اپنا نظریہ ہے اچھی تخلیق کی پہچان بھی یہی کہ ہر کوئی اپنی بصیرت اور فہم و ادراک سے ہی اسکی تشریح و توضیح پیش کرے گا۔

تیسری نظم ''بلائے زمینی'' 'لب مماس'' کی پہلی نظم ہے اسے بھی دیکھتے چلیں۔

خدایا/ تری آسمانی ادا/ موم بنتے میں دیکھوں/ کبھی ایسا ہو کہ/ بلندی سے پستی کے در پہ/ ترے پانو

کی چاپ/ چپ چپ سنوں/ تو پلکوں سے چوموں/ ترے سبز ہاتھوں پہ لب رکھ کے/ آنکھوں سے بولوں کہ/ اندر چلو/ دھوپ دھول سے/ پھول تلوے لہک جائیں گے/ مخملی دودھیا رنگ پک جائیں گے/.....اور تو مجھ سے پوچھے کہ/ کیا حال ہے؟/.....کوئی دکھ/ رنج، صدمہ، مصیبت/ بلائے زمینی/ الم آسمانی/..... اور میں/ ہنس کے بس تجھ سے اتنا کہوں/.....صابریں/.....مع الصابریں۔

عموماً لوگ اپنے مجموعہ کے اوّل صفحہ پر 'حمد' پھر 'نعت' پیش کرتے ہیں 'لب مماس' کے دوسرے صفحہ پر نظم ''صراط پر'' موجود ہے۔ 'صراط پر' کا مطالعہ آپ کر چکے ہیں، جس پر مختصر بحث بھی ہو چکی ہے۔ حمد یا نعت کا یہ روپ کہاں نظر آتا ہے؟ انکا اجتہادی اور اختراعی لہجہ پہلے صفحے سے ہی شروع ہو جاتا ہے اور آخری صفحے تک جاری و ساری رہتا ہے۔

بہر حال اس حمد نما نظم کا عنوان 'بلائے زمینی' ہے 'بلائے آسمانی' نہیں۔ عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ اس زمین میں جو کرب و بلا اور فسق و فجور ہے، جو انتشار و تشدد ہے، جو منافرت و منافقت ہے یا جو بے چہرگی اور بے یقینی ہے یہ سب انسانی اعمال و احوال کے نتیجے کے طور پر سامنے آتی ہیں، جبکہ نظم میں اسکا ذکر کہیں بھی نہیں مگر شاعر انہیں وجوہات سے بہت ہراساں اور رنجیدہ ہے اور خدا سے ملتجیانہ لہجے میں اسکی ادا کو موم بنتے دیکھنا چاہتا ہے اور اپنے خدا کو آسمان سے زمین پر بلانا چاہتا ہے۔ پوری نظم میں ایک عجیب معصومانہ کیفیت موجود ہے۔ نور کو مجسم کر کے اسکے پاؤں کی چاپ سننا چاہتا ہے، پلکوں کو چومنا اور سبز ہاتھوں پہ لب رکھنا چاہتا ہے، اسکے پھول سے تلوے کو لہکنے سے بچانا چاہتا ہے اور یہ تمنا کرتا ہے کہ وہ مجھ سے پوچھے کہ کوئی دکھ، رنج، صدمہ، بلائے زمینی، الم آسمانی اور میں ہنس کے بولوں کہ صابریں۔ مع الصابریں۔ بہت دکھ اور رنج ہونے کے بعد بھی کچھ نہ کہنا، صبر کرنا اور صبر والوں کے ساتھ اللہ کا ہونا کافی ہے، استعاروں اور اشاروں کے ذریعہ اس احساس کا پیدا کرا دینا فنکاری نہیں تو کیا ہے؟

نظم میں جس قسم کی پیکر تراشی ہوئی ہے اور جو اجتہادی انداز سامنے آتا ہے، وہ خدا سے والہانہ محبت اور قربت کو ظاہر کرتا ہے۔

وہاب دانش کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے جسے کسی دائرے میں محصور نہیں جا سکتا۔ انکی نظموں میں خدا سے مولویانہ تعلق نہیں بلکہ ایک والہانہ اور دوستانہ تعلق سامنے آتا ہے، اور یہ رنگ بیشتر نظم میں موجود ہے، جہاں بھی وہ خدا سے مخاطب نظر آتے ہیں۔ شروع میں جیسا کہ میں نے اصرار کیا ہے کہ دانش ایک مشکل پسند شاعر ہیں، کچھ فلسفیانہ انداز بھی انکے مزاج میں رچا بسا ہے۔ سہل پسندی انکے مزاج کا حصّہ نہیں۔ بعض نظمیں آسانی سے پلّے نہیں پڑتیں۔ ذہنی مشقت کے بنا نظم کی روح تک ہم نہیں پہنچ سکتے، کیونکہ یہ نظمیں کیف و سرور

اورسمت ولاسمت خیال کی بلند پروازی سے تخلیق ہوئیں ہیں' لہذا اسکی تشریح وتوضیح بھی عام نظموں کی طرح پیش نہیں کی جاسکتی ۔کہیں کہیں خیال کے بکھراؤ کی وجہ سے افراط وتفریط کے شکار بھی ہوئے ہیں ۔ میں اس بات سے انکار بھی نہیں کرتا کہ 'لب مماس' کی کئی ایسی نظمیں ہیں جہاں ترسیل کا مسئلہ سامنے آتا ہے' اور یہ مسئلہ بھی انکے اجتہادی واختراعی طبعیت کی وجہ سے ہی سامنے آتا ہے' ایسا مجھے محسوس ہوتا ہے۔

دانش اسلامی تواریخ کا گہرا شعور رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انکے یہاں اصطلاحات وتلمیحات کا ایک مضبوط ومربوط رشتہ مذہبی واقعات سے قائم نظر آتا ہے۔لفظیات کی بات کریں تو انوکھے اور غیر مستعمل الفاظ بھی اس خوبصورتی کے ساتھ سامنے آتے ہیں کہ آپ رشک کرنے لگیں۔ وہ مانوس وغیر مانوس لفظ کو استعارہ وعلامت کی صورت میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اسکی معنویت میں بلا کی تہہ داری پیدا ہوجاتی ہے۔شاعری میں برتے گئے کچھ الفاظ بطور نمونہ درج کررہا ہوں جو لغتی معنی سے الگ اپنی استعاراتی اور تلمیحاتی معنویت کے ساتھ تخلیق کا حصہ بنے ہیں۔لب مماس کے مطالعے سے ہی آپ اسکے فنی وفکری محاسن کو بہتر ڈھنگ سے سمجھ سکیں گے۔اس طرح کے الفاظ دانش کے یہاں کثرت سے استعمال ہوئے ہیں مثلاً۔

لب' صحرا' ریت' دجلہ' فرات' صراط' خضر' سراب' لہو' صلیب' رسائی جزیرہ' انا' شفالی' برگ صفا' تلخہ' لہلہا' لمس' آئینہ' سایہ' نیلگوں' تشنگی' شب بہ شب' لاوہب' پارسہ لب' سفالگی' تہہ نشیں' پارہ پارہ' کشتی' بادباں' آگ' الاؤ' گپ طوفاں' سمت' لاسمت' قدم قدم' ریزہ ریز' لامتن' لاساخت' صدا' گزیدہ' نقطہ' نطفہ' شعلہ' شعلم' گھاس' اگاس' رف رف' نوری نوری وغیرہ اس طرح کے سینکڑوں الفاظ انکے مجموعے میں آپ تلاش کرسکتے ہیں۔لفظوں کے تکرار سے وہ ایک آہنگ اور غنائیت آزاد نظموں میں بھی پیدا کردیتے ہیں یہ انکی مشاقی کا بین ثبوت ہے۔

المختصر یہ کہ وہاب دانش نہایت موثر تخلیقی زبان کے بہت اہم شاعر ہیں' جو بے اعتنائی کے شکار رہے۔انکی تخلیق' تخلیقی فنکاروں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوسکتی ہے۔لہذا' ادب کے سنجیدہ قارئین کو انکی شاعری کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔

◄◄ ● ►►

H.O.D .Urdu
D.S.College,Katihar(Bihar)
8210645681

● ڈاکٹر ارشد اقبال

اسرار گاندھی کا تخلیقی اِرتفاع

زبان کو دوام بخشنے کے لیے کسی بھی معاشرے کا ادب، کلیدی حیثیت رکھتا ہے، چونکہ اس کے اثرات مجموعی معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں، اِردگرد کا ماحول، ادب پر گہرا تاثر چھوڑتا ہے، اس لیے دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم کی حیثیت اختیار کرلیتے ہیں۔یہی وہ مقام ہے جہاں ایک حساس نوکِ قلم حرکت میں آتی ہے اور ادب تخلیق ہوتا ہے۔

اَدیب معاشرے کا وہ اہم اور حساس فرد ہے جو اپنے اِردگرد پیش آنے والے حالات وواقعات کی جانچ پرکھ کر کے صفحہ قرطاس پر نا صرف بکھیرتا ہے، بلکہ اپنی زبان کو ایک نئی جہت سے متعارف بھی کراتا ہے۔کہانیوں میں حقیقت کا رنگ بھر کر اپنے معاشرے کو ایک نیا روپ دے کر زبان کے تحفظ میں برسرِ پیکار نظر آتا ہے۔

فنون لطیفہ میں افسانہ طرازی ایک ایسی صنف ہے جس نے بیک وقت قاری اور مصنف دونوں پر گہرے اثرات مرتب کیے، داستان اور ناول کے برعکس افسانہ جدید تقاضوں کو پورا کرتا ہوا آگے بڑھا اور وقت کو مٹھی میں مضبوطی سے تھامے، قاری کی دہلیز پر دستک دینے کے لیے نکل کھڑا ہوا، اُسے داستان یا ناول کی بدلی ہوئی مختصر صورت سے بھی مربوط کیا جاسکتا ہے، کیونکہ دورِ حاضر کے انسان کو تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے کے قدم سے قدم ملا کر چلنا پڑ رہا ہے۔اس مشینی دور کی تھکا دینے والی زندگی میں اِسے اتنا وقت میسّر نہیں کہ بھرپور فرصت کے لمحات نصیب ہوں اور وزنی کتب کا مطالعہ کر کے جذباتی تسکین و ذہنی آسودگی کا سامان مہیا کرسکے، چنانچہ وقت کی قلت کا یہ احساس افسانہ کی طرف متوجہ ہونے کی ایک اہم وجہ بھی بنا...!!

جب ۱۹۷۵ء اور ۱۹۸۰ء کے درمیان جدیدیت کا رجحان کمزور پڑنے لگا تو بہت سے افسانہ طرازوں کے نظریات ورجحانات میں نمایاں تبدیلی نہایت شدت سے محسوس کی گئی، انھوں نے فرد اور سماج دونوں پر خاطر خواہ توجہ دی، زندگی کے بے شمار مسائل کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔اب ان کے نزدیک بڑھتی انسانی آبادی کا پھیلاؤ، بے روزگاری، ماحولیاتی کثافت، اقلیتی طبقہ کے تئیں حکومت کے معاندانہ رویے، اعلیٰ سطح پر رشوت ستانی، کالا بازاری، انتظامیہ کی بے بسی، لاقانونیت کا خوف، سرمایہ داری کا عروج

،اس کی زد میں آئے عام انسان ،جرائم کا بڑھتا گراف،علاقائی،لسانی،مذہبی اور مسلکی تعصب،نسلی امتیازات،دہشت گردی،بنیاد پرستی کے احیاء کی جدوجہد،معاشرتی ناہمواری ،خواتین کا استحصال ،امیرغریب کے مابین بڑھتی خلیج ،سماج میں موجود افلاس سے جوجھتے ہوئے لوگ ،غربا کا سماجی و سیاسی استحصال اور کمزوروں پرظلم وغیرہ۔ان تمام مسائل کوہم عصر افسانہ نگاروں نے بڑی جرأت مندی سے پیش کیا اور اِن مسائل کواپنے فن پاروں کا خاص موضوع میں بنایا۔

افسانوی تخلیقات میں نئے نظریات ،رجحانات اور تصورات کے اثرات کا دائرہ اتنا وسیع ہوا کہ اردو فلکار کے ہاں متذکرہ موضوعات ، کثرت سے برتے جانے لگے،لیکن اسلوب ،افسانے کی تکنیک ،قوتِ اظہار،تخلیقی ارتفاع اور قاری کوفوری اپنی گرفت میں لینے کی قوت(Virtue authority) کہیں کہیں نظر آئی۔

افسانہ کی تعریف میں الیزابیتھ باون کہتی ہیں کہ وہ پلاٹ جوخود کولکھوانے کے لیے قلم کار کو مجبور کردے،وہ ایک کامیاب تخلیق تصور کی جائے گی لیکن کہانی لکھنے کی یہ کیفیت اسرار گاندھی کے ہاں نہیں ملتی اور نا ہی وہ داخلیّت پسندی سے کام لیتے ہیں بلکہ حقیقت اِس کے بالکل برعکس ہے۔افسانہ کے تعمیری نظام میں موصوف کے تجربات ومشاہدات کا زیادہ عمل دخل ہے اور قوتِ استدلال بھی کارفرما ہے،جس میں مجموعی طور پر سماج و معاشرے کی بے حسی بھی آتی ہے اور فرد کا فطری اور غیر فطری رویہ بھی،موصوف کے بعض افسانوں میں کردار کی حرکات اور اُن پر عمل کرنے والی قوتوں کے باہمی تعلق کا مطالعہ بھی کیا جاسکتا ہے اور جہاں جس رنگ کا تلازمہ باندھتے ہیں،اُس کی نا صرف تصویرسی کھینچ دیتے ہیں بلکہ بیباکانہ طریقے سے اُن پر تنقید کے در وا کر دیتے ہیں۔اس کی بہت اچھی مثال ،افسانہ''نالی میں اُگے پودے''میں ذکیہ کے غیر روایتی کردار کے رویہ سے پیش ہوتا ہے۔افسانہ کے چند پیراگراف ملاحظہ کیجیے:

> ''شہر میں کتنا چرچہ تھا اُس کا،اُن دنوں......شاید اُس نے طے بھی کر رکھا تھا کہ وہ بدنامی کی تمام منزلیں طے کر کے ہی دم لے گی...رالنس براٹ بڑے بڑے ہوٹلوں سے تنہا نکلنا،نامناسب لوگوں سے یاری اور فیشن کی انتہا ختم کر دینا،شاید اُس کی زندگی کا مقصد بن کر رہ گیا تھا...اچانک ذکیہ نے ایک لمبی چھلانگ لگائی تھی۔''

افسانہ میں ایک Supportive کردار انجلی کا بھی پیش کیا گیا ہے،جس سے جڑی کیفیات کا اظہار اس طرح ملتا ہے:

''اپنی اسی کشش کی وجہ سے ایک دن وہ اُس کے دل کے نہاخانوں میں بڑی خاموشی سے اتر گئی

تھی،پھر وہ بھی انجلی کے وجود میں سرایت کر گیا تھا...اندرونِ جاں موجود لوگوں کے درمیان کبھی کوئی مکالمہ نہیں ہوا،صرف رویے بولتے رہے اور اُن کے وجود قرب کی مدھم مدھم آنچ میں سلگتے رہے۔''

مندرج بالا Supportive اور Unsupportive ڈسکورس کے پہلے پیراگراف میں عورت کی بے راہ روی کی Morbidezza جبکہ دوسرے میں سماجی تحدیدات کا توازن ملتا ہے۔ یہاں مصنف نے ذکیہ کا پیش منظر پر نہایت چابکدستی اور جرائت مندانہ بلکہ عقابی نظر رکھی ہے لیکن اسی منفی کردار ذکیہ کا سماجی پس منظر پیش کرنے میں قصیر النظری سے کام لیا ہے۔مقامی،ثقافتی متون کے داخلی تضادات کو پرکھنے کی کوشش ہونی چاہیئے تھی کہ جو ہماری تہذیبی وتمدنی زندگی سے،ان میں موجود سماجی بے حسی کے باعث نکال باہر کر دیئے گئے ہیں اور ذکیہ جیسے کردار مایوسی کی آخری دیوار سے لگے کھڑے اپنے اندرون میں سسک رہے ہیں۔

خارج اور حادثات ہمیشہ خیالات کا محرک بنتے ہیں گو کہ نفسیات کے بعض علماء لفظ'جبلّت' کے بجائے'محرک' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔بہرکیف موصوف کا ایک افسانہ''آڑے ترچھے دائرے''اسی essence اور unessence کا بیانیہ ہے کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی منتشر ہوتی ہے اور آگ کی لپٹیں دور تک پھیلتی ہیں پھر انہیں لپٹوں کو چیر کر ایک عورت غیر مانوس طریقے سے مرد کی پناہ میں آکر دیکھتی ہے کہ مرد بھی موت کے خوف سے تھر تھر کانپ رہا ہے۔مرد اور عورت کے ربط واختلاط سے پیدا ہونے والی جنسی آگ بھی موت کے خوف سے سرد پڑ جاتی ہے لیکن مصنف نے افسانے کے درج ذیل پیراگراف سے افسانہ کا رخ مرد کی جبلّت کی طرف موڑ دیا:

> ''شام ہو چکی ہے،میں سوچتا ہوں کہ شاید اِس اچانک قید کی آخری شام ہو۔آج دن میں ہم دونوں نے نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں کی ہیں۔کافی ہنسے بھی ہیں اور خوف کی کئی پرتوں کو اُترتے ہوئے بھی محسوس کیا ہے۔صرف ایک گھنٹے کی آزادی کا خیال زندگی سے کتنا بھر پور ثابت ہوا۔''

اب افسانہ کا دوسرا پیراگراف:

> ''میری آنکھیں سڑک پر چلنے والے شور سے کھل جاتی ہیں،وہ مجھے کمرے میں دکھائی نہیں دیتی میں اُسے آنگن اور باتھروم میں تلاش کرتا ہوں،وہ وہاں بھی نہیں ہوتی اور پھر جب دوبارہ کمرے میں آتا ہوں تو نظریں ٹیبل واچ کے پاس رکھے ہوئے ایک چھوٹے سے کاغذ پر پڑتی ہیں،میں اسے اٹھا کر پڑھنے لگتا

ہوں.....'' آپ کے دل سے موت کا خوف ایک دن اور نہ دور ہوتا۔''

اس طرح متذکرہ افسانہ مرکزی خیال کے مجموعی حجم میں essence اور unessence عصری معنویت (virtuality) کا ڈسکورس بنتا ہے۔

افسانہ ''شاور کا شور'' وا شگاف بیانیہ میں عمدہ تخلیق ہے۔مصنف نے غیر طبعی نفسیات (abnormal psychology) کے اطلاق سے فرد کے افعال، ذہنی امراض کی درجہ بندی اور ان کے اسباب، نہایت ہنرمندی سے پینٹ کیئے ہیں، جس سے نئی ادبی ثقافت میں در آنے والے قبیح رجحانات اور خودستائشی وخودفریبی کے عناصر دریافت کرنے کی ایک عمدہ کوشش ہے۔مصنف نے سیمیناروں اور ادبی محفلوں میں تانیثی ربط واختلاط سے جنم لینے والی اجسام پرستی کے واضح اشارات اور نئی ادبی ثقافت پر نا صرف روشنی ڈالی ہے بلکہ قاری کے ذہن کو نئے ادبی زوال کی دجلیات کی طرف موڑ دیا ہے۔گوکہ کہانی میں نفسیاتی شور مسلط ہے جبکہ جنسی کج روی کو افسانہ کا موضوع بنایا گیا ہے۔ موصوف اِس قسم کے ادبی erotica کو بڑے سلیقے سے برتنے کا فن خوب جانتے ہیں۔ادب یا کسی بھی شعبہ ہائے زندگی میں تعلّی کا شکار فرد کے رازہائے پنہاں کو بڑی بیبا کی سے افشاں کر دیتے ہیں:

''چند ساعتوں کے بعد ایک ہاتھ بڑھا اور روشنی گل ہوگئی، ابھی روشنی گل ہوئے تین چار منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ مسرت اٹھ بیٹھی، اُس نے نائٹ لیمپ کا سوئچ آن کیا، اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ کے آثار نمایاں تھے۔ وہ اٹھی اور باتھ روم میں داخل ہوگئی، واپس آئی تو اس سے مخاطب ہوکر بولی۔''تم پر اب عمر کا اثر ہوچلا ہے۔ مجھے یاد ہے میرے ساتھ پچھلی بار بھی ایسا ہی ہوا تھا'' وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا، خاموشی کے ساتھ شرمندگی نے بھی کنڈلی مار رکھی تھی۔اگلی صبح دونوں بیٹھے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے، مگر بیزاری دونوں کے درمیان براجمان تھی۔ پھر یہ خاموشی اسی نے توڑی...''تمہارے شوہر کیسے ہیں؟''اس کے منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔،مسرت نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا پھر بولی .....''ٹھیک ہیں.....تم سے بہتر ہی ہیں'' وہ مسکرائی.....وہ کھسیا گیا۔''

جب فرد، معرفہ اور نکرہ کی کیفیت کا دورانیہ عبور کرتا ہے، تو ''گہرے بادل'' جیسا افسانہ عالم خلق میں جنم لیتا ہے۔جبر واستبداد، خواہ سیاسی ہو، سماجی ہو یا معاشرتی، عبوری ہو یا مستقل حیثیت اختیار کر چکا ہو ،فرد کو مختلف دائروں میں قید کر دیتا ہے۔افسانہ ''گہرے بادل'' استعارہ بندی اور اشاروں کنایوں میں جبریت واستبدادی کیفیت کا ڈسکورس بنانے کی کوشش ہے۔متذکرہ افسانہ میں مصنف نے ایک مجازی 'کوٹ' کو دکھایا ہے جو اپنی لغوی حدود سے نکل کر جبر واستبداد کی نشاندہی کرتا ہے۔افسانہ میں ''وہ'' اور اُس کا

دوست حمزہ، اِسی کیفیت آگیں 'کوٹ' میں کسمسا رہے ہیں۔ جبر اور استبدادی دائرے چونکہ مستقل حیثیت میں نہیں تھے۔

دراصل انقلابِ روس، تاریخ کا درخشاں باب ہے اور افسانہ ''گہرے بادل'' سوویت یونین میں کمنسٹوں کے سیاسی نظام وانصرام کا مونتاژ (Montage) ہے، جس میں کمیونزم کے خلاف روسی عوام کی بیداری، سیاسی استبداد اور عوام پر مسلط کی گئیں جبری تحدیدات کا بیانیہ ہے۔مندرج ذیل اقتباس ملاحظہ کریں:

''پھر ایک دن اُس 'کوٹ' کہ جس کا رنگ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ سیاہی مائل ہوچلا تھا؛ کی تمام سلائیاں ٹوٹ ٹوٹ کر کھل چکی تھیں۔آستین کا کالر، شولڈر، جیبیں، کوٹ کے دوسرے حصے سب ہی کچھ ایک دوسرے سے الگ ہوکر ٹکروں ٹکڑوں میں بٹ چکے تھے۔اب نہ کسی کا شور تھا اور نہ ہنگامہ، صرف طوفان کے گزر جانے کے بعد کا سنّاٹا تھا۔''

'کوٹ' کے تمام حصوں کا ٹوٹ ٹوٹ کر ایک دوسرے سے جدا ہونا، سوویت یونین کا سقوط اور کمنسٹوں کے عدم تسلط کی تصویریں ہیں۔

افسانہ سے ایک اور قتباس:

''حمزہ مسکراتے ہوئے دیکھ کر، اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی ... پھر دونوں کی مسکراہٹیں طویل قہقہوں میں بدل گئیں، مسکراہٹوں سے قہقہوں کا ایک لمبا سفر...اور اُس سفر کے درمیان لگاتار بڑھتا ہوا شور.....''

''شور.....ہنگاموں کو جنم دیتا ہے۔

اور ہنگامے..... جو نئی سوچ اور سمجھ کو جنم دیتے ہیں..... پھر یہ سوچ اور سمجھ اپنے وسیع دامن میں کیا کیا کچھ بھر لاتے ہیں۔

شور.....

ہنگامے.....

نئی سوچ سمجھ.....

ایک مستطیل.....

اور اس مستطیل کے درمیان 'وہ' اور حمزہ اور بے شمار لوگ اپنے اوپر لدے ہوئے 'کوٹ' میں بھرپور طریقے سے کسمسا رہے تھے۔''

افسانہ ''گہرے بادل'' ہندستان کے موجودہ سیاسی تناظرات کو بھی زیرِ بحث لاتا ہے۔

کچھ عرصہ قبل موصوف کا نیا فسانوی انتخاب ''ایک جھوٹی کہانی کا سچ'' منظر عام پر آیا ہے، جس میں اِسی عنوان سے ایک مستقل افسانہ بھی موجود ہے۔ کہتے ہیں، فکشن کا سچ حقیقت سے زیادہ سچّا ہوتا ہے۔ا فسانہ ''ایک جھوٹی کہانی کا سچ'' ایسا ہی افسانہ ہے، جو معنوی اعتبار سے بدیع الاسلوب میں نا صرف ذو جہت افسانہ ہے بلکہ کافی دلچسپی کا حامل بھی ہے۔ افسانہ میں بیک وقت دو کہانیاں موجود ہیں پہلی میں فرد کی عدیم الفرصت اور عدیم الحس کی وجہ سے عورت شہوت کی آگ میں جھلسنے لگتی ہے اور اس کی طبیعت شہوتِ کلبی کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ موہن ایک ایسا کردار ہے جو امیروں کے ہاں کام کاج کرتے ہوئے سیکس ورکر بن جاتا ہے، وہ ایسی ہی عورتوں کی شہوت کلبی کو دور بھگانے کا روبوٹ ہے جو اپنے مردوں کی عدم فرصتی کے سبب، غیر روایتی سفر کا انتخاب کرتی ہیں۔ جسمانی نا آسودگی و تشنگی کا شکار عورتوں کا یہ کھیل سماج و معاشرے میں ژرف نگاہی کا متقاضی ہے، جسے اسرار گاندھی کی نگاہیں اور ان کی تشکیکی حسیت تلاش کر لیتے ہیں، جس میں ژرف بینی کے جلوؤں کے ساتھ حقیقت نگاری کی تابانی بھی نظر آتی ہے، لیکن جلد یا بدیر یہ حال دل آ گہی پر کھل جاتا ہے اور فرد پر سود و زیاں کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اسی افسانہ سے ایک دلچسپ اقتباس:

''پھر وہ رات جو اچانک اس کے ذہن میں ابھری تھی، کہیں غائب ہو گئی اور اس کی جگہ دوسری بہت سی راتوں نے لے لی... ان راتوں نے جو اس نے سیٹھانی کے کہنے پر دوسری عورتوں کے ساتھ گزاری تھیں اور رات کی اجرت، اُسے نوٹوں کی شکل میں حاصل ہوئی تھی۔ یوں وہ ایک ایسے راستے پر چل پڑا تھا جہاں وہ تھا، تشنگی کے شکار جسم تھے اور پیسہ تھا۔ پھر ایک دن اس نے سیٹھ داتا رام کی نوکری چھوڑ دی اور کرائے کے ایک فلیٹ میں شفٹ ہو گیا کہ وقت نے اُسے سود و زیاں کے بہت سے زاویوں سے آشنا کر دیا تھا۔''

''ایک جھوٹی کہانی کا سچ'' میں سکّے کا دوسرا رُخ، عورت کی بے اہمیتی (Insignificance) کا ارتکاز ہے۔ جنّی ایک ایسا ہی کردار ہے جو موہن کی طرح سیکس ورکر ہونے کے باوجود ایک اچھی اور باوقار زندگی جینے کی خواہاں ہے۔ جنّی جو مرد کی تنہائیوں میں کمی کا احساس تو بڑی شدت سے کراتی ہے لیکن ایک بنیادی فرق کی وجہ سے قابل تسلیم نہیں ہے۔ اسی افسانہ سے دوسرا اہم اقتباس:

''تم مجھے اتنا ہی چاہتے ہو۔''

''ہاں میں تمہیں اتنا ہی چاہتا ہوں، مجھے تمہاری کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے، کئی بار مجھے تمہارے کندھوں کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''اگر ایسا ہے تو پھر میرے ساتھ مل کر گھر کیوں نہیں بسا لیتے؟۔''

''نہیں... یہ تو نہیں ہو سکتا...''

''کیوں.....! ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟''

''دیکھو جنّی..... میں اب ایک صاف ستھری اور اچھی زندگی گزارنا چاہتا ہوں کہ اس طرح کی زندگی سے میں تھک چکا ہوں... پھر تم خود ہی سوچو کہ کیا میں کسی ایسی لڑکی سے شادی کر سکتا ہوں جس کا ماضی، اس کے حال سے الگ نہ کیا جا سکے۔''

''یہ تم کہہ رہے ہو..؟ کیا تم نے کبھی آئینہ نہیں دیکھا؟...''

''میں نے کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ مجھ میں اور تم میں ایک بنیادی فرق ہے۔''

گو افسانہ میں مرد کا زاویہ نگاہ حاوی رہتا ہے لیکن کلائمکس عورت کے زاویہ نظر میں بدل جاتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں مرد کی سرشت کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

موصوف کے دیگر فن پاروں میں جو میری نظر سے گزر چکے ہیں ''دھوپ چھاؤں، پرت پرت زندگی، پناہ گاہ، مفاہمت کا عذاب، بلیک آؤٹ...'' وغیرہ وہ تخلیقات ہیں جو مکمل طور پر توجہ چاہتی ہیں۔

اسرار گاندھی کے تعلق سے ایک تاثر جو قابل غور ہے، کہ موصوف لکھنے کے معاملے میں حد درجہ محتاط معلوم ہوتے ہیں۔ موصوف کی مجموعی ادبی خدمات کئی دہائیوں پر محیط ہے لیکن ان کے ادبی پروفائل میں کتابوں کے انبار نہیں ملتے بلکہ منتخب افسانوں کے چند مجموعے موجود ہیں، یہ ادب میں ایک بہترین فکری طریقہ ہے جو انتہائی ناسازگار حالات میں بھی انسانی زندگی کی مثبت قدروں کا ترجمان بنتا ہے۔ ممکن ہے، اسی سبب اسرار گاندھی کے فن پاروں کی اساس عام طور پر شدید حساسیت، انسان دوستی و ہمدردی، ہمہ گیر قوت مشاہدات و تجربات اور فن کارانہ توازن، اور عموماً مظلوم، مفلس اور تنہائی کا شکار کرداروں کے ساتھ نہایت ہمدردی اور دردمندی پر رکھی ہوئی ہے۔ ان کے ہاں ایک خوبصورت کرب اِرتقاعی (elevation) صورت حال کی پیداوار ہے جو ان کی طبیعت اور ذوقِ جمال کے تخلیقی اضطراب کے راستے، حسن تخلیق کی دلکشی اور گراں مایہ معنوی موزونیت کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ زندگی کو سمجھنا، اس کے اثرات قبول کرنا، تخلیقی سطح پر پوری انسانیت کو اس کرب میں سمیٹنا اور پھر زندگی سے جینے کا حوصلہ مانگنا، اُسے بعض اَوقات نوکِ قلم رکھنا اسرار گاندگی کی تخلیقی خصوصیات (Paradigmatic) ہیں۔ زندگی سے قریب، اس کے افہام و تفہیم اور تشریحات کا تخلیقی ادراک، انسانی سماجی اقدار کی نا برابری، مجموعی معاشرے کا ابھرتا ہوا نیا چہرہ افراد کی نفسیاتی اور سماجی قدروں کا جدید پس منظر اسرار گاندھی کے فن پاروں کا

محور ہے، وہ اکثر و بیشتر معاشرہ کا گہرائی و گیرائی سے مطالعہ کرتے ہوئے کرداروں کی تہہ تک پہنچنے کی سعی کرتے ہیں تو کبھی کرداروں کہ تہہ داریت کے راستے معاشرے کی جدلیات (Dialectics) سے اپنا تعلق مضبوط ومنضبط کرلیتے ہیں ۔ان کے فن پاروں کے موضوعات نئی انسانی اور سماجی اقدار (infrastructure) کی صورت سامنے آتا ہے ۔کردار سے کردار، کردار سے معاشرہ اور معاشرہ سے ایک بار پھر کردار کی جانب واپسی کا عمل، انہیں ایک بہترین سماجی ومعاشرتی نقاد ثابت کرتا ہے ۔وہ اپنے افسانوں میں Supportive Psychology کی وساطت سے کرداروں میں حوصلہ اور زندگی کا نیا جوش پیدا کردیتے ہیں ۔یہ اسرار گاندھی کے فن پاروں کا وہ تخلیقی اور حسی Dimension ہے جس کی طرف انھوں نے نہایت دبے پاؤں سفر کیا ہے۔

اسرار گاندھی کا تخلیقی ارتقاع اپنے بہترین اسلوب، فن کی پختگی، تخلیقی فعلیت کے لحاظ سے اردو افسانوی ادب کی تاریخ میں اپنا نام درج کرانے میں پورے طور پر اہل ہے ۔گوکہ فنی سطح پر افسانے میں کئی ایک تجربات کیے گئے ،لیکن اس کا فن گھوم پھر کر پھر زندگی کے اسی فطری وحقیقی عمل سے مربوط و منضبط ہوجاتا ہے جو زیست کی اصل ترتیب وتہذیب ہے ۔اگر اسلاف میں انتظار حسین، احمد ندیم قاسمی، قرۃ العین حیدر یا جیلانی بانو کے فن پاروں کو ہم بغور دیکھیں اور سمجھیں تو یہ بات قبول کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہوگی کہ اسلوب، زندگی کے اسلوب سے بہت نزدیک ہے ۔ایک قدرتی بہاؤ اور قدرتی افسانہ طرازی گویا فطری نظام کے تحت، اِن افعال، ارادوں اور احساسات وجذبات کی ترسیل، اسی ترتیب سے ہورہی ہے۔

لہٰذا کہہ سکتے ہیں کہ جو ترتیب اسلوب اور پلاٹ کی ہے وہی ترتیب زندگی کی ہے ۔چنانچہ شاہکار افسانہ بھی وہی ہے جو اسی فطری اور فکری نہج پر خلق ہوا ہو، جس سے افسانہ طراز اور فطرت کے مابین ایک مربوط روابط وضوابط محسوس ہوں ۔اسرار گاندھی کے ہاں بھی فنی موشگافیوں کے لحاظ سے روابط وضوابط اور فطری انسلاک ملتا ہے۔

◀◀ ● ▶▶

4/F-14Kala Pyada
Sanbhali Gate
Moradabad(U.P)
9412838013

● ڈاکٹر خالدہ ناز

کٹی ہوئی شاخ.....ایک تجزیہ

''کٹی ہوئی شاخ'' پروفیسر قمر جہاں کی کہانیوں میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہے ۔جو اپنے عنوان سے ہی منفرد ہے ۔اس لئے قاری کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے ۔پھر جیسے ہی کہانی کا آغاز ہوتا ہے ۔ذہن فوراً ہجرت کے کرب کو محسوس کرنے لگتا ہے کہ وطن سے دوری اور اپنے ہی وطن میں اجنبیت کا احساس سچ مچ کٹی ہوئی شاخ کی مانند ہی تو ہے۔

اردو ادب کی تاریخ میں قمر جہاں کا نام محتاج تعارف نہیں ۔وہ ایک اچھّی ناقد بھی ہیں اور اعلیٰ پائے کی افسانہ نگار بھی ۔اب تک ان کے کئی افسانوی اور تنقیدی مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں ۔وہ بہار میں شکیلہ اختر کی روایت کی پاسبان بن کر ابھری ہیں ۔شروع سے ان کے افسانے ملک کے معیاری ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں ۔جو ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے ۔ان کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف نسوانی کردار کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے ۔بلکہ انہوں نے اپنے افسانوں میں سماج کی سچی تصویریں پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۶۴ء سے ہوا ہے ۔شروع سے افسانوں اور مقالات دونوں صنف میں اپنی حاضری درج کرائی ہے ۔ان کا قلم ابھی تھکا نہیں ہے ۔بلکہ ایک لمبے عرصے تک اپنی درس وتدریس کی ذمّے داریوں سے سبکدوش ہونے کے بعد اب اور رواں دواں ہے ۔بعض ایسے تحقیقی مقالے نظر سے گزرے ہیں جو تشنگان ادب کی سیرابی کررہے ہیں۔

پیشِ نظر کہانی ان کے افسانوی مجموعہ ''اجنبی چہرے'' میں شامل ہے ۔جس کے دو ایڈیشن آچکے ہیں ۔لیکن پہلی بار اس کہانی کی اشاعت ماہنامہ ''ایوان اردو'' دہلی، نومبر ۱۹۹۰ء میں ہوئی ۔اس افسانہ کا ترجمہ پنجابی زبان میں بھی ہوچکا ہے جسے پرتپال سنگھ بے تاب نے کیا ہے ۔یہ افسانہ بہار کے میٹرک بورڈ میں بھی شامل ہے ۔اس میں کوئی دورائے نہیں کہ بچے اسے پڑھ کر وطن پرستی کے جذبات کو اچھی طرح سمجھ رہے ہیں جو انہیں آنے والی زندگی میں اپنے وطن سے سچی دوستی اور اس سے محبت کا سبق ہے ۔حالانکہ یہ کہانی چھبیس ستائیس سال پہلے وجود میں آئی ہے ۔لیکن آج بھی اس کا موضوع بالکل نیا معلوم ہوتا ہے۔

ابھی بھی ملک میں نوجوانوں کی یہی حالت ہے۔ وہ پیسہ کمانے کے دھن میں وطن سے دور جانا پسند کرتے ہیں۔ جنہیں بعد میں یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کس طرح اپنے چاہنے والوں اور اپنے وطن کی مٹّی سے دور ہو گئے ہیں۔ جب دوسرے ملک کی سرزمین پر وحشت کے بادل منڈلانے لگتے ہیں۔ تو وہ کہیں کے نہیں رہتے۔ ٹھیک اس کہانی کے کردار کی طرح جو کئی سالوں بعد اپنے وطن واپس آیا ہے۔ جہاں اسے ہر چیز نئی، نئی اور اچھوتی لگ رہی ہے۔ لیکن اس اجنبی پن میں بھی اپنے پن کا احساس حاوی ہے۔ گویا افسانہ کا آغاز ہی بے حد دلکش ہے۔ پہلی سطر ہی پڑھنے والوں کی تمام توجہ اپنی طرف مرکوز کر لیتی ہے۔

''کتنے سال بعد وہ اپنے وطن واپس آیا تھا۔ ہر چیز نئی، نئی اور قدرے اچھوتی، اچھوتی سی معلوم ہو رہی تھی اُسے.....ایک مدت تک باہر رہ جانے کے باعث اب وہ خود اپنے وطن کے لئے اجنبی سا ہو گیا تھا۔ مگر اس اجنبی پن میں بھی اپنے پن کا احساس پنہاں تھا۔ وہ دیر سے خود اپنے آپ سے سوال کر رہا ہے۔''

یہ پوری کہانی واحد متکلم کے صیغے میں آگے بڑھتی ہے اور اس کہانی کا میں جس کا نام بھی ظاہر نہیں ہو پاتا اپنے آپ سے سوال کرتا ہوا زندگی کے بہت سے تلخ حقائق پر سے پردہ اٹھانے میں پوری طرح کامیاب نظر آتا ہے۔ پوری کہانی فلش بیک میں اپنا سفر طئے کرتی ہے اور ہچھلے واقعات ٹی۔ وی۔ اسکرین کی طرح اس کے ذہن میں رقصاں ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا ذہن ڈھیروں سوالوں کا آماجگاہ بنا ہوا ہے..... اس کی سوچ کے ذہن سے ابھر کر کچھ ایسے مکالمے سامنے آتے ہیں جو قاری کے ذہن میں بہت دنوں کے لئے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

''آخر وہ اتنی اچھی سرزمین اور ایسے دلدار لوگوں کو چھوڑ کر کیوں اتنے لمبے عرصے تک.....؟ کیا اب سچ مچ اس کی حیثیت یہاں اس ٹوٹی ہوئی شاخ کی سی ہے جو درخت سے علیحدہ ہو چکی ہے؟''

پڑھنے والے کے ذہن میں یہ باتیں دیر پا نقش چھوڑتی ہیں۔ اور وطن کی آدھی روٹی بھی بھلی معلوم ہونے لگتی ہے۔ جبکہ آگے کے سطور میں اس 'میں' کے ذہنی کشمکش کو پڑھ کر دل عجیب طرح سے بے چین ہو جاتا ہے۔ کہ کیا سچ مچ وطن سے دوری انسان کو اپنے ہی گھر میں اجنبی بنا دیتی ہے۔ اور اپنوں کے برتاؤ میں بھی تصنع کی جھلک صاف نظر آنے لگتی ہے۔

ہجرت کا کرب شروع سے ہی ادیبوں اور فن کاروں کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ خود مصنّفہ نے بھی اس موضوع کو اپنی دوسری کہانیوں میں بھی پیش کیا ہے۔ لیکن پیشِ نگاہ کہانی ان سب میں الگ ہے۔ شروع

سے آخر تک ربط و تسلسل کی کیفیت برقرار رہتی ہے اور قدم، قدم پر رک کر کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے

یہ حالات جس سے اس کہانی کا ہیرو دوچار ہے آج کی تیز رفتار زندگی میں بھی یہی صورت حال ہے۔ انسان ہر جگہ خود کو غیر محفوظ سمجھنے پر مجبور ہے۔ خاص طور پر دوسرے ملک میں جا کر وہاں کی جادوئی دنیا میں کھو کر جب اس پر تنہائی کا احساس غالب ہوتا ہے تو جیسے کوئی چیز چھناکے کے ساتھ اس کے اندر ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اور وہ عجیب سی بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے۔ پاسپورٹ اور ویزا کی پابندی میں جکڑ کر اسے راہ فرار کی کوئی صورت بھی نظر نہیں آتی۔ اب ذرا اس کہانی کے میں سے اس کیفیات کی بھرپور ترجمانی ملاحظہ کیجیے:

''کبھی، کبھی وہ اپنے وجود کو پنڈولم کی طرح جھولتا محسوس کرتا، لامحدود فضاؤں میں معلق زمین سے منقطع اور آسمان سے دور.....'' یا الٰہی یہ کیسا جہاں ہے؟ باہر کی دنیا کیسی خوبصورت ہے لیکن اندر کی آتما کو چین نہیں..... یہاں تو ہر شخص بس اپنے 'آج' میں جی رہا ہے.....کیا کل کے اعتبار کے بغیر آج کا حسن برقرار رکھا جا سکتا ہے.....؟''

ہمارے عہد میں بے روزگاری اور بے کاری سے گھبرا کر نوجوان جس طرح دوسرے ملک میں جا کر پناہ ڈھونڈتے ہیں اور اچھے خاصے پیسے بھی کما لیتے ہیں.....کیا سچ مچ انہیں بعد میں یہ احساس ہوتا ہے کے زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے دولت نہیں اپنا پن ضروری ہے۔ کاش اس بات کو وہ پہلے محسوس کر لیتے لیکن ایک لمبے عرصے تک مشینی زندگی گذارنے کے بعد جب وہ یہ سوچتے ہیں کہ اب تو زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں تو یہ احساس ان کے لئے سوہانِ روح بن جاتا ہے۔ موصوفہ نے اپنے کردار کے ذریعہ اس بات کا واضح اظہار کیا ہے کہ ایک حساس شخص اس بے اعتباری کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتا۔ مشینی زندگی ہر لطیف احساس کو ختم کر دیتی ہے۔ قمر جہاں نے بڑی فنکاری سے اس جذبے کی عکاسی کی ہے۔ اپنی باتوں کو بے باکی سے کہنے کا ہنر انہیں خوب آتا ہے۔

''کیا زندگی صرف پیسے سے مطمئن ہو جاتی ہے.....؟'' باہر آ کر وہ بھی یقیناً اچھی غذا کھا رہا تھا، اچھی خاصی رقم جمع کر رہا تھا۔ فریج، ٹی وی، اے سی بہترین ائیر کنڈیشن کار، ویل فرنیشڈ مکان، سب کچھ کم ہی مدت میں اس نے حاصل کر لیا تھا۔ لیکن اکثر راتیں اس کی فوم کی آرام دہ مسہری پر کروٹیں بدلتے ہی گذر جاتیں..... جب بھی کبھی گھر سے اس کی ماں یا کسی اپنے پرائے کا خط آتا وہ ہفتوں تک مضمحل سا رہتا..... بوڑھے باپ کے انتقال کی خبر ملی تو وہ جی بھر کر رو بھی نہ سکا۔ ماں کی علالت کی اطلاع ملی مگر وہ صرف تڑپ کر رہ گیا۔''

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ قمر جہاں کہانی بیان کرنے کے فن سے اچھی طرح واقف ہیں۔ خاص

طور پر باطن میں ہونے والے ذہنی کشمکش کو بڑے دلکش بیانیہ انداز میں پیش کرتی ہیں۔ وہ اپنے عہد کی مورخ بھی ہیں اور اپنے عہد سے بہت آگے کا سفر طئے کرنے کا ہنر بھی جانتی ہیں۔ جب ہی تو تین دہائیوں کے بعد بھی یہ کہانی آج کے تناظر کی معلوم ہوتی ہے۔ جو اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ ان کا فن ارتقا پزیر ہے۔

بلا شبہ یہ کہانی ہمارے ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ موصوفہ نے مختلف موضوعات اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے جو اس بات کی شاہد ہیں کہ انہیں موضوع پر پوری گرفت حاصل ہے۔ خلیجی بحران اور دوسرے کئی بین الاقوامی مسائل پر بھی ان کی نگاہیں ہمیشہ طواف کرتی رہتی ہیں۔ بے شک ''کٹی ہوئی شاخ''، خلیجی بحران سے متعلق ایک اچھی کہانی ہے۔ جو اپنے قاری کو اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ موصوفہ ملک کے مسائل پر گہری نظر رکھتی ہیں اور اس کی پیش کش میں پوری طرح کامیاب بھی ہیں۔

پیشِ نگاہ کہانی کا آغاز دلکش ہے تو انجام بھی بالکل موزوں صورتِ حال پر ہوا ہے۔ یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ کہانی کا 'میں' وہیں کا وہیں کھڑا ہے جہاں سے اس نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ وہ اپنے گھر کی دہلیز پر دیر سے کھڑا بیتے لمحوں کو واپس بلانے کی کوشش کرتا ہے مگر اجنبیت کا احساس اس پر پوری طرح حاوی رہتا ہے۔ خود مصنفہ کے الفاظ میں:

> ''مگر اسے ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ گھر اب اس کا اپنا گھر نہیں رہا..... در و دیوار کی ساخت تو وہی ہے، آم کے پیڑ اور شرقے کے پیڑ بھی وہی ہیں مگر اس کے قدموں کے نیچے کی زمین بہتا پانی بن گئی ہے۔ سخت دھوپ سے گھبرا کر اُس نے نگاہیں اوپر کیں تو چھت کا سایہ بھی سر سے غائب تھا۔''

یہ مکالمہ دل کو چھو لینے والا ہے اور بڑل گہری معنویت کا حامل ہے۔ کہانی انہیں مکالموں کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے اور پڑھنے والا دیر تک یہ سوچتا رہتا ہے کہ وطن سے دور رہ کر در بدری کا یہ کرب ان سبھی انسانوں کا ہے جو اپنے وطن سے محبت کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ''کٹی ہوئی شاخ'' ایک ایسا افسانہ ہے جو زندگی کی ایک تلخ حقیقت یعنی ہجرت کے مسائل کو پیش کرتا ہے۔ تخلیقی اور تکنکی دونوں اعتبار سے یہ ایک کامیاب افسانہ ہے جو تین دہائی پہلے وجود میں آنے کے باوجود عصری حقائق اور نئے تناظر میں کھڑا اترتا دکھائی دیتا ہے۔ ایسا سچا افسانہ ہی شاہکار کا درجہ پا سکتا ہے۔

◂◂ ● ▸▸

Islamnagar, Bhgalpur-812001
7250069426

● محمد شارب

اکیسویں صدی میں اردو زبان و ادب کی اہمیت اور معنویت

زبان کا ارتقا انسانی خیالات و نظریات کے ارتقا پر منحصر ہے۔ زبان متعدد ارتقائی عمل سے گزرتی ہے۔ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں اس میں مسلسل تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ زبان کی فطرت میں تغیر ہے۔ زبان کے ارتقائی عمل میں سینکڑوں برس لگ جاتے ہیں۔ صوت، الفاظ اور قواعد کی شکل میں یہ تبدیلیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ بعض زبانیں ایسی ہیں جن کی رفتار دھیمی ہوتی ہیں۔ جب ایک قوم کے لوگوں سے دوسری قوم کے لوگوں کا سابقہ پڑتا ہے، جب ایک قبیلے کے لوگ دوسرے قبیلے سے رابطے قائم کرتے ہیں تو ان کی بولیاں، زبانیں اور ادب دوسروں کی زبان و ادب سے اثر پذیر ہوتی ہیں۔ متعدد قومیں مل کر کسی زبان و ادب کی پرورش کرتی ہیں۔ یہ کسی واحد قوم کا کارنامہ نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے ماہر لسانیات تغیر زبان و ادب کو ارتقا قرار دیتے ہیں۔ اسی ضمن میں پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں کہ:

> ''جب دو نسلوں کے لوگ آپس میں میل جول کرتے ہیں تو اس کے نتیجہ میں ایک نئی زبان پیدا ہوتی ہے۔ یہ نئی پیدا ہونے والی زبان اپنی سابقہ زبانوں سے زیادہ قوی اور مالدار ہوتی ہے۔ اس کی اچھی مثال انگریزی، فارسی اور اردو زبانیں ہیں۔''
>
> (زبان اور علم زبان)

ادب اپنے حقیقی معنوں میں کسی مذہب کا پابند نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی مقام میں مقید ہوتا ہے۔ ادب خواہ کسی مقام، زبان یا فکر سے منسوب ہو اگر واقعی ادب ہے تو اس کی اپیل آفاقی ہوگی۔ دنیا کی شاہکار ادبی تخلیقات اس کا بین ثبوت ہیں اور وہ بلا تفریق مذہب و ملت یا علاقہ و قومیت پوری انسانیت کا قیمتی ورثہ ہیں۔ ادب کی اس آفاقیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر ادبی تخلیق بہر حال کسی نہ کسی نظریہ کا مرہون منت ہے اور اپنے زمان و مکان سے گہرے طور پر متاثر ضرور ہوتا ہے۔ ادب کے ہمہ گیر اور تجزیاتی مطالعہ و تحقیق کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنی نظم و نثر کے علاقائی اور قدری فروغ و ارتقا پر گہری نظر رکھیں تا کہ مطالعہ ناقص اور غیر متوازن نہ ہو۔ لیکن تاریخی صداقت سے بھی کسی کو انکار نہیں کہ اردو زبان کی پیدائش اور

اس کے آغاز وارتقا میں دیگر عوامل کی طرح اسلام ایک اہم ترین عامل رہا ہے۔ اسلامی کلچر کے عناصر اربعہ صوفیا، علما و مجتہدین، تجار اور مجاہدین نے اپنی گراں قدر خدمات اور کارناموں سے اس برصغیر کو ہمہ جہت انداز میں متاثر کیا۔ بالخصوص اردو کی تشکیل اور فروغ وارتقا میں ان کے کارنامے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ بقول پروفیسر اعجاز حسین:

''جس وقت اردو کی تخلیق ہو رہی تھی ملک میں مذہبی فضا ہر شعبۂ زندگی پر حاوی تھی، سلطنت چاہے کسی کی رہی ہو مگر مذہب شہنشاہی کر رہا تھا ہر طبقہ اس کے آگے سر جھکائے تھا۔ چنانچہ شمال یا جنوب جہاں بھی اردو کی قدیم تصانیف یا تالیفات دستیاب ہوئیں وہ مذہب ہی کی آوردہ معلوم ہوتی ہیں۔''

(مذہب اور شاعری)

اکیسویں صدی کے تناظر میں ادب پر گفتگو کروں تو ضروری سمجھتا ہوں کہ ادب کی وضاحت اور اس کے جو مفہوم مختلف لغات میں بطور اصطلاح بیان کیے گئے ہیں ان پر ایک نظر ڈالوں۔ ادب انسان کے شعور کو بیدار کرنے، اشیاء کی حقیقت اور انسانی زندگی کے متعلق سوالات قائم کرنے اور ان کا حل تلاش کرنے کا اہل بناتا ہے۔ انسانی روح میں موجود اپنی اصل کی طرف لوٹنے کی شدید خواہش پیدا کرتا ہے۔ اس میں فطرت کی کئی صورتیں نمایاں ہیں جو خالق کائنات کے وجود کا احساس دلاتی ہیں۔ لیکن یہ مذہب کا بدل نہیں ہو سکتا، کیوں کہ انسان کو راہ نجات پر چلانا اور اخروی زندگی میں کامیابی سے ہمکنار کرانا مذہب کی رہنمائی کے بغیر ممکن نہیں۔ ذیل میں ادب کے معنی و مفہوم کو مختلف لغات میں کیسے پیش کیا گیا ہے اس کا جائزہ لیتے ہیں۔ منتخب اللغت میں ادب کے یہ معنی درج ہے:

''عمدہ طریقہ، لغت، عقل، ہر چیز کی حفاظت کرنا۔''

(منتخب اللغت، ص ۴۱)

فیروز اللغات میں الحاج مولوی فیروز الدین نے ادب کا مفہوم یہ درج کیا ہے:

ہر چیز کی حد کو نگاہ میں رکھنا، بزرگی یا عظمت کا پاس، تہذیب، تمیز، زبان کا سرمایہ، عروض، معانی اور بیان وغیرہ۔ (فیروز اللغات، ص ۷۷)

فرہنگ ادبیات کے مؤلف سلیم شہزاد لکھتے ہیں:

''ارسطو نے بوطیقا میں ادب کو زبان کے ذریعے نمائندگی کرنے والے ایک فن سے تعبیر کیا تھا جس کا کوئی کام نہیں۔ اسی سلسلے میں دوسرا قدیم خیال یہ تھا کہ علم و فن اور ہر قسم کی

تحریر ادب ہے۔ ادب میں اگرچہ علم کا معنوی پہلو موجود ہے لیکن تہذیب و تادیب کی مزید معنوی سطحوں کے تلازم میں یہ اصطلاحی فن کو بھی محصور کرتی ہے۔''

عابد حسین کا ماننا ہے کہ:

''ادب شاعر یا ادیب کے سوئے ہوئے خیالات کے سانچے میں ڈھل کر خود زندگی بن جاتا ہے۔''

دیوندر اسر کہتے ہیں:

''ادب میں انسان کے ہزار چہرے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے مختلف کبھی الجھتے ہوئے کبھی ہم آغوش ہوتے ہیں۔''

ممتاز حسین کا نظریہ ہے کہ:

''ادب کا تعلق براہ راست انسان کی زندگی سے ہے۔''

درج بالا اقوال کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادب میں زندگی کے مسائل پیش کیے جاتے ہیں۔ ادب کی سب سے زیادہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے عہد کے خیالات، حالات اور نتائج کو بہتر الفاظ میں حسن ترتیب کے ساتھ محفوظ کرے۔ دوسرے معنوں میں ادب اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں روزانہ بولی جانے والی زبان کے الفاظ اور خیالات بہتر انداز سے سمجھایا جائے۔ مثلاً کسی کے خیال میں ادب زندگی کا ترجمان ہے تو کسی کے الفاظ میں ادب زندگی کی ہو بہو عکاسی کا نام ہے، کوئی اسے زندگی کا آئینہ کہتا ہے تو بعض کے مطابق یہ سماج کا عکاس ہے۔ اصلاً ادب سے وہ تحریر مراد ہے جو قاری، سامع یا ناظر کے لیے ذہنی و فکری اصلاح اور نفس کے انبساط کا باعث بنے ''ادب'' ہے۔

اب میں اصل موضوع پر آتا ہوں جب سے اس کرۂ عرض پر انسان کی تخلیق ہوئی ہے تہذیب سے اس کا رشتہ لازم و ملزوم کا رہا ہے یعنی اسی سے اسے عروج نصیب ہوئی اور جب اس کی تہذیب مسخ ہوئی تو اس کی شناخت کا بھی خاتمہ یقینی ہو گیا۔ گویا کہ انسانی تہذیب اس روئے زمین پر عروج آدم خاکی کا سب سے اہم وسیلہ رہی ہے۔ ادب اسی تہذیب کے شکم کا ایک اہم عضو ہے۔ تہذیب نے نہ صرف ارتقاء کی منازل تک جانے کی راہیں ہموار کی ہیں بلکہ قدم بہ قدم انسان کی رہنمائی بھی کی ہے۔ انسانی ارتقاء کی داستانیں ہمیں تاریخ کے وسیلے سے موصول ہوئی ہیں۔ تاریخ کی اس شاہراہ پر انسانی فتوحات کی نشاندہی کرنے والے سنگ میل نصب ہیں، وہیں ترقی معکوس کی خبر دینے والی بڑی بڑی تختیاں بھی آویزاں ہیں۔ انسانی فتوحات، شکستوں اور اس کی لغزشوں کی پوری تفصیل تاریخ کے اوراق میں درج ہیں۔ انسانی سماج کی سرگرمیوں کو زمانی تواتر اور جغرافیائی

حوالوں کے ساتھ بیان کرنا تاریخ کا منصب ہے۔اس کے برعکس ادب افراد کے اندر موجود جہان رنگ و بو کا خبر نامہ ہے۔ یہ اس کے باطن کی دنیا سے ہمیں روشناس کراتا ہے، اس کے دل و دماغ کے نہاں خانوں کا سیاح ہے۔اس کی نفسیات کی گزرگاہوں کا مخبر ہے اور یہی ادب ہمیں اس عمل کے دوران انسانی زندگی، اس کی کاوشوں کی تاریخ اور یہ دنیا جہاں ہم رہتے ہیں، اس کے متعلق ہمیں باشعور اور زیادہ باخبر بناتا ہے۔علم کو انسان کی تیسری آنکھ کہا گیا ہے۔ادب عالم امکاں کی زمیں پر پڑنے والا تمنا کا دوسرا قدم ہے۔

ادب محسوسات کی دنیا میں سیاحی کا نام ہے اور یہ سفر انسان کی ذات سے اس کائنات تک پھیلا ہوا ہے۔ ادب ایک آفاقی حقیقت ہے۔اعلیٰ ادب کی ایک خوبی یہ بیان کی جاتی ہے کہ زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ادب سماج کا آئینہ ہے۔ادب میں فرد کی ذات کی عکاسی ہو یا فن کار کے ذریعے اظہار ذات کا عمل۔ اس حوالے سے ادب فرد کے ذات کا بھی آئینہ ہے۔انفرادی اور اجتماعی زندگی کی نمائندگی ادب کی معنویت اور اہمیت کا اہم ثبوت ہے۔اب یہ سوال ذہن میں عود کر آتا ہے کہ ادب کیا ہے؟ اس کی غرض و غایت کیا ہے اور اسے کیسا ہونا چاہیے؟ اس صدی میں ادب کی کیا معنویت ہے؟ ان تمام سوالات کے جوابات آگے آرہے ہیں۔ادب کے وجود کو سمجھنے، اسے تسلیم کرنے اور بعض اوقات اسے اپنے مخصوص مفادات میں استعمال کرنے کے لیے، موجودہ صدی کے حالات یہ بتاتے ہیں کہ اب تو ادب کے وجود پر بھی سوالیہ نشان لگنے لگے ہیں۔

اکیسویں صدی کی دو دہائیاں گزر چکی ہیں۔گزشتہ صدیوں کے دوران سائنس کی ترقی نے جس معاشرہ اور شعور کو جنم دیا ہے اس میں ماضی کی ترقی ہی اصل ترقی ہے اور اسی کی تگ و دو اور اس کی حصول کو انسانی کامیابی کے لیے معیار مانا گیا ہے۔آج جس دنیا میں ہم جی رہے ہیں اس میں روحانی قدریں ایمان، اخلاق، انسانیت، ایثار اور خدا ترسی کے جذبات و احساسات کو وہ قوت حاصل نہیں جو صدیوں پہلے تھی۔ وقت کے ساتھ نئے پیمانے اور نئے معیار سامنے آرہے ہیں جن میں پرانی اشیاء اپنے معانی سے محروم ہوتی جارہی ہیں۔یہ عمل اس قدر سفاکانہ ہے کہ ہمارے نام نہاد تعلیمی اور مذہبی ادارے اور شخصیات بھی اس آندھی سے محفوظ نہیں۔بقول مخمور سعیدی:

ایک اجنبی دنیا اب جینا مقدر ہو گیا　　مانوس تھی جس سے نظر، دھندلا وہ منظر ہو گیا
روک سکتے تھے بھلا کب تک زمام وقت کو　　بگڑا نظام روز و شب ہر لمحہ خودسر ہو گیا

بغیر ادب کے انسانی زندگی کا تصور بے معنی ہے۔ادب انسان کا ایک ناگزیر حصہ ہے جس کا تعلق اس کی اندرونی اور روحانی دنیا سے ہے۔سائنس تو اس دنیا کو تسلیم کرنے سے رہی، مناظروں کی حد تک سمجھا بھی دیا جائے تو صدیوں کی صنعتی ترقی نے اس مذہب بیزار معاشرہ کو جنم دیا ہے۔اور اس میں جس قسم کی

زندگی کو وقت کی ضرورت قرار دیا گیا ہے اس میں ادب جیسی چیزوں کے لیے بظاہر کوئی خاص جگہ نہیں۔ یہ صرف مسلمانوں ہی کا مسئلہ نہیں دیگر زبانوں کے ارباب فکر بھی اسی مسئلے سے دوچار ہیں۔وہاں کی تہذیبی شناخت اور زبان پر خوفناک سایہ منڈلا رہا ہے اس نے انہیں فکرمند بنا دیا ہے۔لیکن ہمیں اپنی زبان و ادب کے متعلق بحث و مباحث مقصود ہے۔ابھی چند سال قبل ہی ہمارے یہاں (جھارکھنڈ) غالباً ۲۰۱۶ء میں جب ہائی اسکول اور انٹر کالج میں اردو اساتذہ کی آسامیاں آئیں تھیں تو اس میں صرف ٹی۔جی۔ٹی (ہائی اسکول) میں کل ۴۴۸ آسامیاں ریاستی حکومت نے نکالی تھی جو اردو آبادی کے لحاظ سے ناکافی تھی۔اس ضمن میں حکومت کو غلط معلومات فراہم کرائی گئی تھی کہ اردو بچوں کی تعداد اسکولوں میں کم ہے جب کہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔اور یہ سب سوچی سمجھی منظم سازش کے تحت انجام پا رہا تھا جو حکومت کا یہ فعل بے حد خطرناک تھا۔سارے کاغذات جھوٹی خبروں اور دلائل کی بنیاد پر تیار لیے گئے۔نتیجتاً آبادی کے لحاظ سے سنسکرت زبان نے اردو زبان پر سبقت حاصل کر لی۔بقول حفیظ میرٹھی:

عجیب لوگ ہیں کیا خوب منصفی کی ہے　　ہمارے قتل کو کہتے ہیں، خودکشی کی ہے

اس بحالی میں تقریباً ۳۰ فیصد سیٹیں ایس۔سی، ایس۔ٹی کے لیے محفوظ کر دی گئیں جو اب تک خالی ہیں جب کہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اگر مسلسل تین بار اگر کسی مضمون میں کوئی درخواست نہیں آتی ہے تو اسے جنرل سیٹ سے پر کر دینی چاہیے لیکن ہمارے رہنمایانِ اردو خواب غفلت میں پڑے رہے، نتیجتاً وہ سیٹیں خالی ہی رہیں اور اردو زبان لے کر پڑھنے والے بچے مزید اردو اساتذہ سے محروم رہے۔چہ جائکہ ۸۵-۸۰ کے قریب پی۔آر۔ٹی والوں کے لیے مختص کر دی گئیں۔جب کہ پی۔جی۔ٹی (انٹر کالج) میں ایک بھی سیٹ مختص نہیں تھی لیکن کیا ہوا؟ نام نہاد محبان اردو جنہیں ہم منافقان اردو سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں نے کوئی اقدام نہیں کیا۔ایسے موقعے پر سبھی اردو پروفیسران، لیڈران اور اساتذۂ اردو گرم لحاف میں نیند کے مزے لیتے رہے۔تبھی ہم پر یہ عقدہ کھلا کہ ہمارے ادارے اور رہنما خواب خرگوش میں کھوئے ہوئے ہیں اور ان کے بچے سائنس اور ٹکنالوجی کی پڑھائی دہلی، ممبئی اور بنگلور جا کر پڑھ رہے ہیں، اردو زبان کی آبیاری اور اس کے فروغ میں یہ کیوں کر حصہ لیں۔ہاں البتہ اتنا ضرور تھا کہ اس سلسلے سے جو ہلکا پھلکا احتجاج ہوا انہیں کی جانب سے ہوا جنہیں کوئی اردو ادب میں جانتا تک نہیں، یوں بھی ہمارے یہاں اردو کے اکثر تعلیمی اداروں میں زبان و ادب کے تحفظ کا مسئلہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔وہ شاید زبان کو مٹتی ہوئی اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے خواہاں ہیں۔لیکن شاید وہ اس بات کو بھول رہے ہیں کہ کسی زبان کا ختم ہونا اس کی تہذیب کا مٹنا ہے جس کی زد میں ان کی بھی نسلیں آج نہیں تو کل ضرور آئیں گی۔کم و بیش یہی صورتحال ریاست بہار کی بھی

ہے جہاں حالیہ اردو لکچرر کی ایک سو آسامیاں آئیں ہیں جن میں ایس۔سی ، ایس۔ٹی والوں کے لیے غالباً ۴۰-۳۸ سیٹیں مختص کی گئیں ہیں جو کہ امیدوار نہ ہونے کی وجہ کر بیش تر خالی ہی رہیں گی جو کسی المیے سے کم نہیں لیکن ہمارے لیڈران، نام نہاد اردو کے محافظ برادران کی جانب سے اس پر کوئی ردعمل نہیں آیا۔ اگر ہمارے رہنما اس پر توجہ نہیں فرمائیں گے تو مستقبل میں اس کے منفی نتائج سے روبرو ہونا پڑے گا۔ اگر ہماری زبان ہی معدوم ہو جائے گی تو ہم اپنے خیالات کا اظہار بھلا کس طرح کریں گے؟ اگر ہماری زبان پہ کوئی آنچ آتی ہے تو ہماری تہذیبی شناخت مجروح ہوتی ہے، ہمارے احساسات، خیالات و ارادے سبھی متاثر ہوتے ہیں۔ زبان وادب کے سلسلے سے ڈاکٹر محی الدین قادری زور رقمچھ یوں قمطراز ہیں:

''پس زبان کی واضح تعریف ان لفظوں میں کی جاسکتی ہے کہ زبان انسانی خیالات اور احساسات کی پیدا کی ہوئی ان تمام عضو اور جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا نام ہے جن میں زیادہ تر قوت گویائی شامل ہے اور جن کو ایک دوسرا انسان سمجھ سکتا ہے اور جس وقت چاہے اپنے ارادے سے دہرا سکتا ہے۔''

(ہندوستانی لسانیات، ص ۲۶)

ہم تو اپنے ذاتی مفاد کے بغیر جوٹھے ہاتھ سے مکھی تک نہیں اڑا سکتے۔ اردو زبان وادب کی تبلیغ و اشاعت کے لیے اتنا بڑا عزم بھلا کون لے کر چلے؟ اور جو لوگ زبان وادب کے تحفظ کے ڈھکوسلے کرتے ہیں وہ جلسہ و مشاعرے کی محفلیں سجانے میں ہی اپنی ناموری اور زبان اردو کی بہتری سمجھتے ہیں جو ریاکاری اور منافقت کے سوا کچھ نہیں۔ ان سے زبان وادب کی حفاظت کی خاطر اقدام کی امید کرنا بے معنی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم نوجوان نسل اپنی زبان و ادب کی بقا اور اس کی ترقی کے لیے آگے آئیں، احتجاج کریں، قربانیاں دیں اور حکومت وقت کے سامنے سنجیدگی سے اپنے مطالبے رکھیں۔ کسی بھی زبان وادب کے ارتقا کی کہانی قوم وملت کی تہذیب وثقافت کے عروج سے وابستہ ہوا کرتی ہے۔ اس کی نشو ونما فوراً نہیں ہوتی ہے، خاص لمحہ یا خاص وقت میں نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کے لیے جہد مسلسل، سماجی میل ملاپ اور سب سے بڑی قومی وملی اتحاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ یقین مانیے وہ دن دور نہیں جب اس ریاست میں بھی اردو کی کھیتی لہلہائے گی اور اس کی فصلیں ہماری نسلیں کاٹیں گی۔ تبھی جا کر ہماری تہذیب کی بقا کی حفاظت ہوسکتی ہے اگر تہذیب محفوظ ہوتی ہے تو زبان وادب کی حفاظت بھی یقینی ہوسکتی ہے، بقول ساغر صدیقی:

اگرچہ ہم جا رہے ہیں محفل سے نالۂ دل فگار بن کر مگر یقیں ہے کہ لوٹ آئیں گے نغمۂ نو بہار بن کر

اسی پس منظر میں ''ہندوستانی لسانیات کا خاکہ'' (از جان بیمز) کا ترجمہ پیش کرتے ہوئے

سید احتشام حسین مقدمے میں اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

''یہ بتانا تو بہت مشکل ہے کہ زبان کسے کہتے ہیں لیکن سمجھنے کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ زبان آوازوں کے ایک ایسے مجموعہ کا نام ہے جسے انسان اپنا خیال دوسروں پر ظاہر کرنے کے لیے ارادتاً نکالتا ہے اور ان آوازوں کے معنی معین کر لیے گئے ہیں۔ تاکہ کہنے اور سننے والے کے یہاں تقریباً ایک ہی جذبہ پیدا ہو۔ الفاظ ان ذہنی تصویروں کی ملفوظی علامتیں ہیں جنہیں ہم دوسروں کے ذہن تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ اس طرح زبان ایک بڑا پیچیدہ موضوع بن جاتی ہے۔''

(ہندوستانی لسانیات کا خاکہ، ص ۲۶)

زمانۂ قدیم میں آگ کی ایجاد ایک بڑی ایجاد سمجھی جاتی تھی لیکن اس سے بھی بڑی ایجاد زبان کی تخلیق ہے۔ زبان کی حد تک اگر ہم جائزہ لیں تو یہ ایسا علم ہے جس میں لسانیات کے مسائل بیان کیے جاتے ہیں۔ اس سے زبان کی ماہیت، تشکیل، ارتقا، زندگی کا خاتمہ کے متعلق آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ لسان خیالات کا ذریعۂ اظہار ہے۔ بات چیت کرنے اور اپنے احساسات وخیالات کو دوسروں تک پہنچانے کے لفظی وسیلے کو بھی زبان کہا جاتا ہے۔ قادر مطلق کی جانب سے نوع انسان کو قوت گویائی حاصل ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو 'حیوان ناطق' کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ بول سکتا ہے۔ کھل کر اپنے جذبات، احساسات اور خیالات کا اظہار کر سکتا ہے۔ جب سے انسان نے اس دنیائے آب وگل میں آنکھ کھولی ہے اس زمانۂ قدیم سے زبان کا بول بالا ہے۔ جس چیز نے آدمی کو حیوانیت کی پستی سے اٹھا کر انسانیت کی بلندی پر لا کھڑا کیا۔ اس کے اظہار کا ذریعہ زبان کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ زبان اور انسانی افکار کا تعلق چولی دامن کا ساتھ ہے۔ زبان علم لسانیات کی اصطلاح میں ملفوظ آوازیں ہیں جو انسان اپنے منہ سے قصداً ادا کرتا ہے اور اس کے ذریعہ وہ اپنے مافی الضمیر کو دوسروں پر ظاہر کرتا ہے۔ انسان ان آوازوں کو جب ہم حروف کی مدد سے قلمبند کر دیتے ہیں تو ایسی قلمبند کی ہوئی تحریروں کو زبان کہتے ہیں۔ اور اردو کے تعلیمی اداروں میں جھانکیں تو انکشاف ہوگا کہ ہم اپنے تعلیمی اداروں میں بچوں کو اس لیے بھیجتے ہیں کہ وہ مغرب کی بے دینی اور بے ہودگیوں سے بچیں، اسلامی ذہنیت ان کے اندر پیدا ہو، وہ اردو زبان وادب سے آشنا ہو کر اس میں موجود اسلامی خیالات اور اخلاقی نظام کو اختیار کریں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہماری زبان، ادب اور تہذیبی اقدار کے لیے خود ہمارے ادارے سے زیادہ خطرناک کوئی ادارہ نہیں، استثنائی صورتحال ہر جگہ موجود ہے اور اب اسی کے سہارے اس زبان وتہذیب کی رگوں میں تازہ لہو اس کی زندگی کا ضامن ہے۔ کاروبار کی برکات نے تعلیمی اداروں کو نہیں بخشا۔ اکثر ایسے اداروں میں ارباب اقتدار ایک منافقانہ ذہنیت کے ساتھ اپنے مفادات حاصل کرنے کے لیے قوم و مذہب کے ہمدرد بن کر جمع ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں بیش تر اساتذہ اور مجلس

انتظامیہ کی مسند پر کنڈلی جمائے لوگ اس چولے کو اتار پھینکنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں، جسے ہم اسلامی تہذیب کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ بات نیم انگلش کی ہو، انگریزی میڈیم اسکول کھولنے کی پیش کش ہو تو ہم اسے فوراً قبول کر لیتے ہیں۔ مگر وہیں دینی وعصری ادارے کے کھولنے کی بات ہوتی ہے تو اپنی بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بچے کسی طرح مغربی اطوار کی تقلید کرنا شروع کر دیتے ہیں تو یہی والدین انہیں فخر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں جس کا دوسرا پہلو تاریکیوں سے اٹا ہوا ہے۔ بقول اکبرالہ آبادی:

نئی تہذیب سے ساقی نے ایسی گرمجوشی کی کہ آخر مسلموں میں روح پھونکی بادہ نوشی کی

کس کی مجال ہے جو اس کے خلاف لب کشائی کر کے اپنے آپ کو دقیانوسی ثابت کرے لیکن اس درمیان ہماری زبان، ہمارا مذہب اور تہذیب اس کے دفاع کے لیے کتنے قدم اٹھتے ہیں۔ یقیناً وہ ادارے لائق تحسین ہیں جو انگریزی میڈیم اسکولیں چلانے کے باوجود جلب منفعت کے حریص اور مخلصانہ طور پر قومی خدمت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں اور اس قسم کی اسکولیں اسلامی تہذیب کا قلعہ ثابت ہو رہے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد نمک میں آٹے کے مصداق ہیں۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں زبان وادب کی زبوں حالی ایک خطرے کی گھنٹی ہے جو اکیسویں صدی کی ابتدا ہی میں بجنے لگی ہے بلکہ بہت پہلے سے بج رہی ہے۔ ابھی تو دلی دور ہے یہ سب اس لیے ہو رہا ہے کہ ادب کا کیا ذکر ہے ہمارے لیے ہماری زبان بھی اب بے معنی ہوتی جا رہی ہے۔

ادب تو اب بیش تر وہ لوگ بھی نہیں پڑھتے جو ادبیات میں ایم۔اے، بی۔اے کی ڈگری حاصل کرتے ہیں، کیونکہ نوٹس اور شرح پڑھکر آپ ایم۔اے کا امتحان پاس کر سکتے ہیں اور کچھ رقم خرچ کر کے کسی بھی ادبی موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کر سکتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کی ڈگری کو حاصل کرنے کا گورکھ دھندا برسوں سے چل رہا ہے جو عصر حاضر میں بھی بدستور جاری ہے۔ اصل میں جو لوگ اس غلط کارئیوں میں لگے ہوئے ہیں وہ ادب کے اعلیٰ معیار کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ میری نظر میں یہ بھی ادب کے بہت بڑے دشمن ہی ہیں جو غلط رواج کو فروغ دینے میں اپنی شان سمجھتے ہیں۔ یہ سب اسی لیے ہو رہا ہے کہ جس تجارتی ذہنیت کے مارے دنیا میں سانس لے رہے ہیں، وہاں ادب ایک لغو اور بے معنی سی چیز لگنے لگی ہے۔ جیسے جیسے کمرشیلزم زندگی کے سبھی شعبوں میں سیلاب کے پانی کی طرح داخل ہوتا جائے گا، اسی رفتار سے ادب جیسی چیزیں اپنی معنویت سے خالی ہوتی جائیں گی۔ یہ ہماری زندگی کی ایک تلخ حقیقت ہے اور بہت بڑا عیب بھی۔ ان قدروں کے پیروں تلے سے زمین کھسک رہی ہے۔

اس اکیسویں صدی میں ادب کی معنویت میں کافی تغیرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس کے باوجود اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ مذہب اور ادب اکیسویں صدی کے انسان کی بڑی ضروریات میں شامل ہیں۔ زبان وادب کے ذریعہ انسانیت اور تہذیب کو بیدار کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے اور یہی ادب کی

معنویت ہے۔ یہ سماج جو انسان کو الکٹرونک آدمی بنانے پر آمادہ ہے، جہاں بقول اقبال، ''مشینوں کی زندگی انسان کے دل کی موت ہے۔ جہاں مادی ترقی کی شاہ راہ پر دوڑتے ہوئے انسان کے لیے انسان بن کر زندہ رہنا مشکل ہو گیا ہے۔ جہاں جسمانی ضروریات نے انسانوں کو اپنے اندرون کی دنیا سے بے نیاز کر دیا ہے''۔ اس دنیا میں انسان کو بحیثیت انسان بن کر جینے کے لیے ادب کی ضرورت ہے۔ یہی ادب کی معنویت ہے۔ ادب انسان کو اس کے اندرون کے تقاضوں سے باخبر کرتا ہے۔ انسان ادب کے ذریعہ نہ صرف اپنے دکھوں کو سمجھتا ہے بلکہ دوسروں کے دکھوں کو محسوس کر کے اس کا شریک غم بھی بن جاتا ہے۔ ادب انسانیت کی جملہ قدروں کے ساتھ جینے کا سلیقہ عطا کرتا ہے۔ ادب ہمارے جذبات کی بحر کی موجوں میں اضطراب پیدا کر کے اس طوفان سے آشنا کرتا ہے جو ہمیں نہ صرف خود فراموشی سے بلکہ خدا فراموشی کی کیفیت سے بھی باہر لا کر ایک بھرپور زندگی گزارنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ ہمیں معیاری ادب کی تخلیق پر زیادہ توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت کیوں کہ ادب تخلیق کرنا ہی سب سے بنیادی چیز اور اس کے بعد اس کی اشاعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک معیاری ادب جب منظر عام پر آئے گا تو اس کے مثبت نتائج واثرات ہماری روزمرہ کی زندگی پر بھی مرتب ہونگے۔ جس کے باعث انقلابی رجحانات دیکھنے کو ملیں گے کیوں کہ معیاری ادب انسان کو سنجیدہ بناتا ہے، تمیز عطا کرتا ہے اور سوچنے سمجھنے کا شعور دیتا ہے، تبھی تو بقول اکبرالہ آبادی:

بنوگے خسرو اقلیم دل شیریں بیاں ہو کر جہانگیری کرے گی یہ ادا نورِ جہاں ہو کر

تہذتب کی روح زبان ہوتی ہے اور زبان کا آئینہ ادب ہوتا ہے۔ تنقید نے ادب کو مشوروں سے، ہدایات سے نوازا اور اس کے نام فرمان بھی جاری کیے۔ اس بات سے قطع نظر کہ ادب نے ان آوازوں پر کس حد تک کان دھرے ادب سماج کے اثرات سے بچ نہیں پایا۔ انسانی فکر کی ترجمانی کا ذریعہ زبان ہی ہوتی ہے۔ جہاں زبان اور الفاظ کے ذریعہ افکار و خیالات کی ترجمانی ممکن نہیں ہوتی ہے تو اشارے، نقوش، تحریر، پینٹنگ اور خاکوں وغیرہ سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ تمام چیزیں زبان کا درجہ رکھتی ہیں۔ زبان کوئی ماہر لسانیات ایجاد نہیں کرتا ہے۔ کسی بھی زبان کے ارتقا کی کہانی قوم وملت کی تہذیب وثقافت کے عروج سے وابستہ ہوا کرتی ہے۔ گزشتہ صدیوں کے دوران سائنس کی ترقی نے انسانی زندگی کا چہرہ مہرہ بدل کر رکھ دیا۔ ادب چوں کہ انسانی زندگی کی نمائندگی کے منصب پر فائز تھا۔ صدیوں کے اس بہیمانہ طلسم اور وقت کے گرد وغبار سے اس کا چہرہ آلودہ نہ ہو، یہ کیسے ممکن تھا؟ یہ سماجی اثرات اس قدر شدید تھے کہ اٹھارویں صدی میں مذہب کی موت کا اعلان کیا گیا اور انیسویں صدی میں ادب کے جاں بحق ہونے کی کی اطلاع دی گئی۔ لیکن یہ دونوں اتنے سخت جاں نکلے کے اب بھی بقیدِ حیات ہیں اور اس کے شواہد عام زندگی میں قدم قدم پر موجود ہیں۔ بیسویں

صدی میں سائنس کی بے پناہ ترقی کے دوران توہم پرستی اور غیر حقیقی مظاہر کے رد کے لیے مشہور ہے۔ مگر اسی صدی کے دوران محیر العقول واقعات، جادو اور تخیل آرائی پر مبنی ناول، ہیری پاتر، اس صدی کا بیسٹ سیلر ثابت ہوا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ادب اپنی تمام تر اہمیت اور افادیت کے باوجود مذہب کا بدل ثابت نہیں ہوسکتا۔

ادب میں بھی اخلاقی قدریں مذہب ہی کا فیضان ہے۔ شاعر یا ادیب انسانوں کے لیے نجات دہندہ ثابت نہیں ہوسکتا اگر چہ مذہب کی روح تک پہنچنے والے راستے ادب کے ذریعے ہموار ہوسکتے ہیں۔ ادب اور شاعر انسانوں کے لیے مکمل ہدایت کا سامان مہیا کرنے سے رہے، یہ منصب انبیاء اور پیغمبروں کا ہے۔ ادب کتاب ہدایت نہیں ہے۔ ہدایت کا سرچشمہ تو کلام ربانی ہے۔ پھر ادب کی معنویت کیا ہے؟ کلام ربانی میں ادب کی بیشمار خوبیاں موجود ہیں۔ اس عظیم کتاب کی لطافتوں اور گہرائیوں کو کماحقہٗ سمجھنے کے لیے ادب کی مدد حاصل کی جاسکتی ہے۔ اگر ادب نہ ہوگا تو انسان دین کی آفاقیت اور عظمت کو سمجھنے سے قاصر ہوگا۔ ادب نہ ہوگا تو شدت پسندی کو فروغ حاصل ہوگا۔ دین کے نام پر آج چند نا سمجھ مذہبی لوگوں میں مذہبی تعصب، شدت پسندی، مسلکی اور گروہی عصبیت اور تشدد کی لہر اٹھی ہے۔ یہ سب مذہب کے اصل پیغام سے ناواقفیت کے سبب ہے۔ ادب اس شدت پسندی سے بچاؤ ثابت ہوسکتا ہے کہ ادب گر چہ اسی مذہبی تعلیمات کے زیر اثر صحیح، جس اخلاقی نظام کی طرف ہمیں لے جاتا ہے اس کا حاصل محبت، انسانیت نوازی، بھائی چارگی، عالمی اتحاد اور خدا ترسی ہے۔ اس لیے مدارس میں ادب کی تعلیم دی جاتی ہے تا کہ طالب علم مذہب کے اصل روح تک رسائی حاصل کر سکے، وہ مذہب جو آپس میں بیر رکھنا نہیں سکھاتا بلکہ اہل سیاست کی فریب کاریوں کی جال سے آزاد کر کے انسانوں کے ساتھ محبت کی زندگی گزارنے کا پیغام دیتا ہے۔ اور یہی زبان وادب کی معنویت ہے جو اکیسویں صدی میں بے معنویت کی طرف دوڑتی ہوئی زندگی کے لیے آب حیات ثابت ہوسکتی ہے۔ ہمیں ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنی زبان وادب کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیں اور اس کی اشاعت وترویج میں ہمیشہ کوشاں رہیں۔ اس بات کو ہمیں اپنے ذہن میں ہمیشہ ملحوظ رکھنی چاہیے کہ اگر ہم اپنی زبان وادب کے تئیں بیدار ومحتاط نہیں رہے تو ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ ہماری تہذیبی شناخت اس صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گی جس کے خاتمے کے ذمہ دار خود ہم ہی ہوں گے۔ اس کے فروغ کے لیے انفرادی واجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہے اور اس کی آبیاری کے لیے بالخصوص ان حضرات کو عملی طور پر اس کام کو انجام دینا ہوگا جو اردو کی کھاتے اور کماتے ہیں۔

◂◂ ● ▸▸

UHS,Tendua,Hariharganj,
Palamu,822131,Jharkhand
9835938234

● ڈاکٹر قسیم اختر

''جانے پہچانے لوگ'' کا تنقیدی چہرہ

معاصر تنقید میں ڈاکٹر صفدر امام قادری کی تنقید مختلف خصوصیات کی بنیاد پر منفرد نظر آتی ہے۔ کیوں کہ وہ متن سے الجھتے ہیں اور معانی ومفہوم متعین کرتے ہیں۔ کسی فن پارے پر لکھے گئے مضامین کی روشنی میں وہ کوئی مضمون تیار کر کے اپنی تنقیدی انفرادیت ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کے خاکوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ شخصیات کو اپنی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ان کے اندرون میں اترتے ہیں اور وہاں سے مواد حاصل کر کے قلمی تصویر بناتے ہیں۔ اس لیے ان کے خاکے بھی موجودہ خاکہ نگاروں سے الگ نوعیت رکھتے ہیں۔ صفدر امام قادری نہ افسانوی رنگ خاکے لکھتے ہیں اور نہ افسانوی اختصار سے سروکار رکھتے ہیں۔ ان کے اکثر خاکے طویل ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے طویل خاکوں میں بہت کچھ پیش کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خاکوں میں تاثراتی رنگ بھی ابھرتا ہے اور سوانحی انداز بھی۔ تنقیدی سروکار بھی نظر آتا ہے اور تاثراتی احساس بھی۔

پیش نظر کتاب ''جانے پہچانے لوگ'' میں کل سوا در جن خاکہ نما مضامین ہیں۔ ان مضامین میں لطیف رشتہ یہ ہے کہ یہ تمام کے تمام مضامین فوت شدہ لوگوں پر لکھے گئے ہیں۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دیگر خاکہ نگاروں کی طرح انھوں نے فرمائش پر خاکے نہیں لکھے۔ فرمائشی تبصروں اور خاکوں کی حیثیت کیا ہوسکتی ہے، ذرا بھی غور وخوض کرنے والا بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔ صفدر امام تنقید کے لیے کتابوں کا انتخاب اپنی صواب دید پر کرتے ہیں۔ اس لیے خاکوں کے لیے شخصیات کا انتخاب بھی آزادانہ طور پر کرتے ہیں۔ اگر وہ فرمائشی خاکے لکھتے تو باحیات لوگوں کے خاکے اس مجموعے میں زیادہ ہوتے۔ انھوں نے اس روایت سے بغاوت کی ہے اور فقط ان لوگوں پر ہی لکھا ہے جن سے انھوں نے کچھ نہ کچھ سیکھا ہو اور ان شخصیات کی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو نے خاکہ نگار کو متاثر کیا ہو۔

اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ صفدر امام قادری کے تاثراتی مضامین کا رنگ یکساں نہیں ہے۔ گویا انھوں نے لکھنے کے لیے کوئی طے شدہ فارمولہ نہیں اپنایا جس شخصیت کی زندگی کے جس پہلو نے

انھیں متاثر کیا اسی پہلو کو پیش کر دیا ہے۔ ظاہر ہے ان پہلوؤں کو پیش کرنا اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب خاکہ نگار نے خاکے کی متعلقہ شخصیات کو گہری نظروں سے دیکھا ہو اور متعدد مواقع پر انھیں محسوس کیا ہو۔ صفدر امام قادری کے خاکوں میں گہرے تاثرات کے رویے بہت واضح ہیں۔ اپنے والد سے متعلق لکھتے ہیں:

''ہمارعلاقہ بھوج پوری بولنے والوں پر مشتمل ہے مگر والد صاحب گھر اور باہر دونوں جگہ اردو زبان کا استعمال کرتے تھے۔ کبھی کبھی کسی موکل یا اسی طرح کے کم پڑھے لکھے آدمی سے وہ بھوج پوری میں بات کرتے تھے مگر بیش از بیش سماجی زندگی میں وہ اردو بولتے تھے اور وکالت میں انگریزی زبان۔ جب ان کی تعلیم کا زمانہ تھا، اس وقت ہندی سے آشنائی نہیں ہوئی تھی۔ انگریزی میڈیم میں ہی وہ چوتھی جماعت سے لگ گئے تھے۔ ہندی انھوں نے کچھ ادیبوں اور شاعروں کے بیچ اور وقت کے بدلتے ہوئے رویوں سے متاثر ہوکر پڑھنے کی حد تک سیکھ لی تھی''۔

مذکورہ اقتباس سے کئی باتیں واضح ہوتی ہیں۔ صفدر امام قادری نے شخصیت کی شکل و شباہت کے بیان سے سروکار نہیں رکھا، بلکہ طرز زندگی کے بہت سے امور کی طرف اشارے کر دیے۔ اس کے علاوہ ان کی زبان کی سادگی ہمیں متاثر کرتی ہے کہ اپنے بیانیہ کو اجنبی پن اور ثقالت سے محفوظ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زبان کی ثقالت مسئلہ پیدا کرتی ہے اور نہ ہی غیر مانوس فقرہ ترسیل میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹے اقتباس کو انتہائی معلوم افزا بنا دیا۔ اول بھوج پوری بولنے والے علاقے کا جغرافیا ابھر کر سامنے آتا ہے۔ خاکہ نگار کے گھر میں اردو کے چلن کا پہلو واضح ہوتا ہے۔ ساتھ ہی خاکے کی متعلقہ شخصیت کا پیشہ بھی ابھرتا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو ایک چھوٹے سے اقتباس میں صفدر امام قادری نے متعدد پہلوؤں کی وضاحت کر دی ہے۔ اس لیے یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ صفدر امام لفظوں سے قلمی تصویر بنانے کے ساتھ شخصیات کی زندگی کے دیگر واقعات پیش کر کے اپنی تحریروں کو انفارمیٹو بنا دیتے ہیں۔ مشہور افسانہ نگار شفیع جاوید کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

''شفیع جاوید ایک خاص رکھ رکھاو کے آدمی تھے۔ جن لوگوں کو اُن سے ملنے اور ان کے گھر آنے جانے کے مواقع ملے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ہر کام میں وہ سخت انتخاب اور مخصوص قرینے کے قائل تھے۔ خوش پوش تو تھے ہی، اپنے گھر کو بھی اسی طرح سجا سنوار کر انھوں نے رکھا تھا۔''

شفیع جاوید سے ملنے والے تو ان کی عادات کو اچھی طرح جانتے ہوں گے مگر جن کو ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا ہے وہ بھی انھیں مذکورہ چند جملوں سے پہچاننے لگ جاتے ہیں۔ کیوں کہ صفدر امام قادری نے شفیع

جاوید کی عادت اور نفاست کا خوب تذکرہ کر دیا ہے۔ خاکہ دراصل شخصیات کی عادات وطوار اور حسن اخلاق کا ایک اشاریہ ہوتا ہے۔ خاکہ نگار کا بنیادی کام یہ ہے کہ زندگی کے بہت سے پہلوؤں کی بس جھلکیاں پیش کر دے۔ تفصیلات سے گریز کرے، تفصیلات کے لیے سوانحی مضمون کی ضرورت ہوتی ہے۔ صفدر امام قادری نے شفیع جاوید کے خاکوں میں جہاں ان کی شفقت کو پیش کیا، وہیں ان کی افسانوی خصوصیات کو بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس خاکے میں شفیع جاوید کی زندگی کے متعدد پہلو ابھرتے ہیں۔ شفیع جاوید کے مطالعہ کا انداز بھی جداگانہ تھا۔ کیوں کہ وہ برسوں ایک کتاب کا مطالعہ کرتے تھے۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے۔ بیک وقت کئی کتابوں سے استفادہ کرتے تھے اور ان کتابوں کا آہستہ آہستہ مطالعہ کرتے تھے۔ اس طرح ایک کتاب ختم ہونے میں خاصا وقت لگتا تھا۔ شفیع جاوید کی زندگی کے ان تمام تر جزئیات کا بیان صفدر امام قادری نے بہترین طریقے سے کیا۔

صفدر امام قادری نے پروفیسر وہاب اشرفی کا جو خاکہ لکھا وہ بھی بہت خوب ہے۔ کیوں کہ اس میں جہاں اشرفی کی ذاتی زندگی ہمیں متوجہ کرتی ہے، وہیں لکھنے پڑھنے والوں سے ان کی محبت بہت کچھ بیان کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اس خاکے میں صفدر امام قادری کی طالب علمانہ زندگی کی بھی وضاحت ہوتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صفدر امام قادری کے اندر بیبا کی بہت پہلے سے ہی موجود ہے۔ ایک سمینار میں قاضی عبدالودود پر مسعود حسین نے مقالہ پڑھا جس میں بہت زیادہ گہرائی نہیں تھی۔ خاکے میں وہ اسی سیمینار کے متعلق لکھتے ہیں:

''میں نے یہ بھی عرض کیا کہ مسعود حسین خان نے قاضی عبدالودود کی صرف چند اور فلاں فلاں تحریریں پڑھ کر تمام تحقیقی مضامین کے تعلق سے فیصلہ کر دیا۔ مسعود حسین خان نے جتنی دیر میں مقالہ پڑھا، مجلس صدارت نے بلاشبہ اس سے دوگنا وقت مجھے اظہار تاثرات کے لیے عطا کر دیا۔ میری تقریر کے بعد وہاب اشرفی مائک پر تشریف لائے اور انھوں نے یہ اعلان کیا کہ مسعود حسین خان اپنے مقالے کے سلسلے میں سوالوں کے جواب دیں۔ مسعود حسین خان اپنی جگہ تمتماہوئے بیٹھے رہے۔''

مذکورہ اقتباس میں دو چیزیں قابل توجہ ہیں۔ اول یہ کہ صفدر امام قادری کے اندر مطالعے کی عادت بہت پہلے سے ہے اور وہ مطالعہ، مطالعہ کی طرح کرتے ہیں۔ گہرائی سے پڑھتے ہیں اور پڑھی ہوئی چیزیں انھیں ازبر ہوتی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہاب اشرفی چھوٹوں کا اعتراف کرتے ہوئے جھجکتے نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بھری محفل میں صفدر امام قادری کے سوالات کو سراہا اور مسعود حسین کے مضمون کو ناقص قرار دیا۔ اس طرح صفدر امام قادری نے اس خاکے میں بہت سے علمی واقعات کو حسین انداز میں

بیان کیا، جس سے نہ صرف ایک ادبی فرد سامنے آتا ہے بلکہ ادبی عہد بھی واضح ہوتا ہے۔

تنقید نگار اگر نثری تخلیقات پر توجہ مبذول کرتا ہے تو اکثر تنقید والی سختی ناقد کی تخلیق میں راہ پانے لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ناقدین کی تخلیقات ادب میں مقام نہیں بنا پاتی ہیں۔ صفدر امام قادری بنیادی طور پر ایک ناقد ہیں، یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے کچھ افسانے بھی لکھے ہیں۔ لیکن بعد میں انھوں نے افسانہ نگاری سے قطع تعلق کر لیا اور تنقید کو پورا وقت دیا۔ اس لیے ان کی ناقدانہ حیثیت زیادہ مسلم ہے۔ صفدر امام قادری کی یہ بڑی فن کاری ہے کہ انھوں نے اپنے خاکوں کو تنقید کی سختی سے محفوظ رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خاکوں کا دبا دبا احساس ہمیں مشرقیت سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ کیوں کہ ہمارے سماج میں بڑوں کی تعظیم کا ایک الگ ہی نظریہ ہے۔ خاکوں میں تعظیم اور رقت آمیزی کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ خاکہ نگار نے اپنے تمام خاکوں میں تعظیم، رقت آمیزی اور عاجزی کا خیال رکھا ہے۔ صفدر امام قادری نے زندہ لوگوں پر خاکہ نہیں لکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خاکوں کی متعلقہ شخصیت یا تو استاد ہیں یا پھر استاد معنوی۔ استادی اور شاگردی میں تعظیم کے پہلو کا خاصا عمل دخل ہوتا ہے۔ شفیع جاوید، والد محترم، پروفیسر وہاب اشرفی اور پروفیسر ناز قادری وغیرہ پر لکھتے وقت صفدر امام قادری نے اُن باتوں پر زیادہ توجہ مبذول کی جن میں شفقت ومحبت کا معاملہ ہو۔ کیوں کہ ان شخصیات نے صفدر امام قادری کی زندگی پر غیر محسوس طریقے سے بہت سے اثرات مرتب کیے۔ گویا ان کی حیثیت استاد معنوی اور اصلی کی سی نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر صفدر امام قادری کے خاکوں کی انفرادیت کے ضمن میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ شخصیات کے مزاحیہ پہلوؤں کو ابھارنے پر توجہ مبذول نہیں کرتے۔ حقائق کے بیان اور حقائق کے متعلقات سے عملی زندگی کے لیے سبق حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خاکوں کی قرأت کے دوران محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے شاید دانستہ طور پر مزاحیہ پس منظر سے خود کو الگ کیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ طویل خاکہ لکھنے میں یقین رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خاکوں میں بیک وقت متعدد ادبی اصناف کے رنگ ابھرتے ہیں۔ افسانوی مکالموں کی بنیاد پر وہ کسی خاکے کو طویل کرنے والی حکمت عملی گریز کرتے ہیں اور وہ ٹھوس بیانیہ سے متعلقہ شخصیات کی زندگی کے نمایاں پہلوؤں کو بیان واضح کر دیتے ہیں جس سے شخصیت مکمل آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے اور ان کے زندگی جینے کا سلیقہ آئینہ بن کر سامنے آتا ہے جس میں قاری اپنی زندگی کا عکس دیکھ لیتا ہے اور خود اپنی زندگی سے ان واقعات کا موازنہ کرتا ہے۔ اس طرح عظیم لوگوں کی زندگی سے زندگی جینے کا سلیقہ مستعار لیتا ہے۔ گویا ان کے خاکوں کی شخصیات خاموش مصلح کا فریضہ بھی انجام دیتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اردو خاکہ نگاری میں مجتبیٰ حسین کی حیثیت مسلم ہے اور انھوں نے لازوال

خاکے لکھے، مگر ان کے خاکوں کی انفرادیت دراصل ان کے طنزیہ اسلوب میں ہی پوشیدہ ہے۔ اگر ان کے طنزیہ معاملات کو خاکوں سے الگ کر دیا جائے تو شاید ان کے یہاں کوئی دل چسپی کا سامان نہ بچے گا۔ صفدر امام قادری نے طنزیہ اور مزاحیہ پہلوؤں سے اجتناب کرتے ہوئے بھی اپنے خاکوں میں ایسی دل چسپی پیدا کر دی ہے جو دیگر خاکہ نگاروں کے یہاں نظر نہیں آتی ہے۔ کلیم عاجز نے بھی بہت سے خاکے لکھے مگر انھوں نے جملوں کی تکرار سے اپنی تحریروں کو بدمزہ کر دیا ہے۔ ان کی تنقید میں جملوں کی کثرت سے تکرار پیدا ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خاکوں اور تنقید کا رنگ بھی دھندلا ہو جاتا ہے۔ صفدر امام قادری نے اپنے خاکوں کو نہ صرف تکرار سے بچایا بلکہ افسانوی فضا سے بھی۔ انھوں نے شخصیات کے اردگرد رہتے ہوئے ٹھوس حقائق سے ٹھوس بیانیہ تیار کیا ہے۔ ان کا اسلوب تحریر خاکوں میں بدلتا نہیں ہے۔ وہ غیر ضروری طور پر استعارات سے کام نہیں لیتے ہیں اور نہ ہی تشبیہوں سے اپنی نثر کو شاعرانہ نثر بناتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ شخصیات کو ثانوی حیثیت سے پیش نہیں کرتے ہیں۔ خاکوں کی روایت پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت سے خاکہ نگاروں نے فن کاری اور زبان دانی کا مظاہرہ کرنے کے لیے شخصیات کو خاکوں سے غائب کر دیا اور ضمنی طور پر بہت سے واقعات کو پیش کر دیا۔ صفدر امام قادری کے خاکے طوالت کے باوجود متعلقہ شخصیات کے اردگرد ہی گھومتے ہیں۔ گویا ارتکاز، حقائق بیان اور ٹھوس اسلوب ان کے خاکوں کی انفرادیت ثابت کرتا ہے۔

◂◂ ● ▸▸

Assistant Professr Dept of Urdu
D.S.College,Katihar(Bihar)-854105 Mob: 9470120116

مکتبۂ صدف کی تصانیف

جانے پہچانے لوگ (خاکے اور شخصی تاثرات) — ہم عصر اردو افسانہ (تنقید واحتساب)
صفدر امام قادری — ڈاکٹر الفیہ نوری
مرتبہ: ڈاکٹر عابدہ پروین، نیلوفر یاسمین — صفحات: ۶۲۴
صفحات: ۲۸۸ — قیمت: ۵۰۰/روپے — سنہ اشاعت: ۲۰۱۹ء
قیمت ۳۵۰/روپے — سنہ اشاعت: ۲۰۲۰ء

اردو شاعری اور مہاتما گاندھی (تحقیق)
آصف ابرار — صفحات: ۳۰۳ — قیمت: ۲۵۰/ — سنہ اشاعت: ۲۰۲۰ء

زیر اہتمام: مکتبۂ صدف، ۲۰۲/ابو پلازا، آئی ٹی موڑ، اشوک راج پتھ، پٹنہ، ۸۰۰۰۰۶

● محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی

مولانا آزاد کی سیاسی وانتظامی صلاحیتیں

شیخ خیرالدین کے صاحب زادے مولانا احمد محی الدین فیروز بخت ابوالکلام آزاد کی ولادت باسعادت ایام حج 11 نومبر 1888 بمقام مکہ مکرمہ، جزیرۃ العرب میں ہوئی۔ایام طفلی میں ہی علم ودانش کی وہ تمام منزلیں سر کرلیں جسے عام طور پر عمریں لگ جایا کرتی ہیں۔مولانا کے کارنامے کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) آزادی سے قبل

(۲) آزادی کے بعد جسے جدید ہندوستان کی تعمیر کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔

میں نے ان کی زندی کو دو حصوں میں اس لیے تقسیم کیا کہ آزادی سے قبل کی زندگی جدو جہد اور ملک آزاد کرانے میں گزر گیا جب تک ان کی عمر کی 59 بہاریں ختم ہوگئیں۔آزادی کے بعد انہیں کام کرنے کا موقع ملا جسے انہوں نے ہندوستان کی تعمیر میں لگادی۔

وہ سیاسی رہنما تھے ہندوستان کی تشکیل میں ان کی بے پناہ قربانیاں ان کی جیتی جاگتی کا ثبوت ہے ۔وہ شعلہ بیاں مقرر، سربکف مجاہد آزادی، صاحب نظر مفسر قرآن تھے۔مولانا آزاد نے اپنی زندگی خود بنائی تھی۔انہوں نے اپنی زندگی خود سنوارا اور نکھارا تھا۔ان کی طبیعت ایسی تھی کہ وہ ہر چیز کو ہو بہو قبول کرنے کے بجائے اسے پرکھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ مذہبی عقائد، خاندانی روایات، مشرقی تعلیمی نظام، برطانوی استعمار وغیرہ افتادطبع کی زد پر تھی۔مولانا کی ذہن کی پرواز کا اندازہ کرنا مشکل تھا کہ تیرہ سال کی عمر میں جو بالغ ہونے کے زمانے سے پہلے بالغ ہو چکا تھا۔

آزاد ہندوستان سے پہلے مولانا کی زندگی اور بصیرت کو مقدمہ الجیش کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے کیوں کہ انہوں نے ہندوستان کی آزادی کے لئے اور جدید ہندوستان کی تعمیر کیلئے جس بصیرت سے کام لیا اس کا بہت جلد اثر آزاد ہندوستان میں دکھا۔آزادی سے قبل انہوں نے اپنی زندگی کا ایک طویل حصہ جیل کی سلاخوں میں گزارا کیوں کہ ایک تحقیق کے مطابق مولانا کی زندگی کا ہر ساتواں دن جیل میں گزرا۔

پی۔اے۔راجپوت اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ

''ابوالکلام آزاد جانتے تھے کہ مذہب کا لوگوں کے ذہنوں پر کتنا زبردست قابو ہوتا ہے۔اس لئے انہوں نے ایک خالص سیاسی تحریک کو مذہبی جھلک دے دی''

(ص 354 ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت)

مولانا قرآن مجید کا گہرا علم رکھتے تھے وہ نہ صرف مفسر تھے بلکہ مجتہد بھی تھے۔انہوں نے قرآنی آیات سے یہ ثابت کرنا چاہا کہ آزدی کی جدو جہد میں حصہ لینا اور انگریزوں کی غلامی کی زنجیروں سے آزادی حاصل کرنا نہ صرف مسلمانوں کا سماجی حق ہے بلکہ مذہبی فریضہ بھی ہے۔گویا انہوں نے مذہبی جواز پیش کر کے مسلمانوں میں صور پھونک دی۔وہ اپنے مضمون ''ہندوستان کی آزادی اور مسلمان'' میں لکھتے ہیں:۔

''یاد رکھئے کہ ہندوؤں کے لئے ملک کی آزادی کے لئے جدو جہد کرنا داخل حب الوطنی ہے مگر آپ کے لئے ایک فرض دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ۔آپ کو اللہ نے اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے اور جہاد کے معنیٰ میں ہر وہ کوشش داخل ہے جو حق اور صداقت اور انسانی بندو استبداد اور غلامی کے توڑنے کے لیے کی جائے''۔

(ص 356 ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت)

مولانا کے ایسے بے شمار مضامین ہیں جس میں انہوں نے ملک کو آزاد کرانے کے حوالے سے تحریر کی ہیں۔انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ ملک کو آزد کرانے میں بھی حصہ لیا۔ مولانا نے قول وفعل کے ذریعہ اپنے آپ کو رہنما ثابت کیا۔عام طور پر تین نوعیت کے رہنما ہوتے ہیں:۔

۱۔ سیاسی مفکر ہو مگر سیاسی کارکن نہ ہو

۲۔سیاسی مفکر نہ ہو مگر سیاسی کارکن ہو، جو آجکل کے لیڈر ہیں

۳۔سیاسی مفکر ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی کارکن بھی ہو، ایسے بہت کم لوگ ہوتے ہیں۔لیکن مولانا کا نام ایسے کمیاب لوگوں میں لیا جاتا ہے۔

مولانا آزاد 1940 سے 1949 تک کانگریس کے صدر رہے۔ہندوستان کی تحریک آزادی میں مولانا کو تنہا یہ اعزاز حاصل ہے۔انہوں نے آزادی کے بعد اس ملک کی نئی تعمیر کا منصوبہ بنانے میں بھی در پردہ بہت اہم رول ادا کیا اور پنڈت جواہر لال نہرو کے سب سے زیادہ معتمد مشیر بنے رہے۔وہ جانتے تھے کہ اس ملک کو جہاں ہزاروں زبانیں بولی جاتی ہیں، جہاں مختلف مذاہب کے لوگ بستے ہیں، جہاں رنگا رنگ تہذیبیں چلتی ہیں، جہاں طرح طرح کے رسوم وعادات ہیں، اگر کسی ایک رسی سے باندھ کر رکھا جاسکتا ہے تو وہ قومی اتحاد اور باہمی رواداری ہے۔مولانا آزاد کے نزدیک جدید ہندوستان کی تعمیر کے لئے ہندو اور

مسلمان کا اتحاد نہایت ضروری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تقریر میں بارہا اس بات پر زور دیا کرتے تھے کہ ہندو اور مسلمان کو گنگا اور جمنا کی طرح ایک دن ملنا ہوگا۔ ان کا ماننا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو فرقے تو ضرور ہیں لیکن ان ہی کو ملا کر ہندوستانی قوم کی تشکیل ہوتی ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کے تصور کی ضرورت ہر اس سماج اور ہر اس ملک کی ضرورت ہے جو کثیر مذہبی ہے۔ آج ہمارا ملک آزاد ہے، اسی کا نتیجہ ہے۔

آزادی کے بعد

مولانا کی زندگی کے ہزار رنگ ہیں اور ہر رنگ میں صد ہزار نیرنگیاں ہیں۔ مولانا جنگ آزادی کے ایک جانباز مجاہد، آزادی کی اور جمہوریت کے استحکام کے علم بردار، دردمند، دوراندیش، عظیم مفکر اور رہبر ملت کے ساتھ ساتھ جدید ہندوستان کے معمار، انسان دوست اور قوم پرست بھی تھے۔ مولانا نے جدید ہندوستان کی تعمیر وترقی کے لئے جو بیش بہا خدمات انجام دیے ہیں اسے کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ کیونکہ مولانا آزاد ایسے پہلے وزیر تعلیم تھے جن کے پاس گزشتہ لوگوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے مثال قائم کی اور جدید ہندوستان کی تعمیر میں اپنے حسن بصیرت سے نئے نئے خاکے بنائے۔ جدید ہندوستان میں ساہتیہ اکیڈمی، للت کلا اکیڈمی، سنگیت ناٹک اکیڈمی، انڈین کونسل آف سائنٹیفک ریسرچ، انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز وغیرہ مولانا کی بصیرت کا ہی نتیجہ ہے۔ مولانا نے اپنے دور وزارت میں ان تمام شعبے کو نہ صرف کھلوایا بلکہ اس کی صحیح سرپرستی بھی فرمائی۔ 35 سال کی عمر میں کانگریس کے عہدۂ صدارت پر متمکن ہو چکے تھے، کانگریس کی تاریخ میں سب سے کم عمر میں صدر بننے کا شرف انہیں حاصل ہوا نیز پارٹی میں ان کی پکڑ بھی زبردست تھی۔ وہ چاہتے تو وزیر تعلیم ہونے کے بجائے کسی اور کابینہ کے وزیر ہو سکتے تھے لیکن انہوں نے اپنے لئے وزیر تعلیم ہونا زیادہ بہتر سمجھا کیونکہ جانتے تھے اس کے ذریعہ جدید ہندوستان کی تعمیر جس قدر ہو سکتی ہے وہ کسی اور وزارت میں ممکن نہیں۔ اسی لئے انہوں نے اپنے وزارت میں نئے نئے شعبے قائم کر کے آنے والے لوگوں کے لئے ایک مشعل راہ بنادی ہے۔ چونکہ مولانا آزاد جامع صفات کے مالک تھے، ان کی شخصیت میں دل ودماغ دونوں کی خصوصیتیں جمع تھیں۔ جناب گلزار نقوی اپنے ایک مضمون ''مولانا آزاد کی انتظامی صلاحتیں'' میں مولانا کے انتظامی امور پر اور بالاستیعاب فیصلہ لینے کے واقعات کو بیان کیا ہے۔ یہاں پر اس مضمون سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:۔

> ''مولانا نے دینی مسائل کو سلجھانے میں جو کارنامہ انجام دیا اس کے لیے عالم اسلام ہمیشہ ہمیشہ ان کا مرہون منت رہے گا۔ صحافت کے میدان میں مولانا نے عوامی ذہن کی جو تربیت کی اس کی مثال نہیں ملتی۔ آزادی کی راہ میں ان کی قربانیاں ناقابل فراموش ہیں۔ ان تمام صفات کے علاوہ ایک پہلو اور ہے جو مولانا کی ذات کو سطح عام سے بالاتر کرتا ہے اور وہ ہے

> ان کی عظیم الشان تنظیمی اور انتظامی صلاحیت۔ اس خوبی کا اندازہ ہمیں ان سرکاری اور غیر سرکاری فائلوں کے مطالعے سے ہوتا ہے جنہیں مولانا کی میز تک پہنچنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔''

حصول آزدی کے بعد مولانا نے حکومت ہند کی وزارت تعلیم کی ذمہ داری سنبھالی۔ تعلیم کے وسیلے سے مولانا ایک نئے سماج کی بنیاد ڈالی اور تعلیمی ڈھانچے کو وہ روپ دیا جس پر ہمارا آج کا سماج کھڑا ہے۔'' (ص 238، ایوان اردو کا مولانا ابوالکلام آزاد نمبر)

جب نئے بھارت کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو بنے تو مولانا آزاد پہلے وزیر تعلیم بنے لیکن مولانا پنڈت جی کے معتمد خاص اور رفیق کار تھے۔ قومی ریاست کی ترقی پسند پالیسیوں کی تشکیل میں شانہ بشانہ تھے۔ وہ بین الاقوامی مفاہمت اور عالمی امن کے پرزور حامی تھے۔ انہوں نے ہی دنیا کو یہ تصور دیا کہ کتابی علم حاصل کرنے کا نام تعلیم نہیں ہے۔ سائنسی اور تکنیکی تعلیم، اساتذہ کی ٹریننگ، لسانی تربیت، شیڈیول جاتیوں اور دیگر پسماندہ طبقوں کے لیے تعلیمی وضایف جاری کیا۔ انہوں نے ہی احساس دلایا کہ تعلیم دراصل انسانی وسائل کو فروغ دینے کا نام ہے۔ انہوں نے ہی یونیورسٹی کے ایک ماسٹر پلان UGC یونیورسٹی گرانٹ کمیشن قائم کیا۔ انڈین کونسل برائے تہذیبی تعلقات (Indian Council for cultural relatios) اپریل 1950 کو قائم کر کے بانی اور صدر کہلائے۔ مولانا کا مقصد اس کے ذریعہ عالمی برادری میں امن کا پیغام پہنچانا تھا۔ آج پورے ہندوستان کے لوگ نئے نئے ٹکنالوجی سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ یہاں کے طلبہ انجینئرنگ، منیجمنٹ، ایم سے اے (MCA)، فارمیسی، آرکے ٹیکچر، HMCT وغیرہ کے علاوہ میں داخلہ لے کر ہندوستان کو آگے بڑھانے کا کام کر رہے ہیں۔ All india Council for technical Education) کو مولانا نے ازسرنو مرتب کیا جس سے آج بھی بڑی تعداد میں ہندوستانی طلبہ وطالبات استفادہ کر رہے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسیٹی کے بانی ویسے تو سرسید احمد خاں ہیں لیکن اگر میں یہ کہوں کہ جدید ہندوستان میں یونیورسیٹی کو نشاۃ ثانیہ دلانے کا سہرا انہی کے سر جاتا ہے تو غلط نہیں ہوگا کیونکہ محمد ضیاء الدین انصاری اپنے مضمون ''مولانا آزاد اور علی گڑھ'' میں لکھتے ہیں:۔

> ''1947 میں ملک کی تقسیم کے بعد یونیورسٹی پر بڑا صبر آزما وقت پڑا۔ اس پر پاکستان بنانے کا الزام لگایا گیا۔ اس کی پاداش میں اسے صفحہ ہستی سے مٹانے کا منصوبہ بنالیا گیا۔ ایسے نازک وقت میں مولانا ہی اس کے کام آئے۔ انہوں نے نہ صرف اسے تباہی کے دہانے سے نکالا بلکہ بحیثیت وزیر تعلیم اس کی ترقی کے لئے تمام ممکنہ مواقع فراہم کئے۔ مولانا کی یہ خدمات یونیورسیٹی کی تاریخ کا ناقابل فراموش باب ہے۔ ان خدمات کا اعتراف

یونیورسیٹی کے بہی خواہوں اور ارباب اقتدار نے متعدد مقامات پر صمیم قلب سے کیا ہے‘‘۔

(ص 580،ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت)

جس شخص کے علم کا سر چشمہ قرآن پاک ہو، جس نے جدید ہندوستان کی تعمیر میں قرآن مقدس کے فیوض کو عام کیا ہو اور جس نے اپنے اس علم کے تجربہ کو ہندوستان بنانے میں لگایا ہو جس کے اندر نہ صرف مذہبی و دینی رہنمائی ہے بلکہ دنیاوی کامیابی کا راز بھی پوشیدہ ہے۔ بلاشبہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے مختلف علوم وفنون کا علم ہونا ضروری ہے۔ مولانا ایک جید عالم تھے۔ انہوں نے قرآن پاک کی جامع و مانع تفسیر بھی لکھی ہے۔ روشن دماغ اور اعلیٰ ذہن کے مالک تھے۔ اس حوالے سے راجیو گاندھی کے خیالات کو دیکھا جاسکتا ہے۔ وہ اپنے ایک تقریر میں مولانا کے علم کا منبع اور ان کی بصیرت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:۔

’’مولانا آزاد کے گہرے علم وفضل کی بنیاد مقدس قرآن اور اسلامی و دینیات کی تصانیف پر قائم تھی۔ ہندوستان کی گوناگوں تہذیبوں کے تمام پہلوؤں کی جانکاری نے ان کے علم میں وسعت پیدا کردی تھی۔ انہوں نے تاریخ، سیاست اور معاشیات پر موجودہ دور کی اہم ترین تصانیف سے استفادہ کیا تھا‘‘(ص 48، ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت)

انہوں نے خداداد صلاحیت کا جدید ہندوستان کی تعمیر میں بھر پور مظاہرہ کیا۔ الہلال مورخہ 8 ستمبر 1912 مین الہلال کے مقاصد اور پولیٹیکل تعلیم کی نسبت ایک خط اور اس کا جواب شائع ہوا جس میں انہوں نے لکھا:۔

’’پولیٹیکل مباحث کو مذہبی رنگ سے الگ کر دیجئے لیکن اگر الگ کر دیں تو ہمارے پاس باقی کیا رہ جاتا ہے؟ ہم نے تو اپنے پولیٹیکل خیالات بھی مذہب ہی سے سیکھے ہیں‘‘(ص 157 مولانا آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت)

مذکورہ اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا کی سوچ کی پرواز کہاں تک تھی۔ وہ قرآن و حدیث کا گہرا علم رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنا پیغام عام کرنے کے لئے اور اپنی بات عوام تک پہنچانے کے لئے صحافت کو وسیلہ فروغ بنایا۔ بیشک وہ نہ صرف صحافی تھے بلکہ صحافت کے اوج ثریا پر فائز تھے، اردو صحافت پر ان کے چھوڑے ہوئے یادگار نقوش آج بھی ان کے لب ولہجہ اور اسلوب کے خوشنما بادل قاری کو سیراب کررہے ہیں۔ وہ اردو ادب کے صاحب طرز ادیب اور مستند نثر نگار تھے۔ الہلال کے اسلوب کے بارے میں عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

’’خدا جانے کتنے نئے اور بھاری بھرکم لغات اور نئی ترکیبیں اور نئی تشبیہیں اور نئے اسلوب ہر ہفتے اسی ادبی اور علمی ٹکسال سے ڈھل ڈھل کر باہر نکلنے لگے اور جاذبیت کا یہ

عالم تھا کہ نکلتے ہی سکۂ رائج الوقت بن گئے۔ حالی وشبلی کی سلالت وسادگی سر پیٹتی رہی اور اکبر الہ آبادی اور عبدالحق سب ہائے ہائے کرتے رہ گئے‘‘

(ص 102،ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت)

مولانا آزاد نے بطور صحافی بھی اردو صحافت کو نئی راہ اور اس کے طریقہ کار کے اصول مرتب کئے۔ صحافت کی دنیا میں انہوں نے اپنی صحافت کے ذریعہ اور دوصحافت کو وہ مقام بخشا جو صدیوں میں ہونا مشکل تھا۔ چونکہ یہ میرا موضوع نہیں ہے اس لئے تفصیل ان کے صحافتی خدمات میں دیکھا جاسکتا ہے۔

مولانا آزاد کی ذوق جمالیات بھی عمدہ تھا۔ وہ مذہبی عالم ہونے کے باوجود موسیقی اور مصوری کے رموز و لطایف سے آگاہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر کام بحسن خوبی انجام دیا کرتے تھے۔ انہوں نے پوری زندگی ایک عظیم قومی مقاصد کے لئے وقف کردی۔ ایثار وقربانی کے ہر موقعے پر آگے رہے اور ایسی بھرپور زندگی گزاری کر بھی اس طرح اس دنیا سے چلے گئے جیسے کوئی دامن جھاڑ کر اٹھ جاتا ہے۔

Research Assistant, NCPUL, New Delhi
Address : Flat No. 202 2nd floor,
H. No. F-41, Nafis Road Batla house, Okhla,
New Delhi 110025 Mob. No. 8826080282

اقبال حسن آزاد
کا
چوتھا
افسانوی مجموعہ
اوس کے موتی
(زیر طبع)

● ڈاکٹر شاذیہ کمال

عبدالصمد کے ناول ''جہاں تیرا ہے یا میرا'' کا تنقیدی مطالعہ

اردو فکشن کی دنیا میں عبدالصمد کا نام تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ انہوں نے افسانوی ادب کی دو اہم صنفوں ناول اور افسانہ دونوں پر قریب ایک ہی توجہ کے ساتھ اپنی نگاہ اور نظر صرف کی ہے۔ وہ اپنے شہرۂ آفاق ناول ''دوگز زمین'' سے مشہور ہوئے۔ یہ ان کا پہلا مگر مقبول ترین ناول تھا۔ ''دوگز زمین'' دراصل ہندوستان کی آزادی سے قبل سے لے کر بنگلہ دیش کے قیام تک کے عہد کے برصغیر میں مسلمانوں کے معاشرتی، سماجی، سیاسی حالات اور ان کی دربدری کی صورت حال کو منعکس کرتا ہے۔ ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کا قیام عمل میں آیا مگر معاشرتی، لسانی، علاقائی اور ثقافتی اعتبار سے مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) اور مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) دو الگ الگ خطے تھے۔ جغرافیائی اعتبار سے یہ دونوں ایک دوسرے سے کوسوں دور تھے۔ مشرقی پاکستان میں بنگالی اور مہاجرین (بنگالی وہاں کی اصل عوام اور مہاجرین ہندوستان سے ہجرت کر کے گئے ہوئے لوگ) دو الگ قومیں تھیں۔ گرچہ ان کا مذہب ایک تھا، رسول ایک تھا، شریعت ایک تھی۔ مگر ان کے ذہنوں میں جو فرق تھا وہ فرق کسی گہری کھائی سے کم نہ تھا۔ اور اس سبب سے دنیا نے ان کے بیچ جنگ کا جو خونی نظارہ دیکھا وہ نظارہ آج بھی تاریخ کے صفحوں میں بند ماتم کر رہا ہے۔ مگر فائدہ اس سے یہ ہوا کہ اس خونی کھیل کے بعد ۲۶/مارچ ۱۹۷۱ء میں دنیا کے نقشے پر ایک ملک نمودار ہوا جس کی زبان بنگالی تھی۔ ان کی اپنی رہائش اور اپنی منفرد تہذیب و ثقافت تھی۔ اسے آزادی حاصل کرنے میں ہندوستان کی حمایت حاصل رہی تھی۔ اس میں کتنی جانیں گئیں اور کس کس طرح کی دہشت، وحشت اور خوف و ہراس کا لوگوں نے سامنا کیا، کس کا کیا لٹا اور کس کا کیا بچا ان تمام باتوں کی واضح عکاسی موصوف کے ناول ''دوگز زمین'' میں کی گئی ہے۔ ظاہر ہے یہ ایک سنجیدہ مگر اہم اور دلچسپ موضوع تھا جس نے اس ناول کو کامیابی کی ضمانت دے دی۔ اپنی اشاعت (۱۹۸۸ء) کے ساتھ ہی اس ناول نے اردو دنیا (برصغیر) کو پوری شدت کے ساتھ اپنی جانب متوجہ کیا۔ اسے حکومت ہند کے ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے متواتر ان کے کئی ناول منظرِ عام پر آتے گئے۔ ان ناولوں کے نام

ہیں۔ مہاتما (۱۹۹۲ء)، خوابوں کا سویرا (۱۹۹۴ء)، مہاساگر (۱۹۹۶ء)، دھمک (۲۰۰۴ء)، بکھرے اوراق (۲۰۱۰ء)، شکست کی آواز (۲۰۱۲ء)، اُجالوں کی سیاہی (۲۰۱۵ء) اور "The Journey of Burning Boat" (۲۰۱۲ء)۔ موصوف نے کہانی کی مختصر شکل افسانہ نگاری میں بھی خاصا نام حاصل کیا۔ ان کے چھ افسانوی مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے نام ہیں۔ (۱) بارہ رنگوں والا کمرہ (۱۹۸۰ء)، (۲) پسِ دیوار (۱۹۸۳ء)، (۳) سیاہ کاغذ کی دھجیاں (۱۹۹۰ء)، (۴) میوزیکل چیر (۱۹۹۶ء)، (۵) آگ کے اندر راکھ (۲۰۰۰ء) اور (۶) بہ قلم خود (۲۰۱۶ء)۔ ان کے بہترین افسانوں کا مجموعہ ''عبدالصمد کے منتخب افسانے'' (۲۰۱۴ء مرتب محسن رضا رضوی اور افسانہ خاتون) شائع ہو چکا ہے۔ فکشن کے علاوہ غیر افسانوی ادب خاکہ نگاری کی جانب بھی انہوں نے اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔ ان کے خاکوں کا ایک مجموعہ ''دل میں رہے مقیم'' (۲۰۱۴ء) چھپ کر منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ موصوف علم سیاسیات کے اُستاد رہے ہیں اور سیاسیات سے متعلق بھی ان کی دو کتابیں سامنے آئی ہیں۔

مگر یہاں پر میرے ذکر کا موضوع ان کا نیا ترین ناول ''جہاں تیرا ہے یا میرا'' ہے۔ یہ ناول ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا ہے۔ عام طور پر کوئی بھی ناول ہو اس کی سرزمین بڑی طویل ہوتی ہے اور جس ناول میں پیچیدگی اور طوالت جتنی زیادہ ہوتی ہے وہ ناول اتنا ہی ہمہ گیر بن جاتا ہے۔ ''جہاں تیرا ہے یا میرا'' کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ ناول بہت سارے مسائل (جن کا تعلق ہندوستانی مسلمانوں سے ہے) اور ان کے پیچیدہ حالات کا چشم دید گواہ ہے۔ پورا ناول ۵۵ مختصر و طویل اکائیوں میں منقسم ہے اور یوں لگتا ہے کہ اس کی ہر اکائی ایک مکمل کہانی ہے جس میں حقیقت کے مختلف رنگ شامل ہیں۔ مگر ہر اکائی ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے کے بغیر ادھورا ہے۔ یہ ناول اپنے موضوعات، کردار نگاری اور انداز بیان کے اعتبار سے اہم ہے۔ جہاں تک موضوع کا سوال ہے اس میں جلدی کسی تفریحی نکتے کو جگہ نہیں ملی ہے۔ بلکہ اس میں ایسے سلگتے ہوئے مسائل پر بات کی گئی ہے جو بدقسمتی سے ہندوستانی مسلمانوں کے حصے میں در آئے ہیں۔ ان میں بے روزگاری سب سے بڑا مسئلہ ہے مگر اس سے بھی بڑے کئی دوسرے مسائل ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو دیگر قوموں بشمول خود کی نظروں میں ذلیل و خوار بنا دیا ہے۔ یہ اپنی زندگی ہی میں فوت ہو چکے ہیں۔ ان مسائل نے مسلمانوں کو ایک ایسی کھائی میں گرا دیا ہے جہاں سے نکلنا خود ان کے لیے بڑا چیلنج ہے۔ غریبی، مفلوک الحالی اور جہالت تو مسائل ہیں ہی مگر ذلت پسندی، سستی، کاہلی، نئی نسل کا تعلیم سے دوری، غلط عادات و اطوار اور مذہب سے بیزاری ایسے عوامل ہیں جنہوں نے خود ان کی نظروں میں ان کی شناخت کو ختم کر دیا ہے۔ ان کی آنکھوں پر دھند کا ایک ایسا پردہ پڑ چکا ہے کہ جس سے ان کے شعور کی تمام راہیں مفقود ہو چکی

ہیں۔ دنیا میں ہندوستانی مسلمانوں کا تعارف پست حال اور قابلِ رحم قوم کے طور پر کیا جاتا ہے۔ نہایت قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ دہشت گردی جیسے جرم کو مسلمانوں سے ہی جوڑ کر پیش کیا جارہا ہے۔ یہ اس قوم کا المیہ ہی ہے کہ مسلم مخالف قومیں مسلمانوں کی شبیہہ کو مزید بگاڑنے پر کس قدر مستعد ہیں۔

یہ ناول دراصل ہندوستانی مسلمانوں پر کیا گیا discourse ہے۔ اس سے مصنف کی فکر اور ان کے خلوص کا بھی پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے انتہائی اہم مسائل کو اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے اور ظاہر ہے اس طرح کا ناول وہ مخلص قلم کار ہی لکھ سکتا ہے جس کے دل میں ذرہ برابر بھی قوم سے ہمدردی کا جذبہ موجود ہو۔ جن مسائل اور مجبوریوں کو موضوع بنایا گیا ہے ان کا تعلق مسلمانوں کے متوسط بلکہ نچلے متوسط طبقے سے ہے۔ مسلم نوجوانوں کے بیچ بے روزگاری کا مسئلہ عام ہے اور یہ ناول کا مرکزی موضوع ہے۔ مصنف نے ہندوستانی مسلمانوں کی معیشت اور ان کے سلسلۂ روزگار کے باریک سے باریک نکتوں پر اپنی چشم بینی سے کام لیا ہے۔ پورا ناول ایک تعلیم یافتہ محنتی نوجوان کا روزگار کے لیے دربدری کی صورت حال کو منعکس کرتا ہے۔ یہ ایسا موضوع ہے جو نایاب ہے نہ کم یاب بلکہ یہ ہر دوسرے تیسرے فرد کا قصہ معلوم ہوتا ہے۔ ایم-اے کر لینے کے بعد راشد جب ایک مقامی اقلیتی کالج میں بطور غیر مستقل استاد بحال ہوتا ہے تو وہاں کالج کے اندر کرپشن کا جو ماحول گرم ہے وہ سب اس کے سامنے آجاتا ہے اس سلسلے سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

> ''راشد کے کانوں میں کسی نے پھونک دیا کہ اس بحالی میں سارے ممکنہ حربے آزمائے جائیں گے، پیسہ، پیروی اور بھی بہت سی ایسی چیزیں جو ہاتھوں ہاتھ اور اشاروں ہی میں طے کی جاتی ہیں۔ راشد نے اپنا محاسبہ کیا تو اس کے ہاتھ ایسے تہی دست تھے کہ ان میں لکیریں بھی اپنی آب و تاب کھو چکی تھیں۔ وہ ان سینئر سے ملا جنہوں نے دورانِ گفتگو آئین کی دفعات ۲۹/اور ۳۰/کا حوالہ دیا تھا۔ وہ صاحب قہقہہ لگانے لگے۔'' (ص ۱۳/)

اسی حوالے سے مصنف نے ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ نشاطِ ثانیہ کا بھی ذکر کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ اسی پسِ منظر میں آئین ہند نے ہندوستانی مسلمانوں کو ۲۹/اور ۳۰/دفعات کے تحت خصوصی اختیار دیتے ہوئے انہیں اقلیتی ادارہ کھولنے اور چلانے کا اختیار دے رکھا ہے۔ مگر اس اختیار کے پسِ پشت اقلیتی اداروں کی جو حقیقت ہے اور وہاں کرپشن کا جو ماحول گرم ہے اسے مصنف نے طشت از بام کر ڈالا ہے۔ اس ناول میں جہاں مسلم نوجوان کی بے روزگاری، اس کے راستے میں جگہ جگہ پر حائل مشکلات، جدوجہد اور مشقتوں سے پُر زندگی کی داستان بیان کی گئی ہے مگر اس سے بھی زیادہ مسلم قوم کی جاہلیت، مغلوک الحالی اور خصوصاً ان کے جوان ہوتے بچوں کی بے راہ روی، تعلیم سے ان کی دوری، اخلاقی پستی اور برائیوں و جرائم

سے ان کی وابستگی کو آئینہ دکھایا گیا ہے۔ درج ذیل اقتباس میں یہ تصویر نظر آتی ہے۔ ملاحظہ کریں۔

ایک گارجین اپنے ماحول سے متعارف کراتے ہوئے راشد سے بولتے ہیں۔

''..... یہ کھنڈر مجرمانہ سرگرمی کے اڈے بن چکے ہیں۔ پورے محلے میں ایک بھی فرد ایسا نہیں جس نے میٹرک سے آگے تعلیم پائی ہو، ان کے میٹرک پاس کر جانے کی بھی ایک الگ کہانی ہے، زیادہ تر بچے بیکار ہیں، دن بھر تاش کھیلنے، گپیں لڑانے اور ایک دوسرے سے مارا ماری میں وقت گزارتے ہیں، رات بھر لوڈو اور کیرم کی محفلیں جمتی ہیں.....'' (ص ۸۶)

اُس گارجین سے راشد پوچھتا ہے۔

''ایسا تو نہیں کہ انہیں سافٹ ٹارگٹ سمجھ کر شاطر مجرموں نے بھی انہیں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنا لیا ہو.....؟ آخر ان بچوں کے پاس ہوٹل بازی اور گرل فرینڈس پر خرچ کے لیے پیسے کہاں سے آتے ہیں.....؟''

گارجین اپنا شک ظاہر کرتے ہوئے بولتے ہیں۔

''میں حتمی طور پر تو نہیں کہہ سکتا، مگر آپ کا قیاس بعید از امکان بھی نہیں.....؟''

ایک دو مکالمے کے بعد راشد نے ان کے شک پر وار کرتے ہوئے کہا۔

''معاف کیجئے گا، آپ میرے باپ کے برابر ہیں، کوئی سچ بات میرے منہ سے نکل جائے تو بُرا مت مانیے گا۔ آپ کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے بچوں کے پیسوں سے آپ کا باورچی خانہ بھی چلتا ہے اور آپ نے یہ جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی کہ آخر وہ پیسے کہاں سے لاتے ہیں.....'' (ص ۸۷)

بہت ساری برائیاں اور گندگیاں نچلے اور غریب طبقے میں سرایت کر گئی ہیں۔ دراصل غربت، جہالت، پست ماحول اور مذہب سے دوری انہیں زندگی کی حقیقت سے اتنا دور کر دیتے ہیں کہ انہیں اپنے چاروں اطراف صرف کوڑے کے ڈھیر نظر آتے ہیں مگر ان کی توجہ کبھی اس جانب نہیں جاتی کہ ''کنول پھول'' اور بہت سے قیمتی موتی کیچڑ کی ہی پیداوار ہوتے ہیں۔

متذکرہ بالا مسائل کے علاوہ ایک نہایت سنجیدہ اور اہم مسئلہ دہشت گردی پر خصوصی توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جو حالیہ چند برسوں سے دنیا کا سنگین ترین اور نہایت اہم مسئلہ بن کر رہ گیا ہے۔ اس مسئلے کے موجد کچھ شر پسند عناصر اور اینٹی مسلم قسم کے لوگ ہیں۔ اس شر کی ترویج میں کچھ ملکوں کی خفیہ ایجنسیاں بھی کام کر رہی ہیں۔ یہ ایسا شر ہے جو بہت سارے شروں پر حاوی ہو گیا ہے اور اسے مسلمانوں سے

جوڑ کر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس بات سے پوری طرح انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ نام نہاد مسلمانوں یعنی اسلام کی بنیادی باتوں سے نا آشنا مسلمانوں نے بھی دہشت گردی کو کہیں کہیں اپنایا ہے اور وہ اپنی ناعاقبت اندیشی سے اسے جہاد قرار دیتے ہیں۔ مگر اس کے پسِ پشت سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی اس طرح کی واردات رونما ہوتی ہیں اس کی سوئی صحیح یا غلط مسلمانوں کی جانب گھما دی جاتی ہے اور اس سبب سے ان گنت مظلوم مسلم نوجوان فوراً شک کے کٹہرے میں آ جاتے ہیں اور اپنے جرم ناکردہ کی سزا کے مرتکب قرار پاتے ہیں۔ اس مسئلے نے عالمی شکل اختیار کر لی ہے۔ نائین الیوین (۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء میں امریکہ میں ہوا دہشت گردانہ حملہ) کے بعد امریکہ کے سماجی حالات میں آئی تبدیلی کو مصنف نے خصوصیت سے پیش کیا ہے۔ یہ اب تک کا سب سے بڑا دہشت گردانہ حملہ ہے۔ اس میں یو-ایس-اے کی دو اہم عمارتیں ''ورلڈ ٹریڈ سنٹر'' اور ''پنٹا گون'' ہوائی حملے سے اڑا دی گئی تھیں۔ اور تین ہزار کے قریب بے قصور انسان بے موت مار دیے گئے تھے۔ ان میں سے سینکڑوں لوگوں کی موت تو جائے واردات پر ہی ہو گئی تھی۔ زخمی ہونے والوں میں سے بیشتر چند دنوں یا ماہ میں زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسے۔ اس حملے میں جاں بحق ہونے والوں میں کچھ ایسے بھی تھے جن پر حملے کے سبب بعد میں سنگین بیماریاں حملہ آور ہوئیں اور انہوں نے بھی دنیا چھوڑ دی۔ مرنے والوں میں ایک بڑی تعداد سائنسدانوں، افسران اور اعلیٰ عہدیداران کی تھی۔ شاید یہ حملہ امریکی برین کو ختم کرنے کی کوشش تھی۔ مگر اس کے بعد امریکہ میں خوف و ہراس کا ماحول قائم ہوا اور وہاں کی سرزمین مسلمانوں کے لیے تنگ ہو گئی۔ اس کی سزا وہاں کے مقامی مسلمانوں کو بھگتنی پڑی۔ اور اب بھی وہاں کے مسلمان مقامی امریکن سے آنکھیں ملانے کی جلدی ہمت نہیں کر پاتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کا المیہ نہیں تو اور کیا ہے جبکہ اسلامی رو سے ایک ناحق انسان کا قتل روئے زمین کے تمام انسانوں کے قتل کے مساوی ہے۔ اور خواہ دنیا کا کوئی مذہب ہو وہ دہشت گردی کی تعلیم نہیں دیتا۔ یہ تو کسی مخصوص ذہنیت کی اُپج ہے جنہیں انسان سے پیار ہوتا ہے نہ مذہب سے اور نہ ہی اپنی زندگی سے۔ ان کے لیے زندگی ہی بے کار شئے ہے تبھی تو یہ اس طرح کی حرکتیں انجام دیتے ہیں۔

یہ ناول بیک وقت مسلمانوں کے متعدد مسئلوں پر غور و فکر کے کئی نکتے فراہم کرتا ہے۔ اس میں مسلمانوں کی پریشانیوں اور ان کے مسائل پر افسانوی انداز میں اس طرح گفتگو کی گئی ہے کہ دوران مطالعہ نہ کسی قسم کی اکتاہٹ محسوس ہوتی ہے اور نہ ہی دل اُچٹتا ہے۔ دلچسپی اور تجسّس ہر جگہ قائم رہتے ہیں۔ مصنف نے وسیع اور گہرے مطالعے کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کو بروئے کار لاتے ہوئے ناول میں حقیقی رنگ بھرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس ناول میں بڑا تضاد ہے اور اس میں مختلف رنگ موجود ہیں۔ مگر یہ رنگ قوس و قزح کے نہیں ہیں جنکی ترنگوں کے پھوٹنے سے چہار سمت اُمید اور خوشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

کردار نگاری کے اعتبار سے بھی یہ ناول نہایت اہم ہے۔ راشد نامی نوجوان ناول کا مرکزی کردار ہے۔ یہ کردار نہایت جاندار ہے اور اسی کی کشتی پر سوار ہو کر ناول نے اپنا پورا سفر طے کیا ہے۔ راشد متوسط یا نچلے متوسط طبقے کا ایک نوجوان ہے جو باکردار، محنتی اور تعلیم یافتہ ہے اور روزگار کی تلاش میں کبھی یہاں اور کبھی وہاں کا چکر لگاتا رہتا ہے۔ وہ غیر مستقل اور پرائیویٹ نوکریوں کے سہارے اپنی زندگی کو آگے بڑھانے میں پوری تگ و دو کے ساتھ گامزن ہے۔ بہت کوششوں کے بعد وہ قدیر ماموں کے توسط سے امریکہ پہنچتا ہے۔ اپنی مختلف ملازمتوں کے دوران وہ زندگی کے مختلف مشاہدوں اور تجربوں سے ہم کنار ہوتا ہے۔ اس صارفی دنیا میں جو نشیب و فراز ہیں اُن کا وہ سامنا کرتا ہے اور کبھی خوشی، کبھی غم کی کیفیات سے دو چار ہوتا رہتا ہے۔ اس ناول میں کئی ایسے ضمنی کردار ہیں جو ناول کی معنویت بڑھانے اور اسے ہمہ گیر بنانے میں نہایت اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ان میں ایک کردار راشد کے والد کا ہے۔ وہ ایک غریب مگر صابر، تحمل پسند، انسانیت نواز، شریف النفس اور خدا ترس انسان ہیں جو موقع بہ موقع راشد کی رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ ان کے پاس جو غریب والدین اپنی لائق اور نالائق اولادوں کو بغرض تعلیم لے کر آتے ہیں۔ اس میں وہ اُن والدین کی حتی الامکان مدد کرتے ہیں اور انہیں کو چنگ میں پڑھانے پر راشد کو راضی کر لیتے ہیں۔ راشد بھی کسی سعادت مند اولاد کی طرح ان کے ہر حکم اور ان کی ہر خواہش پر اپنا سر جھکا دیتا ہے۔ ناول کا دوسرا اہم ضمنی کردار قدیر ماموں کا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کامیابی حاصل کرنے اور امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں اپنے قدم جمانے کے لیے پٹنہ میں deputed ایک امریکی نژاد لائبریرین سے کورٹ میرج کر لی تاکہ امریکہ جیسی جنت میں وہ آباد ہو سکیں اور اپنی پیشانی پر امریکہ کا لیبل لگا سکیں قدید ماموں سے وابستہ جو کہانی ہے وہ جگہ جگہ انہیں خود غرض ثابت کرتی ہے۔ اس سے ان کے منفی چہرے سامنے آ جاتے ہیں۔ مگر ان کا کردار ناول کی ہمہ گیریت اور جاذبیت میں اضافہ کرتا ہے اور یہی وہ کردار ہے جس سے ناول میں افسانویت قائم ہوتی ہے۔ یوں تو یہ ناول مسلمانوں کا نوحہ یا ان کی سرگزشت معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس نوحے میں بھی غم اور فکر کی جو لہر ہے اور اس سے جو سوز پیدا ہوتا ہے وہ اس ناول کو اس کے تقاضے اور مفاہیم سے ہم کنار کرتا ہے۔ تیسرا اہم ضمنی کردار سبکدوش امیریکن پروفیسر کا ہے جو نہایت دانش ور اور باصلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ مخلص اور انسان دوست ہیں۔ پروفیسر کے کردار کی اہمیت اس طرح سے اور بڑھ جاتی ہے کہ ایک سچا امریکن ہونے کے باوجود انہوں نے امریکی حکومت کی پالیسیوں کے سامنے کبھی بھی اپنا سر نہیں جھکایا۔ وہ انسانیت میں یقین رکھتے ہیں۔ راشد سے گفتگو کے درمیان پروفیسر امریکی حکومت کی مراعات نہ لینے کے سلسلے سے کہتے ہیں۔

''بھائی، وہ تو کچھ نہیں کہیں گے، اُن کی ہمت ہی نہیں مگر میری زبان، میرا قلم ان کی مہربانیوں کے باعث خاموش ہو جائیں گے، صرف سوچ باقی رہے گی، وہ بھی زبان اور قلم کے بغیر زنگ آلود ہو جائے گی۔ ان سب کی پالیسیاں مجھے پسند نہیں بلکہ ان سے سخت اختلاف ہے۔.....''

پروفیسر آگے بولتے ہیں۔

''بات یہ ہے بیٹے کہ ان کی اکثر پالیسیاں مجھے بالکل پسند نہیں اور مجھے کیا امریکہ کے زیادہ تر لوگوں کو پسند نہیں، مگر مجبوری یہ ہے کہ ہم ایک بار انہیں چُن کر اپنے ہاتھ کاٹ لیتے ہیں۔'' (ص ۳۱۷)

پروفیسر کی اسی صاف گوئی اور انسانیت نوازی نے راشد کو ان کا اس قدر گرویدہ کر دیا کہ جب وہ امریکہ سے واپس آنے لگا تو اسے یوں محسوس ہوا کہ اگر وہ پروفیسر سے نہ ملتا تو اس کا امریکہ آنا بے معنی ہوتا۔ مذکورہ بالا تین اہم ضمنی کرداروں کے علاوہ ایک نہایت اہم کردار آفرین کا ہے۔ حالانکہ ناول میں اس کی مداخلت بہت کم ہوئی ہے مگر وہ راشد کے اعصاب پر اس قدر حاوی ہے کہ اسے ناول سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ آفرین، راشد کی خالہ زاد بہن ہے۔ ان دونوں کی پرورش ایک ہی گھر آنگن میں ہوئی ہے۔ راشد اسے پسند کرتا ہے اور اس سے محبت بھی کرتا ہے۔ وہ بذاتِ خود ایک خوبصورت، پُرکشش گھریلو لڑکی ہے۔ آفرین بھی اسے پسند کرتی ہے۔ مگر ان کی محبت حیا کی پروردہ ہے۔ راشد اپنی زندگی کی ہر بھاگ دوڑ میں آفرین کے نازک ہاتھ کا سہارا محسوس کرتا ہے اور امریکہ جانے سے پہلے ان دونوں کا رشتہ بھی طے ہو جاتا ہے۔ ہندوستان سے لے کر امریکہ تک وہ آفرین کو محسوس کرتے ہوئے زندگی کی شاہراہ پر گامزن ہے۔ مگر افسوس کہ ان دونوں کی محبت حقیقت میں نہیں بدلتی اور کہانی آدھی ہی رہ جاتی ہے۔ مندرجہ بالا کرداروں کے علاوہ کئی اور ایسے کردار ہیں جو ناول کی کہانی کو رفتار عطا کرتے ہیں۔ ان میں راشد سے پڑھنے کے لیے آنے والے وہ بچے بھی ہیں جو پڑھنے کے لیے کم اور وقت گزاری کے لیے زیادہ آتے ہیں۔ ایک قابلِ ذکر کردار قدیر ماموں کی پہلی بیوی امریکن لائبریرین کا ہے جسے امریکہ میں جمنے کے بعد قدیر ماموں چھوڑ دیتے ہیں۔ ایک اور قابلِ بیان کردار قدیر ماموں کی دوسری بیوی (جوان کی خالہ زاد بہن ہیں) کا ہے جنہیں پاگل مشہور کر کے قدیر ماموں کمرے میں بند رکھتے تھے۔ پھر ان کے دو پوتے راحیل اور قبیل کا کردار بھی قابلِ ذکر ہے۔ ان معصوم کرداروں کے نفسیاتی پہلو پر کچھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے علاوہ کالج کے دنوں کے چند کردار ہیں جن کی سازشوں کا وہ شکار ہوتا رہا۔ کمپنی کے منیجر کا کردار بھی اہم ہے۔ غرض یہ

سبھی کردار مل کر ناول کو ہمہ گیر اور ضخیم بنانے میں معاون ہوئے ہیں۔

زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ ایک کامیاب ناول ہے۔ پورا ناول سادہ اور سہل انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس میں مصنف نے بیانیہ تکنیک اپنائی ہے۔ ایک حد تک پیشہ وارانہ زبان سے بھی گریز کیا گیا ہے۔ عام بول چال کی گفتگو میں پورا ناول اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔ اس میں جا بہ جا گھریلو محاوروں اور روزمروں کا استعمال کیا گیا ہے جس سے فطری پن کے عناصر در آئے ہیں۔ مصنف نے انسانی حسیب کی باریک سے باریک باتوں اور جزئیات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے کیف و سرور بھی حاصل ہوتا ہے اور انسانی نفسیات اور اس کی سوچ و فکر پر سے ہٹتے ہوئے پردے سے ایک انجانا اور سہا سہا سا خوف بھی محسوس ہوتا ہے۔ دراصل مصنف نے انسان کے ذہن و دل کے باطن کو طشت از بام کر ڈالا ہے۔ اس سے انسانی حرکات و سکنات پر مصنف کے گہرے فہم و شعور کا پتہ چلتا ہے۔ مصنف نے اس قدر چابکدستی کے ساتھ کہانی کا نقشہ بیان کیا ہے کہ کہیں رکنے اور ٹھہرنے کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ body languages کو بھی الفاظ کے لبادے میں خاطر خواہ طریقے سے پیش کیا گیا ہے جس سے ناول کی معنویت میں خاصا اضافہ ہو گیا ہے۔ حالات اور معاشرے کے پیش نظر جگہ جگہ انگریزی الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں جو کہانی کی تفہیم میں مددگار ہیں۔ حالانکہ ناول میں کہانی کے بیان کی رفتار تیز ہونے کے سبب کہیں کہیں املے کی غلطیاں اور تذکیر و تانیث کی اُلٹ پھیر سرزد ہو گئی ہے۔ بہر کیف واقعہ کی رفتار قاری کو اس میں زیادہ دیر اٹکنے نہیں دیتی۔ کہانی کے ہر موڑ پر ایک نیا تجسّس موجود ہے جو قاری کو قرأت میں منہمک رکھتا ہے۔

غرض یہ ناول مسائل و موضوعات کے ساتھ ساتھ کردار نگاری اور زبان و بیان کے اعتبار سے بھی ایک کامیاب ناول ہے۔ اس میں جہاں مسلمانوں کے بنیادی مسائل کو جگہ دی گئی ہے وہیں ہندوستانی سیاست کے کھوکھلے چہرے پر سے بھی نقاب اُٹھایا گیا ہے۔ انسانی نفسیات کے باریک سے باریک پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ دہشت گردی جیسے عالمی مسئلے کو شامل کر کے ناول کو آفاقیت عطا کی گئی ہے۔

◂◂ ● ▸▸

Assistant Prof(Urdu,Guest Faculty)
B.B.A.Bihar University
Muzaffarpur(Bihar)
9386134522

● نیر و سید

شمیم حنفی کے ڈراموں کا فنی مطالعہ

اردو ادب کی تاریخ میں خصوصاً صنف ڈراما کے میدان میں شمیم حنفی کا نام بطور ڈراما نگار کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ اس عہد میں ڈراما نگاری کی طرف متوجہ ہوئے جب یہ صنف ادب (ڈراما) اپنی جبلی پہچان کھو رہی تھی۔ آپ نے اس صنف کو نہ صرف مقبول عام کیا بلکہ اس کی فنی قدر و قیمت کا احساس بھی دلایا۔ آپ لکھتے ہیں۔

''اب تک جو کچھ لکھا ہے، اسے جو نام بھی دیا جائے، شعر، تنقید، ڈراما وہ سب کا سب میرے لئے ایک آپ بیتی کا حصہ ہے، ناقص، نامکمل اور ایک حد تک نامربوط جب تک کوئی لمحہ واقعہ واردات یا لفظ، میرا تجربہ نہ بنے، مجھ پر اس کے معنی نہیں کھلتے یہ ڈرامے ان لمحوں، موسموں، مناظر اور کرداروں ے تجربے ہیں جن سے میرا تعارف اپنے حواس کے وسیلے سے ہوا اور اسی واسطے میرا نیا تجربہ بھی ہے۔ اس تجربے تک رسائی میں کوئی دیوار آڑے نہ آئی۔ سیاسی سماجی، اقتصادی، تہذیبی، ذاتی اور اجتماعی اس کی سطح اور نوعیت کچھ بھی ہو میں نے ہر واردات کو ایک انسانی صورتِ حال کے طور پر دیکھنے اور پھر اسے ایک نئے تماشے کا روپ دینے کے جتن کئے ہیں۔''(۱)

جہاں تک شمیم حنفی کے ڈراموں میں پلاٹ کا تعلق ہے تو انھوں نے اپنے ڈراموں کے پلاٹ میں نوجوان نسل اور بزرگوں میں جو ایک رسا کشی ہے، اس سے گریز کرنے کی ترغیب دی ہے۔ شمیم حنفی کا ماننا ہے کہ صحت مند روایت کو بھی نوجوانوں کو اپنانا چاہئے اور ساتھ ہی ساتھ پرانے لوگوں کو بھی نئی اور جدید ایجادات کو قبول کرنے میں ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہئے۔ شمیم حنفی نے دراصل اپنے ڈراموں اور تخلیقات کے وسیلے سے بزرگوں اور نوجوانوں میں ایک قسم کی ذہنی ہم آہنگی کو پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ جہاں نئی اور پرانی نسل کے درمیان فکر و نظر کے تصادم و تضاد کو پیش کرتے ہیں وہیں قدیم و جدید افکار و اقدار اور عصر حاضر کے رسم و رواج کی معنویت پر سوالیہ نشان بھی قائم کرتے ہیں۔ آپ کے ڈراموں کے پلاٹ میں

انسانی وجود کی بے ثباتی، درد و کرب کی ہولناکیوں کے ساتھ ہی انسانی زندگی میں آئے دن پیش آنے والی روداد شامل ہیں۔ جس سے سماجی و معاشرہ دن بہ دن زوال پذیری کی راہوں پر گامزن ہو رہا ہے اور اس زوال پذیری کا روح رواں وہ موجودہ دور کے انسان ہی کو ٹھہراتے ہیں۔ آپ نے انسان کے خارجیت سے زیادہ داخلیت پر زور صرف کیا اور ان عوامل کا سراغ لگانے کی کوشش کی جن کی بدولت آج ک انسان بے بسی اور لاچاری کی زندگی جینے پر مجبور ہوتا جا رہا ہے۔ اور ایسے کئی سوالات موجودہ دور کے انسان کے سامنے کھڑے ہیں کہ آخر کیوں اور کن وجوہات کی بنا پر عہد رواں کا انسان بے بسی کی زندگی جینے پر مجبور ہوتا جا رہا ہے۔ آپ نے اپنے ڈراموں میں ایسے کئی سوالات کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جن میں ڈراما ''مٹی کا بلاوا'' زندگی کی طرف پانچویں سمت اور چوراہا وغیرہ کو اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ آپ نے ان ڈراموں میں روایتی، زمین دار طبقہ کی تہذیبی و تمدنی اور معاشرتی، اخلاق و اقدار کے ساتھ ہی جدید تعلیم یافتہ طبقے کی فکر و نظر کو بھی پیش کیا ہے۔ ان کے درمیان تصادم و تضاد کی نوعیت اور نتائج کو سنجیدہ فکر اور واضح شعور کے ساتھ سامنے لانے کی کامیاب و کامران کوشش کی ہے۔

شمیم حنفی نے اپنے ڈراموں کے ذریعے سے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ بزرگ جو اپنے ماضی سے نہ صرف محبت کرتے ہیں بلکہ اُسے اپنے سینے سے لگائے رکھتے ہیں، اُن کے برعکس نوجوان جن کا تعلق نئی نسل سے ہے ماضی پرستی سے نہ صرف انحراف کرتے ہیں بلکہ بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے آپ کے ڈراموں کے پلاٹ میں ایک انوکھی کشمکش اور چشمک پائی جاتی ہے جسے روح عصر کا نام دیا جا سکتا ہے۔ آپ کے ڈراموں کے متعلق پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں:

''شمیم حنفی صاحب نے ڈرامے کو عصر حاضر کے مسائل سے ہم آہنگ کر کے اسے ایک ادبی دستاویز کا درجہ دیا۔''(۲)

جہاں تک شمیم حنفی کے ڈراموں میں کردار نگاری کا تعلق ہے تو انھوں نے اپنے کرداروں کو آسمان کی بلندیوں سے نہیں اتارا بلکہ عام گوشت پوست کے کرداروں کو اپنی تخلیقات میں پیش کیا۔ جنھیں انھوں نے سماج کے نچلے اور متوسط طبقے سے لیا ہے اور انھیں ریڈیو ڈرامے کی فن اور تکنیک کے مطابق ڈھالنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ آپ نے اکثر اپنے ڈراموں کے لئے ایسے کرداروں کا انتخاب کیا ہے جو اپنی انفرادی اور سماجی معنویت کے حامل نہ ہو۔ نیز یہ کہ ان کرداروں کی سماجی معنویت کے ساتھ ہی ساتھ وہ بھی بدلتے رہے ہیں اور اپنے ماضی کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ مثلاً ڈراما ''مٹی کا بلاوا'' کا واحد کردار میر غیاث حسین جو اپنی اولاد، فرحت اور روحی کی خوشی کے لئے ہر پل لمحہ تیار رہتا ہے اور ان کو ہر سہولیت فراہم کرتا ہے۔ وہ

زندگی میر غیاث حسین کے لئے کوفت و درد اور کسک کی زندگی سے کسی بھی طرح کم نہیں مگر اس کے باوجود بھی وہ فرحت اور روحی کا ساتھ دینے سے انکار نہیں کرتے۔ اور آخر میں ماضی کی یادوں میں خود کو مقید کر لیتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''میر صاحب (: افسردہ ہنسی کے ساتھ) اس میں تمہاری بھی کچھ غلطی نہیں بیٹے! تم ان لمحوں میں زندگی گزار رہے ہو جو میرے کمزور بازوؤں کی دسترس سے بہت دور ہیں۔ اور میں اب تک ان لمحوں کی گرفت میں ہوں جو شاید تمہارے نزدیک بیتے موسموں کا قصہ بن چکے ہیں۔''

جاوید: ابا جی جس لمحے کے زندانی ہیں وہ ہمارے لئے افسانہ ہے۔ ان کے لئے حقیقت، ہم جس ساعت کی سمت آنکھیں اٹھائے ہوئے ہیں وہ ان کے نزدیک واہمہ ہے۔ ہمارے لئے سچائی.....وہ کتنی اضطراب آسا ہے۔'' (۳)

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شمیم حنفی کی کردار نگاری کے فن کا ایک خاص جزو یہ ہے کہ ان کے کردار خواہ اپنے ذہنی تناؤ یا زندگی کے کسی موڑ پر کھڑے کیوں نہ ہوں وہ کسی بھی جمود کا شکار نہیں ہوتے۔ کردار نگاری کے اعتبار سے آپ کے ڈرامے نہ صرف اہم ہیں بلکہ قابل داد بھی ہیں۔ ہر کردار کی نہ صرف اپنی انفرادیت اور امتیازی شان ہے بلکہ آپ کی عرق ریزی، باریک بینی اور فن کارانہ بصیرت کے مظہر ہیں۔

ریڈیو ڈرامے کی روح مکالمے ہوتے ہیں۔ کوئی بھی ڈراما مکالموں کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ ڈرامے میں مکالموں کے ذریعے واقعات کا انکشاف ہوتا ہے اور ڈرامے کا پلاٹ ارتقائی منازل طے کرتا ہے۔ مکالموں کے ہی ذریعے کردار کی شخصیت، سیرت و اخلاق واضح ہوتے ہیں اور ان کو استحکام ملتا ہے۔ جہاں تک شمیم حنفی کے ڈراموں میں مکالموں کا تعلق ہے آپ کے انتخاب کردہ مکالمے بہت جاندار ہوتے ہیں۔ آپ نے اپنے کرداروں سے جو مکالمے ادا کروائے ہیں ان سے کرداروں کے چال چلن اور شخصیت و سیرت کے ساتھ ساتھ اُن کے نظریات و تصورات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس سے کردار کے خیالات و تصورات، جذبات و احساسات کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ شمیم حنفی نے اپنے تخلیق کیے ہوئے کرداروں کے ذریعے سے علامتی انداز میں بہت سی باتیں واضح کی ہیں۔ یہ علامتی فضا ان کے مکالموں میں زیادہ سنائی دیتی ہے۔ جو فرحت (پانچویں سمت) نپولین (جزیروں سے آگے) الف (پانی پانی) جیسے کرداروں کے مکالموں میں اپنے پورے شباب پر نظر آتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو

فرحت: میں سوچ رہا تھا بچو بابا کہ پرانی چیزیں کھوئے بغیر نئی چیزیں ہاتھ نہیں آتیں۔ پیڑ کٹ گیا نا۔

الف: پتھر؟ سب پتھر! کل پتھر! آج پتھر! آج کل پتھر'' (۵)

نپولین۔ انسان طاقت کی زبان سمجھتا ہے لارنس طاقت جو لفظوں سے آگے ہے۔ لفظ تک اس حد کو نہیں پہنچے۔ مجھے لگتا ہے سب کے سب سوچنے والے، تم اور وہ اور وہ اور وہ، سب ذہنی قبض میں مبتلا ہیں، تم بس ڈکاریں لیتے رہو، یہ بھی تو سوچو کہ ڈکار پیٹ کی خرابی کا اظہار ہے۔ علاج نہیں۔'' (۶)

چونکہ ڈراما زندگی کا آئینہ ہے اس لئے کردار کے عمل اور اس کی ذات کی زیریں لہروں تک رسائی مکالموں کے ذریعے ہوتی ہے یعنی بھرپور کردار کا انحصار مکالمے پر ہے۔ ہر کردار کی زبان ہر کردار کی زبان سے ادا ہونے والے کرداروں کی شخصیت کو ناظرین کے سامنے روشن کر دیتے ہیں اور یہی شمیم حنفی کے ڈراموں کی اہم خصوصیت ہے جو ان کے فن کی عظمت کی معراج ہیں۔

جہاں تک ریڈیو ڈرامے میں طوالت اور اختیار کا تعلق ہے تو ریڈیو ڈرامے میں کم سے کم واقعات کو پیش کیا جاتا ہے۔ شمیم حنفی نے ریڈیو ڈرامے کے اس بنیادی عنصر کو ذہن میں رکھ کر ہی اپنے ڈراموں کی کہانیوں کو تخلیق و تشکیل کیا۔ آپ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ریڈیو ڈراما میں سامعین کو فوراً اپنی طرف متوجہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس لئے آپ اپنے ڈراموں میں کوئی ایسی بات یا مکالمہ جو ڈرامے کی طوالت کو مجروح کرتا ہو اس سے گریز کرتے ہیں اور اس میں آپ کامیاب بھی ہیں۔

ریڈیو ڈرامے میں تخیل، صوتی اثرات اور موسیقی، مکالموں کے بعد نمایاں رول ادا کرتے ہیں۔ چونکہ ریڈیو ڈراما سماعتی فن ہے یہاں تخیل صوتی اثرات اور موسیقی کی مدد سے ہی ڈراما کے ماحول، جذبات، مناظر اور پس منظر سے مکالموں میں جان ڈالی جاتی ہے۔ ان ہی کی مدد سے دوری نزدیکی، بلندی پستی، ریگستان اور ویران جگہوں وغیرہ کا پتہ چلتا ہے انہی کی بدولت نہ صرف قول و فعل بلکہ نکات و سکنات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ شمیم حنفی نے ان ہی اثرات کا سہارا لے کر کرداروں کے خدوخال، جذبات و احساسات، غم و الم، خوشی و شادمانی کے جذبات کو نمایاں کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

سجدہ بیگم۔ (کانپتے ہوئے لہجے میں) بات کیا.....؟ وہ جاگ گئے.....جاگ گئے

وہ ابھی مشتاق کو آواز دے رہے تھے.....جاگ گئے وہ.....جاگ گئے۔ اللہ اب کیا ہوگا؟

(کھانسی کا دورہ پڑ جاتا ہے) فیڈ آؤٹ

فیڈ ان (رات کا سناٹا۔ دور کتوں کے بھونکنے کا شور، دو بجتے ہیں۔)

دادی اماں دھیرے دھیرے کراہ رہی ہیں۔ پھر اٹھ بیٹھتی ہیں۔ اچانک سانس کی

رفتار تیز ہو جاتی ہے۔

مجیب میاں (چونک کر) اماں.....اماں؟

دادی اماں.....کراہتے ہوئے۔ ہاں بیٹے۔ (ہانپنے لگتی ہے) (۲)

اس اقتباس سے یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ پہلا منظر ختم ہو چکا ہے اور دوسرا شروع ہونے جا رہا ہے۔ اس لئے شمیم حنفی نے نیا منظر شروع کرنے کے لئے رات کے سناٹوں کا سہارا لیا ہے اور رات کے ٹھیک دو بجتے ہیں تو کتوں کا بھونکنا فطری امر ہے۔ موسیقی کے زیر و بم کا سہارا لے کر اپنے کرداروں کے جذبات واحساسات اور خدوخال نمایاں طور پر سننے والوں کے سامنے ابھارتے ہیں۔ اس تکنیک کا بھرپور استعمال کر کے انھوں نے اپنے ڈراموں کی فنی قدر و قیمت کو ابھارا ہے۔

جہاں تک شمیم حنفی کے ڈراموں میں زبان واسلوب کا تعلق ہے تو انھوں نے نے نہ صرف روایتی زبان استعمال کی ہے بلکہ تخلیقی زبان کا سہارا لے کر اپنے ڈراموں کا مستقبل درخشاں بنا دیا۔ اپ نے مقفع و مسجع عبارت آرائی سے گریز کرتے ہوئے سادہ، مستقبل اور عام فہم زبان سے اپنے ڈراموں کو آراستہ کیا۔ اقتباس ملاحظہ ہو۔

غفور۔ آدھر کئی چھٹی آئی

حکیم صاحب۔ آئی تھی

غفور۔ آپ نے مجھے بتایا نہیں

حکیم صاحب۔ (بے دھیانی سے) بھول گیا ہوں گا بھائی

غفور۔ میرے بارے میں کچھ لکھا ہے حکم جی؟

حکیم صاحب۔ ہاں

غفور۔ ملکن اور میزہ بی بی اور جاوید تو ٹھیک ہیں نا؟

حکیم صاحب۔ ہاں (دھیرے سے) سب ٹھیک ہے

غفور۔ (حیرت سے) پندرہ سو

حکیم صاحب۔ ہاں

غفور۔ اتنے میں تو انسان سونے کی دیوار کھڑی کرے! ہے نا حکیم صاحب'' (۸)

شمیم حنفی نے اپنے کرداروں کو اسی معاشرے کی زبان عطا کی ہے جس معاشرے میں رہ کر وہ زندگی کے تمام نشیب و فراز اور ان سے ہم کنار و ہم آہنگ ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شمیم حنفی نے کرداروں کو ایک عجیب و رانوکھے زبان و آہنگ اور جس جدید اسلوب سے آراستہ کیا وہ عام

وفہم، سلیس اور رواں ہے۔ البتہ علامتی اور تجریدی عناصر زیادہ نمایاں ہے۔ ہر بات کو ذو معنوں میں تحریر کیا ہے۔ یہ نجی وصف فنکار کی زبان واسلوب کو نہ صرف نکھارتا ہے بلکہ آپ کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کو نمایاں اور روشن بھی کرتا ہے۔ جو آپ کے ڈراموں کی زبان واسلوب کے روشن مستقبل کا مظہر ہے۔

آپ کے ڈراموں کا فنی اور تکنیکی اعتبار سے جائزہ لینے کے بعد مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے اپنے ڈراموں کا مواد دور رواں کے واقعات وحالات سے اخذ کیا اور انھیں کو پیش نظر رکھ کر ڈرامے تخلیق کیے۔ اور عصری تقاضوں کے مطابق واقعاتی اور تاثراتی ارتقا کے تمام اصولوں کو برتنے کی کامیاب کوشش کی اور ہر واقعہ بڑے مربوط، مسلسل اور دلکش انداز میں پیش کیا۔ پروفیسر مغنی لکھتے ہیں۔

۴''اردو میں ڈراما کی صنف کو زندہ رکھنے اور ترقی دینے میں شمیم حنفی کا گراں قدر حصہ رہا ہے۔ ڈرامے کے فن پر انھیں پوری دسترس حاصل ہے۔ انھوں نے زیادہ تر ریڈیائی ڈرامے لکھے جو نشر کئے جا چکے ہیں۔'' (۹)

حواشی

۱۔ بحوالہ ریڈیو نشریات، تاریخ اصناف اور پیشکش/ از پرشادات، ص ۲۸۰

۲۔ رسالہ ایوان اردو۔ اردو.....سمنار نمبر، اپریل ۱۹۹۶ء، ص ۱۰

۳۔ شمیم حنفی۔ مٹی کا بلاوا۔ ص ۲۴، ۳۹، ۴۰

۴۔ پانچویں سمت، ص ۹

۵۔ پانی پانی۔ ص ۱۲۳

۶۔ جزیروں سے آگے۔ ص ۱۱۶

۷۔ زندگی کی طرف، شمیم حنفی، ص ۴۳

۸۔ مٹی کا بلاوا، شمیم حنفی۔ ص ۲۹۔۳۰

۹۔ ماہنامہ سب رس، حیدر آباد، جلد ۶، شمارہ ۹، ستمبر ۱۹۹۸

Reasearch Scholar
Dept of Urdu,Jammu University,Jammu
908644132

● سجاد رشید

نسوانی جذبات کی شاعرہ..... پروین شاکر

اردو شاعری کے لئے یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ یہ صنف ہمیشہ انسانی جذبات واحساسات کی بہترین عکاسی کرتی آرہی ہے۔ ہر دور کے شاعروں نے اپنے سماج اور ماحول کی مطابقت سے اخذ کیے ہوئے مشاہدات کو اپنے احساسات کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ وہ چاہے مذہبی عقیدے ہوں یا سیاست کے بدلتے منظرنامے، عشق حقیقی ہو یا عشق مجازی، انسان کے داخلی احساسات ہوں یا دنیا کے خارجی حالات اردو شاعری نے اپنے ارتقائی سفر کے دوران بتدریج اپنے دامن کو ہر خیال اور موضوع سے زینت بخشی۔ اس طرح اردو شاعری نے ہمیشہ بدلتے ہوئے شعور کا ساتھ دیا اور وقت اور زمانے کے ساتھ ہونے والی تبدیلی کو مختلف صورتوں میں پیش کیا۔ شعراء کے ساتھ ساتھ شاعرات بھی اس میدان کی مسافر رہی اور ہیں۔ ان شاعرات میں سے ایک اہم نام پروین شاکر کا ہے جس نے اردو شاعری کو ایک منفرد لہجہ اور احساس دیا۔ ان کی شاعری اپنے عہد کا خوبصورت آئینہ اور ماضی کی روایت کا تسلسل ہے۔

پروین شاکر 24 نومبر 1952ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے اردو ادب میں چاشنی گھولتے ہوئے اشعار میں محبت کی خوشبو بکھیری۔ نازک احساسات سے بھرپور لفظوں کو دلوں میں پرونے والی حساس شاعرہ نے نسوانی جذبوں کو نہایت دلفریب انداز میں پیش کیا۔ ان کے استادِ محترم امجد اسلام امجد نے ان کی شاعری کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے:

''پروین کی شاعری میں ایک لڑکی کی آواز سنائی دے گی، ایک ایسی لڑکی
کی آواز جو خوبصورت پھول چننا بھی جانتی ہے اور انہیں گلدان میں سجانا بھی۔''

پروین شاکر سے پہلے اردو میں چند نامور خاتون شاعرات تھیں اور خود ان کے دور میں بھی ادا جعفری، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض وغیرہ اعلیٰ پائے کی خاتون شاعرات موجود تھیں، جن کی قدر پروین شاکر بھی دل سے کرتی تھیں۔ مگر اس کے باوجود اردو شاعری کو جو لہجہ پروین نے دیا، وہ سب سے اچھوتا، انوکھا اور دل چسپ تھا، انھوں نے صنفِ نازک کے مسائل، مشکلات، خانگی الجھنوں، انفرادی مشکلوں، معاشرتی

جکڑ بندیوں، حسن و عشق کی خاردار راہوں کی آبلہ پائیوں کا ذکر اپنی شاعری میں بڑے منفرد انداز میں کیا۔

پروین شاکر نے جب شاعری کے میدان میں قدم رکھا تب تک تقریباً عورت ہر طرح سے موضوعِ سخن بن چکی تھی۔ باوجود اس کے انہوں نے عورت کے کیفیات کی ان تاروں کو چھیڑا جن کی صداؤں نے ایوانِ غزل کے در و دیوار کو ہلا کے رکھ دیا۔ پروین شاکر نے اپنے منفرد لہجے اور انداز بیان سے جلد ہی اپنے قارئین کو متاثر کیا۔ انہوں نے سب کو یہ کہہ کر حیرت میں ڈال دیا:

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے

پروین شاکر کی شاعری میں نسوانیت کی گونج بھرپور سنائی دیتی ہے اور اس میں ان کی آپ بیتی کا احساس بھی ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں برصغیر کی ماں، بیٹی، بہن، بیوی غرض عورت کا ہر روپ نظر آتا ہے اور عورت کے ان سب رشتوں کے ذاتی جذبات اور خیالات کو انہوں نے نہایت ہی سلیقے اور ہنرمندی سے اپنی شاعری میں برتا ہے۔ خصوصاً ایک ازدواجی زندگی گزارنے والی عورت کی کیفیات کو انہوں نے جس طرح بیان کیا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ وہ اپنی شاعری میں ایک پوری نسائی حسیات کی تشکیل کرتی دکھائی دیتی ہے۔ نسائیت صرف یہ نہیں کہ گھر، آنگن اور سنگھار کی بات کی جائے بلکہ مونث جذبات کی مکمل تصویر کشی، خوشبو، رنگ، لمس و بصر، موسموں کی رنگینی اور رشتوں کے ذائقوں کا بیان ہے اور پروین شاکر کی شاعری ان نسوانی کیفیات کا باکمال اظہار ہے۔ عورت کا ایک روپ اسے چاہے جانا اور محبوب بن کے زندگی گزارنا ہے، جب کہ دوسرا روپ بطور عاشق پیش کرنا پروین شاکر کا خاصا ہے۔ اس نے روایتی شرم و حجاب کے برعکس نسوانی جذبات کی ترجمانی بھرپور انداز میں کی ہے۔ اس کے ہاں عورت کی طرف سے محبت کا اظہار پایا جاتا ہے جیسا کہ وہ کہتی ہیں:

مہ تمام! ابھی چھت پہ کون آیا تھا کہ جس کہ آگے تیری روشنی بھی ماند ہوئی

پروین شاکر اپنی شاعری میں حقوق نسواں کی سچی علم بردار اور صنفِ نازک کے جذبات و احساسات کی خوبصورت عکاسی کرتی ہے۔ جس کو لے کر وہ کبھی کبھی اپنی شاعری میں بے بس بھی نظر آتی ہے اگرچہ اسے اس بات کا بخوبی علم ہے کہ وہ حق کی بات کہہ رہی ہے، وہ حق کی پرستار ہیں، مگر پھر بھی وہ اپنی باتوں اور اپنے فیصلوں میں بے بس نظر آتی ہے لیکن ان فیصلوں میں نسوانی جذبات، معصومیت اور معاف کرنے کے اوصاف نظر آتے ہیں مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

یا یہ شعر:

وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو میرے پاس آیا بس یہی بات ہے اچھی میرے ہرجائی کی

اردو شاعری کے تقریباً تمام باکمال شعرا نے خواہ وہ میرؔ ہوں یا غالبؔ، مومنؔ ہوں یا فیضؔ نے اپنے محبوب کی سنگ دلی اور بے وفائی کا اپنے طریقے سے رونا رویا ہے، لیکن مندرجہ بالا دوسرے شعر میں جو "ہرجائی" لفظ استعمال ہوا ہے اس کا جواب نہیں۔ یوں تو "ہرجائی" شکایت اور ناراضگی کے لیے برتا جاتا ہے لیکن یہاں اس لفظ کا جو استعمال ہوا ہے اس نے پیار و محبت کی انتہا کر دی ہے۔ علاوہ ازیں ان کے ایسے بیشتر اشعار میں گہرائی و گیرائی کا وصف بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی تجربات، شدتِ جذبات اور مشاہدے کی گہرائی کے لیے بڑی ہی چابکدستی اور چترائی سے لفظیات کا انتخاب کر کے انہیں اشعار میں پیروتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا یہ ایک مصرعہ دیکھیے:

بال سکھانے کے موسم ان پڑھ ہوتے ہیں

یا یہ شعر:

تجھے مناؤں کہ اپنی انا کی بات سنوں الجھ رہا ہے مرے فیصلوں کا ریشم پھر

اس شعر میں عورت کے فیصلے کی کشمکش کے لیے ریشم کے الجھنے سے جو مناسب دی گئی ہے اسے انکی نسائی مشاہدات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ پروینؔ شاکر نے محبوب کی بے رخی، بے توجہی، عدمِ التفات یا بے وفائی کو بھی اپنی شاعری میں جگہ جگہ بیان کیا ہے، مگر یہاں بھی وہ طرزِ ادا میں دیگر شعرا سے ممتاز ہیں۔ اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے ان کا لہجہ شاکیانہ تو ہے ہی، مگر ملتجیانہ اور پرامید بھی ہے،۔ وہ محبوب کی بے رخی سے دل گیر ہوتی ہیں۔ مگر در پردہ اس کا اظہار بھی کرتی ہیں کہ وہ کسی نہ کسی صورت ان کی طرف متوجہ ہو:

اب تو اس راہ سے وہ شخص گزرتا بھی نہیں اب کس امید پہ دروازے سے جھانکے کوئی
اسی کوچے میں کئی اس کے شناسا بھی تو ہیں وہ کسی اور سے ملنے کے بہانے آئے

غزل میں پروینؔ شاکر کی انفرادیت کا سبب ان کی موضوعاتی جدت ہے۔ انہوں نے نسوانی جذبات و احساسات کو حقیقی انداز میں غزل میں پیش کیا۔ ان کے ہاں چاہت، رفاقت، ملاقات، جدائی، فراق، جذبے اور احساسات نئے انداز اور جدید دور کے تناظر میں محرک ملتے ہیں۔ اگرچہ ان کی غزل میں یوں لگتا ہے کہ انھوں نے میرابائی کے گیت کا رنگ اپنا لیا ہے جو کہ ماضی سے وابستگی اور تسلسل کی بنا پر ہے، مگر یہ ان کی جذبوں کی صداقت ہے جو انھیں یہ رنگ اپنانے پر مجبور کرتا ہے۔ پروینؔ شاکر نے بھرپور طریقے سے نسوانی احساسات کا اظہار کیا ہے۔ وہ عشق کی جسمانی اور محسوساتی کیفیات کا بیان بڑی خوبصورتی سے کرتی ہے جیسا کہ یہ شعر ہے۔

اس نے جلتی ہوئی پیشانی پر جب ہاتھ رکھا روح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی

پروینؔ شاکر نے گھر آنگن کے تصور کو بھی اپنی شاعری کا جزو بنایا ہے۔ بعض شعراء نے بھی اسے

برتنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔ پر چونکہ خواتین اسی ماحول کی پروردہ ہوتی ہیں۔ انہیں اپنے شعور کے ساتھ آنگن، در و دیوار، صحن اور لان کی وسعت کو وابستہ رکھنا پڑتا ہے اس لئے وہ کہیں بھی رہیں یہ احساس ان کے تعاقب میں رہتا ہے۔ ان کی شاعری میں گھر آنگن کے کنوارے پن کی مہک بھی ہے اور ازدواجی زندگی کے رنگ بھی، عشق کے آزار بھی ہیں اور سکھیوں کو ہم راز بنا کر ان سے حال دل کہنے اور شرارتوں نیز چھیڑ چھاڑ برداشت کرنے کا حوصلہ بھی اور تنہائی میں محبوب کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دینا بھی۔ بطور مثال چند اشعار:

ایک اک کر کے مجھے چھوڑ گئیں سب سکھیاں آج میں خود کو تری یاد میں تنہا دیکھوں
گلابی پاؤں مرے چمپئی بناتے کو کسی نے صحن میں مہندی کی باڑھ اُگائی ہو
کسے بلاتی ہیں آنگن کی چمپئی شامیں کہ وہ اب اپنے نئے گھر میں بھی پرانا ہوا

سکھیاں، مہندی کی باڑھ، صحن، چمپئی شامیں سے جو تصور سامنے آتا ہے وہ ایک مکمل گھر کا ہے۔ اس گھر میں وہ سب کچھ ہے جس سے اس کی تعبیر و تشکیل ہوتی ہے۔

پروینؔ شاکر کی شاعری میں نسوانی کردار کی پیش کش ان کی انفرادیت کی عکاس ہے کیونکہ انہوں نے شاعری میں اپنی حقیقی ذات کو پیش کیا۔ انہوں نے وہی کچھ لکھا جو ان کی ذات ان سے لکھوا رہی تھی۔ انہوں نے ہوس کے اس دور میں حق و صداقت کا ساتھ دیا، مشرقیت کا ساتھ نبھایا، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اپنی روایات کا بھرم رکھا۔ حتیٰ کے والدین کی خوشی اور رضا کے لیے اپنی محبت کی قربانی دی۔ والدین کی مرضی سے شادی کرتی ہے تو شوہر سسرال کی طرف سے مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے وہ مشرقی عورت کی صورت اپنے سسرال اور شوہر کو خوش رکھنے کے لیے گھر کے کام کاج تک کرتی ہے، مگر انجام کار طلاق کا داغ دامن گیر ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ عزم و ہمت کا پیکر مسلسل گردش پیہم کا سامنا کرتے ہوئے زندگی کی روش پر چلتی ہے۔ سماج کے اس تاریک پہلو اور المیے کے تئیں ان کا یہ شعر ملاحظہ ہوں:

طلاق دے تو رہے ہو مجھے غرور و قہر کے ساتھ میرا شباب بھی لوٹا دو میرے مہر کے ساتھ
موسم کا عذاب چل رہا ہے بارش میں گلاب جل رہا ہے

ایک عورت جو طلاق کے کرب سے گزر رہی ہو اس دوران وہ کن احساسات اور کیفیات کا شکار ہوتی ہے، ان کے اندرونی تخیل کے تلاطم کو ان اشعار سے بخوبی سمجھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس کرب کا جہاں ان کو ایک طرف غم ہے وہیں دوسری طرف اس سے ہونے والی رسوائی کا ڈر بھی ہے اور اس ڈر کی شدت کو ان کے اس شعر سے بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے:

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

اس شعر کو غور سے دیکھا جائے تو آپ کو ڈر کے احساس کے ساتھ ساتھ ایک بالغ النظری کا ادراک بھی ہوگا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں جو تلخ فیصلے لیے تھے ان کی عکاسی ان کی شاعری میں بخوبی نظر آتی ہے۔ مگر وہ ان تلخ فیصلوں سے بہتر اور آزاد زندگی گزرنے کا ہنر بھی جانتی ہے۔ انہیں زندگی کا ہر فیصلہ منظور ہے۔ بطور مثال یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

بچھڑتے وقت دلوں کو اگرچہ دکھ تو ہوا کھلی ہوا میں مگر سانس لینا اچھا لگا
دشت و دریا سے گزرنا ہو کہ گھر میں رہنا اب تو ہر حال میں ہے ہم کو سفر میں رہنا

ان اشعار سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ انہیں زندگی کا ہر فیصلہ منظور ہے۔ وہ حالات کے ساتھ سمجھوتا کرنا بھی جانتی ہیں اور ان سے اچھے نتائج اخذ کرنا بھی۔

پروین شاکر کی شاعری میں ایک اور نسائی احساس "ممتا کا جذبہ" ہے۔ ممتا کا جذبہ محبت کے حسین ترین رنگوں میں سے ایک رنگ ہے۔ ازدواجی زندگی میں قدم رکھنے سے قبل دوشیزہ کے خوابوں کے شہزادے کے ساتھ ایک معصوم سے پیکر کا ہولیہ بھی ابھرتا ہے۔ جوں جوں محبوب کی قربت کا لمحہ قریب آتا ہے، یہ جذبہ حقیقت کے پیکر میں ڈھلنے لگتا ہے۔ جب پروین شاکر کا اوّلین مجموعہ "خوشبو" منظر عام پر آیا تو وہ ڈاکٹر نصیر علی کی شریک حیات بن چکی تھیں۔ اس وقت ننھے دوست کا جو خاکہ ان کے ذہن میں تھا اسے انہوں نے اس طرح بیان کیا ہے:

گھنے درختوں کی سبز شاخوں پر کھلنے والے حسین شگوفے
سنا ہے
تیرے گلاب چہرے کو برف باری کی رت سے نرگس بنا دیتا ہے
سو ننھی کونپل! اداس مت ہو
کہ تیرے رخسار کی شفق کو
کبھی بھی دست شب زمستان نہ چھو پائے گا
جوان جسموں کی مشترک دھڑکنوں کا پہلا جمیل نغمہ
جوان راتوں کی کوکھ سے پھوٹتا ہوا پہلا چاند ہے تو

یہاں شگوفہ، ننھی کونپل، ابر بہار کی پہلی سانس، جواں جسموں کی مشترک دھڑکنوں کا اولین نغمہ جمیل اور زندگی کے نئے افق کا استعارہ جس پیکر کی تخلیق کر رہا ہے اس میں معصومیت اور ممتا کے تمام رنگ بیک وقت نظر آتے ہیں۔ اس اجنبی سے اگرچہ کوئی رشتہ نہیں ہے پھر بھی اس میں پروین شاکر کو اپنے بیٹے کا

عکس نظر آتا ہے۔ اسی لئے وہ اسے دعا دینے سے بھی گریز نہیں کرتیں۔ زرد راتوں کے بیت جانے اور سبز موسم کے قریب آنے کی نوید کے ساتھ یہاں دست بہار کے ملنے کی دعا بھی ہے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس وجود نے کس حد تک شاعرہ کے دل میں گھر کر لیا ہے۔

پروین شاکر عورت کی نفسیات اور اس کے جذباتی و ذہنی رویے اور کشاکش کا ذکر کرتی ہیں تو ان کے اسلوب اور لہجے میں طنز کا پہلو نمایاں ہو جاتا ہے، جس میں بلا کی کاٹ ہے۔ صد برگ تک پہنچتے پہنچتے پروین شاکر کی محبت روایتی تصور کو چھوڑ کر حقیقت کے قالب میں ڈھل کر سامنے آتی ہے۔ سماجی شعور، عصری تجربات اور ذاتی غم ان کی غزل کا پیکر پیش کرتی ہے۔ یہاں نسائی جذبات، خوابوں کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی زندگی سے آنکھ ملاتے ہیں اور وہ کہتی ہے:

میں اتنے سانپوں کو رستے میں دیکھ آئی تھی کہ تیرے شہر میں پہنچی تو کوئی ڈر ہی نہ تھا

پروین شاکر نے زمانے کے درد کو بھی لفظوں میں پیش کیا اور اپنی ذات میں چھپے درد اور غم کو بھی صفحہ قرطاس پر قوسِ قزح کے رنگوں کی طرح بکھیرا اور ان خوابوں کا ذکر بھی کیا جن کو کبھی تعبیر نہ ملی۔ اس نے اپنے حسین جذبوں اور اچھوتے خیالوں کو بڑے نرم و نازک لفظوں میں بیان کیا۔ اسی طرح انسانی نفسیات کی عکاسی بھی بڑی نفاست سے کرتی ہے۔ رومان پرور لمحوں میں جو احساسات و جذبات جنم لیتے ہیں وہ بھی بہت پُر لطف ہوتے ہیں ان کا بیان بھی پروین شاکر کی شاعری میں ایک جمالیاتی آہنگ لیے ہوئے ہیں جیسا کہ وہ کہتی ہے۔

اس نے چُوما مری آنکھوں کو سحر دم اور پھر رکھ گیا میرے سرہانے مرے خوابوں کے گلاب
کون چھو کر انہیں گزرا کہ کھلے جاتے ہیں اتنے سرشار تو پہلے نہ تھے ہونٹوں کے گلاب

درج بالا اشعار رومان پرور لمحوں میں نسائی کیفیات کے خوبصورت ترجمان ہیں کہ چھو جانے کی کیفیت سے جو خواب آنکھوں میں بیدار ہوتے ہیں اور جو محسوسات جنم لیتے ہیں اس کا خوبصورت عکس لفظوں کے انتخاب سے پیش کیا ہے۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پروین شاکر کی شاعری کا بنیادی ماخذ ذات کا کرب اور نسوانی جذبات و احساسات کی ترجمانی ہے۔ جسے پروین شاکر نے شاعری میں محبوب کے تصور کو عام روش سے ہٹ کر پیش کیا ہے۔ محبوب کا یہی تصور ان کی شاعری کی شناخت بھی ہے اور روایت کی توسیع کا عمل بھی۔ اس روایت کی پاسداری کے لیے انہوں نے جدید لب و لہجہ اور کلاسکی شعریات دونوں سے استفادہ کیا۔ عورت کی آواز اس کی حسیت اور نسائیت کو جس منفرد اسلوب اور لہجے میں پروین شاکر نے بیان کیا ہے وہ بہت کم شاعرات کر پائی ہیں۔ پروین شاکر کی انفرادیت محض اس بات میں نہیں ہے کہ انہوں نے نسائی جزبات کی

کامیاب عکاسی کی ہے یا عورتوں کے ساتھ برتے جانے والے امتیازات کو اجاگر کیا ہے بلکہ انکی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیات الفاظ کی سادگی اور پرکاری بھی ہے۔

پروین شاکر کے ہاں ایک نوجوان لڑکی کے جذبات سے لیکر ایک شادی شدہ عورت اور پھر ایک ماں کی نسائی کیفیات کا بھرپور اظہار انتہائی ہنروری سے ملتا ہے۔اس کے ہاں جس عورت کا کردار سامنے آتا ہے وہ مسلسل ارتقا پزیر ہے۔ایک کم عمر لڑکی کی جو گھروندوں کے خواب بنتی ہے، محبت میں ناکامی کے بعد مشرقی اقدار کے لیے اپنے والدین کی مرضی سے شادی کرتی ہے مگر شادی کا انجام ناکامی پر ہوتا ہے۔ اپنے بیٹے کو اپنی خوشیوں کا محور بناتی ہے اور زمانے کی گردشوں کو برداشت کرتی ہے۔یوں اس کی شاعری میں عورت کے حوالے سے تقریباً ہر رنگ ملتا ہے جو فطری بھی ہے اور پُرتاثیر بھی۔نامیدی کو امید میں بدلنے کی کوشش میں ان کے کجرارے بھیگتے نین امیدوں کی قندیل سے روشن ہیں۔عورت کی اسی بے بسی اور مجبوری کو پروین شاکر نے اپنی غزلیہ شاعری میں نہایت ہی خوبصورت الفاظ میں ڈھالا ہے:

لڑکیوں کے دکھ عجب ہوتے ہیں سکھ اس سے عجب
ہنس رہی ہیں اور کاجل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

◄◄ ● ►►

Resaech Scholar,Bhagvant university,Ajmer
R/o: Sader Kote Bala
Tehsil :Hajin
District : Bandipora Jammu and Kashmir
Pin code: 193504//Mob: 7780809498

اشاریہ، ماہنامہ بیسویں صدی (جلد اول)	میں لاہور ہوں
محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی	(لاہور کی تاریخی، وثقافتی، سیاسی اور ادبی دستاویز)
صفحات:۵۴۴	ڈاکٹر کیول دھیر
قیمت۶۰۰/	صفحات:۲۲۰ قیمت:۳۰۰/روپے
زیر اہتمام: عزیزیہ رحمانی ایجوکیشنل اینڈ	رابطہ:بی۔۱۱۶، بی، آر، ایس نگر
ویلفیئر فاؤنڈیشن، نئی دہلی	لدھیانہ۔۱۴۱۰۱۲
رابطہ:8826080282	9815155800

● **یاد رفتگاں**

● **ڈاکٹر محمد یٰسین**

راحت اندوری.....ایک احتجاجی شاعر

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے — تب نظر آتی ہے اک مصرعۂ تر کی صورت
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے — بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

راحت اندوری ہزاروں کیا لاکھوں میں ایک تھے۔جو اردو کی اصناف شاعری میں اپنے ہنر وفن سے انقلاب برپا کیا ان کے کہے ہوئے اشعار برف کے سلّیوں کے نیچے دبے ہوئے شعلوں کے مانند ہیں جو دیکھنے میں بظاہر ٹھنڈ مگر تاثیر بالکل برعکس ہے۔ان کی زبان بہت سادہ تھی اور اس میں بناوٹ نام کو نہ تھی، ان کی آواز میں گرج پن تھا اور ان کا چہرہ بظاہر جوش وخروش اور جذبات سے خالی نظر آتا ہے لیکن ان کے اندرون میں دہکتی ہوئی آگ کی گرمی اور جذبات کا طلاطم خیز طوفان پوشیدہ تھا جو لفظ ان کے زبان سے نکلتا تھا وہ سننے والوں کے دل ودماغ کی گہرائیوں میں اتر کر آگ لگا دیتا تھا۔انھوں نے اپنے کلام اور اپنی شاعری کے ذریعہ ایک انقلاب کی جوت جگائی جو ہمیشہ جگمگاتی رہے گی۔عہد حاضر کے مشاعروں کے بے تاج بادشاہ دائرے فانی کو الوداع کہہ دیا جس سے شعری وادبی دنیا کے علاوہ پورے اردو عالمی دنیا میں صف ماتم چھا گئی۔ایک پھڑ پھڑاتا ہوا شعلہ بجھ گیا۔

دور حاضر نے اردو شاعری کی دنیا کا کوہِ نور اور اپنا سب سے بیش قیمتی سرمایہ کھو دیا۔راحت کا جانا محض ایک شخص یا فرد کا جانا ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب وفکر کا جانا بھی ہے۔اس ہمہ جہت شخصیت کے اوپر اردو شاعری ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔جس نے نہ صرف اردو شاعری کو نئی روش عطا کی بلکہ اس کے دامن کو وسیع سے وسیع تر کر دیا۔راحت اندوری کا ایسے وقت میں جانا جبکہ قوم وملت وملک کے لیے ان کی اشد ضرورت تھی وہ وقت اور حالات کے مطابق شاعری کیا کرتے تھے۔ان کے اندر وقت شناسی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ان کا اس دار فانی سے کوچ کرنا ادبی دنیا کا کافی نقصان ہوا ہے۔جس کی بھرپائی از حد ممکن نہیں ہے۔

راحت کو نہ صرف اردو والے یا صرف مسلم بلکہ ان کو ہر قوم ومذہب اور ہر طبقہ کے لوگ بیحد پسند

کیا کرتے ہیں چونکہ وہ عوام کی بات عوام کے لب ولہجہ وزبان میں شعر کہنے کہ بلا کی صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ مشاعروں میں اپنے اشعار کے ذریعہ قہقہہ لگاتے ہوئے وہاں موجود سامعین کو تو لطف اندوز کر ہی جاتے لیکن ان کا طنز اور چیلینج جس کی طرف ہوتا ان کے دِلوں میں بجلیاں کوندنے لگتی ہے۔ ان کے قہقہے اور مسکراہٹ سے ہزاروں تیر برستے اور کروڑوں لہولہان ہوجاتے تھے۔ ان کا ایک شعر ہے۔ ؎

مزہ چکھا کے مانا ہوں میں بھی دنیا کو　　سمجھ رہی تھی کہ ایسے ہی چھوڑ دوں گا

راحتؔ اندوری نے اپنی شاعری سے حکومت سے آنکھ ملانے کا جذبہ بھی بیدار کیا اپنے منفرد انداز میں بیان کے لیے وہ ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ بیسویں صدی کی آخری دو اور اکیسویں صدی کے شروعاتی دو دہائیوں میں ان کی بے خوف اور بے باکانہ شاعری صنف اردو شاعری میں ہمیشہ یاد کی جائے گی۔ تاریخ ان کے اس جذبہ تقاکر کو کبھی فراموش نہیں کرے گی بلکہ ان کی احتجاجی صدا کو تاریخ کے اوراق پر سنہرے حرفوں میں رقم کرے گی۔ بعد میں آنے والی نسلوں کو ان کی شاعری اس وقت کے سماجی، سیاسی، تہذیبی حالات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لینے کا موقع فراہم کرے گی۔

ان کی ولادت ان کے کارہائے انجام، ان کی مقبولیت ان کی شاعری کے تئیں ذوق وشوق اور ان کے شعری انداز بیان اور ان کی پوری شباحت کو پروفیسر ظفر احمد نظامی کچھ اس طرح رقم کرتے ہیں:

''چہرہ کتابی، آنکھیں نیم خوابی، ستواں ناک، زبان بیباک، بڑے بڑے کان بلند کا نشان، تا بحد نظر پیشانی، ذہانت کی کہانی۔ یہ ہیں شاعر طرحدار ممتاز فنکار، مشاعروں کی شان، محفلوں کی جان، پردۂ سیمیں کا وقار، مقبول نغمہ نگار، واقف کمزوری وشدزوری، یعنی ڈاکٹر راحت اندوری۔ راحتؔ یکم جنوری ۱۹۵۰ء کو اندور میں پیدا ہوئے۔ شب مالودہ پر شیدا ہوئے۔ ابتدائی اسباق گھر میں پڑھے پھر اعلیٰ تعلیم کی سیڑھیاں چڑھے۔ اردو میں ایم۔ اے پاس کیا، خود کو پی ایچ ڈی سے روشناس کیا۔ درس وتدریس کو پیشہ بنایا، آئی کے کالج میں پڑھایا۔ مصوری کے ناز اٹھائے، رنگ ریزی کے دیپ جلائے۔ انھیں ابتدا ہی سے شاعری کا شوق رہا۔ شعر وادب کا ذوق رہا، ہزار شعر از بر تھے۔ مستقبل کا مظہر تھے۔ انھوں نے اختر شیرانی کو دل میں بیٹھایا۔ ساحر کو اپنایا، مجاز سے پیار کیا، مخدوم پر اعتبار کیا، فیض سے فیضیاب ہوئے، کوچۂ سخن میں کامیاب ہوئے، آخر کار تخلیق کا کرب سہا۔ ۱۹۶۸ء میں پہلا شعر کہا۔ پھر مسلسل شعر کہنے لگے، دریائے سخن میں بہنے لگے۔ اگر چہ وہ شعر کہتے تھے، تنہائی اس کا بوجھ سہتے تھے۔ پھر نشستوں میں شرکت کرنے لگے، اندور کے ماحول میں ابھرنے لگے۔ لوگ

انھیں پہچاننے لگے، شاعر کی حیثیت جاننے لگے، محفلوں میں موجود پائے گئے، مشاعروں میں بلائے گئے، شہرتوں قریب ہوگئے، اردو دانوں کے حبیب ہوگئے، انھوں نے ترقی پسندوں کی چادر تانی، گلی کوچوں کی خاک چھانی، اب نامور گیت کار ہیں، پردۂ سیمیں کے نغمہ نگار ہیں، راہ میں کہیں نہیں رکے ہیں، بیشمار فلموں میں گیت لکھ چکے ہیں، انھوں نے ادب کا بلند اقبال کیا، دنیا کے سخن کو مالا مال کیا۔ ''دھوپ دھوپ'' سفر میں رہے، ''میرے بعد'' اپنی نظر میں رہے'' پانچویں درویش'' کا قصہ سنایا، شاعری کو دنیا کا تاج پہنایا۔ لیلائے غزل کا حسن نکھارا، ہندی کے قالب میں اتارا'' [پروفیسر ظفر احمد نظامی، از لمحے لمحے راحت اندوری شاعری اور شخص، ص:۱۱۔۱۲]

اردو شاعر کو اپنی زندگی بنانے والا شاعر یعنی راحتؔ اندوری کو ایک وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے تو ایک صداء احتجاج بلند کرتے ہیں اس دیوانگی کو انھوں نے خود اعتراف کیا اور اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

میری غزل سے بنا ذہن میں کوئی تصویر　　سبب نہ پوچھ میرے دیوداس ہونے کا
گلاب، خواب، دوا، زہر، جام کیا کیا ہے　　میں آگیا ہوں بتا انتظام کیا کیا ہے
کسی نے دستک دی یہ دل پر کون ہے　　آپ تو اندر ہیں باہر کون ہے
سُلا چکی تھی دنیا تھپک تھپک کے مجھے　　جگا دیا تیری پازیب نے کھنک کے مجھے
کوئی بتائے ہمیں اس کا کیا علاج کروں　　پریشان کرتا ہے یہ دل دھڑک دھڑک کے مجھے
مجھ میں کتنے راز ہیں بتلاؤں کیا　　بند اک مدت سے ہوں کھل جاؤں کیا
عاجزی، منت، خوش آمد، التجا　　اور میں کیا کیا کروں مر جاؤں کیا
دن ڈھل گیا تو رات گزرنے کی آس میں　　سورج ندی میں ڈوب گیا ہم گلاس میں

راحتؔ اندوری ہمیشہ حالات کے عین مطابق اشعار لکھنے میں ماہر تھے۔ اپنے گردونواح میں ہونے والے واقعات وحادثات کو شعری پیرائے میں پرونے سے نہیں چوکتے اور بلا خوف وخطر کہہ جاتے تھے۔

طوفان تو اس شہر میں اکثر آتا ہے　　دیکھیں اب کے کس کا نمبر آتا ہے
یاروں کے بھی دانت بہت زہریلے ہیں　　ہم کو بھی سانپوں کا منتر آتا ہے
سوکھ چکا ہوں، پھر بھی میرے ساحل پر　　پانی پینے روز سمندر آتا ہے
ٹوٹ رہی ہے ہر دن مجھ میں اک مسجد　　اس بستی میں روز دسمبر آتا ہے

راحتؔ اندوری کی یہ فنی صلاحیت تھی کہ دور حکومت کے خلاف اپنے تیکھے اور تلخ الفاظ میں مذمت اور

احتجاج اس قدر کرتے تھے کہ حکومتیں لاجواب ہوجایا کرتی تھیں کہ ان کے کہے ہوئے اشعار کو سوائے اعتراف کے کوئی چارہ نہ ہوتا، ان کے سامنے منہ بے زبان ہوجاتے، مشاعروں میں جب قہقہہ لگاتے ہوئے ان کے منہ سے اشعار نکلتے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے سیاہ بادل میں کوندتی ہوئی بجلی نہ جانے کس کو آج اپنا شکار بنانے والی ہے۔

بجھ گئے چاند سب حویلی کے　　جل رہا ہے چراغ مفلس کا
خوار پھرتے ہیں آئینہ ہو کر　　جانے منہ دیکھنا ہے کس کس کا
محبتوں کے سفر پر نکل کے دیکھوں گا　　یہ پل صراط اگر ہے تو چل کے دیکھوں گا
وہ میرے حکم کو فریاد جان لیتا ہے　　اگر یہ سچ ہے تو لہجہ بدل کے دیکھوں گا

راحتؔ اندوری کو مصورانہ شاعری کرنے میں مہارت حاصل تھی ان کی غزلیہ زبان بالکل جدید ہے۔ ان کی غزل میں ایک تیز دھار دکھائی دیتی ہے جو بہت آسانی سے قارئین کے ذہن و دماغ میں گھر کر جاتی ہے۔ انھوں نے غزل کو پیچ وخم کے اصطلاحوں، تلمیحات اور استعاروں سے نکال کر سادہ سلیس اور آسان زبان کا جامہ پہنا دیا یہی ان کی انفرادیت ہے۔ ان کا مصورانہ ذہن ایسے ایسے وادیوں میں سفر کیا جہاں الفاظ کا ذخیرہ موجود ہے۔

بہت رنگین طبیعت ہیں پرندے　　درختوں پر کلنڈر لگ رہے ہیں
جو شاخوں پر اداسی کے برہنہ خط بناتے ہیں　　ہم ان سوکھے ہوئے پتوں سے گھر کی چھت پناتے ہیں
فرشتے رنگ برساتے ہیں موسم رقص کرتا ہے　　جب اڑتے بادلوں میں ہم تیری صورت بناتے ہیں

یہ راحتؔ صاحب کی ہی کمالِ شاعری ہے اور الفاظوں کے انتخاب کے ذریعے جو تصویر کشی کی ہے وہ جاذب نظر ہے:

قینچیاں ڈھونڈتی پھرتی ہیں بدن خوشبو کا　　خار صحرا، کہیں بھولے سے مہک مت جانا

آسمان کی ایک ایسی تصویر کھینچی ہے جو روز آپ کی نظرون سے گزرتی ہے۔

روز تاروں کو نمائش میں خلل پڑتا ہے　　چاند پاگل ہے اندھیرے میں نکل پڑتا ہے

غزل میں یہ تصویر کشی صرف راحتؔ کے نصیب میں آئی جسے بڑی خوبصورتی سے شعری پیرائے میں ڈھال دیتے ہیں:

جا نمازوں کی طرح نور میں اجلائی سحر　　رات بھر جیسے فرشتوں نے عبادت کی ہے
اندھیری رات کے گمراہ جگنوؤں کے لیے　　اداس دھوپ کی ٹہنی یہ رات رکھ دینا

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سورج، چاند، تارے، پرندے کو اپنے اشعار میں لاتے نہیں جیسے وہ خود

بخود وارد ہونے لگتے ہیں۔ سورج کو تو اپنی جدوجہد سے بھری زندگی کا استعارہ بنالیا ہے:

ہمیں چراغ سمجھ کر بجھا نہ پاؤ گے　　ہم اپنے گھر میں کئی آفتاب رکھتے ہیں

راحتؔ، کبھی مایوس نہیں ہوتے غروب آفتاب سے بھی روشنی پھیلنے کی امید کرتے ہیں:

اٹھو اے چاند تاروں، اے شب کے سپاہیو　　آواز دیرہا ہے لہو آفتاب کا
دھوپ اور چھاؤں کے مالک مرے بوڑھے سورج　　میرے سایے کو مرے قد کے برابر کردے

اردو شاعری میں سورج، چاند، ستارے، شاہین، کبوتر، پرندے، یہ سب ایک بلیغ استعارے ہیں۔ راحت صاحب ان سب استعاروں کا بخوبی استعمال کیا ہے۔ جو ان کی تخلیقی ذہن اور فکر کی گرہیں کھولتے ہیں، سورج روشنی کا استعارہ ہے اور پرندہ پرواز کی علامت ہے۔ انھیں استعاروں کے سہارے وہ اتنی گہری ضرب کاری کرتے ہیں کہ ظالموں کے ہوش فاختہ ہوجاتے ہیں سماج کے مظالم کو وحشی کبوتر کی شکل میں کس طرح ادا کرتے ہیں:

ہمارا شوق ہے دار ورسن کی پیمائش　　تمھارا کام کبوتر شکار کرنا ہے
ہیں مردہ خور پرندے چھتوں پہ بیٹھے ہوئے　　یہیں کہیں کوئی مقتل ضرور نکلے گا
بجھ گیا وحشی کبوتر کی ہوس کا گرم خون　　نرم بستر پر تڑپتی فاختائیں رہ گئیں

راحتؔ اندوری کسی بھی واقعہ، حادثات، احساس و جذبات اپنے دل و دماغ میں بہت دیر تک نہیں رہنے دیتے بلکہ انھیں بیساختہ اپنے انداز بیان سے شعری پیرائے میں ڈھال دیتے۔ جو شعلہ بن کر مظلوموں کی ڈھال بنتے ہیں۔ اصل میں راحت کے یہاں غزل کے کئی چہرے سامنے آتے ہیں۔ کہیں احتجاجی للکار، کہیں شکوہ، کہیں طعن، کہیں تشنیع تو کہیں خاموشیوں سے معمور ان کی غزل اپنی ایک الگ پہچان بنالیتی ہے جو انسانی شیطنت وخباثت کو ضرب کرتی ہے علاوہ ازیں انسان کی نیکی اور اس کی معصومیت کا بھی اقرار کرتی اور کراتی ہے۔ ان کے عہد کی ساری سرخیاں ان کی عبارت میں مسخ ہوتی ہیں۔ مکر وفریب، ضمیر فروشی، اقلیت کے اوپر ظلم وزیادتی، نیز سماج کے غیر ترقی یافتہ قومیں جن کے سر پر روز بروز مظالم کے پہاڑ ڈھائے جاتے ہوں کے مختلف پہلوؤں کو شعری انداز میں لانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں:

درمیاں اک زمانہ رکھا جائے　　پھر کوئی پل سہانا رکھا جائے
خوب باتیں رہیں گی رستے بھر　　دھوپ سے دوستانہ رکھا جائے
دوستوں کا خیال رکھا کرو　　کچھ نئے زخم پال رکھا کرو
پھر وہ چاقو چلا نہیں سکتا　　ہاتھ گردن میں ڈال رکھا کرو
شکایت کس لیے ہے زندگی سے　　ہمیں دن رات مرنا چاہیے تھا

اکیلی رات بستر پر پڑی ہے مجھے اس دن سے ڈرنا چاہئے تھا
ڈبو کر مجھ کو خوش ہوتا ہے دریا اسے تو ڈوب مرنا چاہئے تھا
اس کا یہاں پہ کچھ بھی نہیں ہے اسے کہو جو چیز ہے جہاں کی وہیں رکھ کے بھول جائے
وہ اب آئینے دھوتا پھر رہا ہے اسے چہروں پہ شک ہونے لگا ہے

راحت اندوری کے ذہن میں الفاظ وموضوعات کا اتنا ذخیرہ موجود ہے کہ جب چاہیں جس انداز سخن میں بیان کردیتے ہیں۔قدیم موضوعات کو جدید الفاظ ورنگ میں ڈھال دینا ہی ان کا مخصوص انداز بیان ہے:

یہ سارے لوگ تو شامل تھے لوٹنے میں مجھے سنا ہے اب مری امدا کرنا چاہتے ہیں
ہم اپنے شہر میں محفوظ بھی ہیں خوش بھی ہیں یہ سچ نہیں ہے مگر اعتبار کرنا ہے
میری غلیل کے پتھر کا کارنامہ تھا مگر یہ کون ہے جس نے ثمر اٹھایا ہے
قرض ہے ماؤں کی چھاتی سے ٹپکتا ہوا دودھ اے حکومت تری امدا سے کیا ہوتا ہے
چہرہ مشکوک ہوئے جاتے ہیں آئینہ ہم بھی نہیں تم بھی نہیں
جو اک ہجوم ادھر ہے مرے دیار کا ہے تمھاری قبر پہ کتبہ مرے مزار کا ہے

راحت اندوری نیا ردد وشاعری کو ایک نئے ایام سے جوڑنے کی کامیاب سعی کی ہے جسے محبوب کی زلفوں کے پیچ وخم سے باہر نکال عوام کے دکھ درد سے جوڑ دیا۔ جہاں مظلوموں کی کراہ اور سسکیوں کا حساب برابر کرنے کی بات کہی جانے لگی۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے ہر جابر وظلم کا مقابہ سینہ سپر ہوکر کرتے رہے،اور مستقبل میں بھی جب کہیں استحصال ہوگا یا ظلم وزیادتی تو ان کے اشعار ضرور دہرائے جائیں گے۔ آج راحت اندوری ہمارے درمیاں نہیں ہیں لیکن ان کی آواز ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے۔اور آگے بھی گونجتی رہے گی۔ان کے کہے ہوئے اشعار مشعل کی طرح ہیں جو ہمیشہ راستہ دکھاتے رہیں گے۔اور جب جب ظلم وستم کا بول بالا ہوگا ان کی شاعری تب تب صدائے احتجاج بلند کرتی رہے گی۔

راہ میں خطرے بھی ہیں ،لیکن ٹھہرتا کون ہے موت کل آتی ہے آج آجائے ڈرتا کون ہے
ترے لشکر کے مقابل میں اکیلا ہوں مگر فیصلہ میدان میں ہوگا کہ مرتا کون ہے

◂◂ ● ▸▸

A-380 GTB Nagar,Kareli
Allahabad(UP)-
9336084416

● خاکہ
● اقبال حسن آزاد

حضرت محمد ولی رحمانی.....دامت برکاتہم

مضمون شروع کرنے سے پہلے میں اس حقیقت کا اعتراف کرلوں کہ میں زیادہ لوگوں سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتا کیونکہ:

آدمی، آدمی سے ملتا ہے
دل مگر کم کسی سے ملتا ہے

اور جس سے دل ملتا ہے میں اس سے دل کھول کر ملتا ہوں۔ مجھ جیسے شخص کو عرف عام میں کم آمیز کہا جاتا ہے:

فرشتوں کو گلہ ہے کہ کم آمیز ہے مومن
حوروں کو شکایت ہے بہت تیز ہے مومن

عاصی کا واسطہ اب تک نہ تو کسی حور سے پڑا ہے نہ کسی فرشتے سے مگر کئی فرشتہ صفت انسانوں کو ضرور قریب سے دیکھا ہے۔ایسی ہی ایک شخصیت ،شیخ طریقت حضرت محمد مولانا محمد ولی صاحب رحمانی دامت برکاتہم ،امیر شریعت بہار،جھاڑکھند اور اڑیسہ،جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ،سجادہ نشیں،خانقاہ رحمانی مونگیر کی ہے۔

مجھے یاد نہیں کہ حضرت سے میری پہلی ملاقات کب اور کن حالات میں ہوئی۔البتہ اتنا یاد ہے کہ میں نے پہلے پہل انہیں سیوا سدن،مونگیر کے کسی پروگام میں تقریر کرتے سنا تھا۔وہاں حضرت نے جس بیباک اور دوٹوک انداز میں اپنی بات کہی اس نے مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا۔

اس واقعے کے کچھ عرصہ بعد کسی تقریب میں ان سے ملاقات ہوگئی۔میں دوسرے مہمانوں کے ساتھ کرسی پر بیٹھا تھا کہ اچانک ایک دبا دبا سا شور اُبھرا ''حضرت آگئے۔حضرت آگئے۔''اور مجمع میں ہلچل سی مچ گئی ۔پھر کچھ لوگ انہیں سلام کرنے اور ان کی دست بوسی کے لئے آگے بڑھے۔میں بھی بھیڑ میں شامل ہوگیا۔اور اس

روز پہلی بار حضرت سے ہاتھ ملانے کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے اپنا تعارف پیش کیا تو مسکرا کر بولے۔

''جی! میں آپ کو جانتا ہوں۔'' میں ایک حیرت انگیز مسرت سے دوچار ہوا۔ اور میں نے پھر انہیں غور سے دیکھا۔ ہنستا ہوا نورانی چہرہ، ستواں ناک، چشمے کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی بڑی بڑی روشن آنکھیں، دیدہ زیب ریش، سر گول ٹوپی اور کافی سے بھی کچھ زیادہ لمبا لبادہ، ہاتھ میں چھڑی اور کمر قدرے خم۔ ان کی آواز صاف اور بلند تھی اور لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ بالکل کھرے ہیں۔ بہت دھیمی آواز میں بات کرنے والے مشکوک شخصیت کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ سبھوں سے ہنس ہنس کر ملتے رہے، ان کی خیریت دریافت کرتے رہے اور مجھے ایک سحر انگیز احساس میں مبتلا کرتے گئے۔

۲۰۰۵ء میں میرا دوسرا افسانوی مجموعہ ''مردم گزیدہ'' اشاعت پذیر ہوا۔ میں نے اس کی ایک جلد حضرت کو پیش کی۔ انہوں نے بخوشی قبول فرمایا۔ اسی دوران حضرت سخت علیل ہوگئے اور انہیں بغرض علاج کلکتہ لے جایا گیا۔ صحت یاب ہونے کے بعد جب آپ مونگیر آئے تو میں ان کی مزاج پرسی کو حاضر ہوا۔ وہ ہشاش بشاش دکھائی دے رہے تھے۔ گفتگو کا دور چلا تو انہوں نے کہا۔

''میں افسانے نہیں پڑھتا ہوں مگر میں نے آپ کے سارے افسانے پڑھے۔ آپ زبان بڑی خوبصورت لکھتے ہیں۔'' مت پوچھئے اس وقت میرے دل کی کیا حالت ہوئی اور میں کیسی خوشی، کیسی مسرت سے دوچار ہوا۔

میں ۱۹۸۷ء سے اردو فورم کا رکن ہوں۔ یہ اردو فورم کا فرض تھا کہ میرے افسانوی مجموعے کی رسم اجرا کرتا مگر رسم اجرا کرنا تو دور کی بات، فورم کی جانب سے مجھے جھوٹوں منہ مبارکباد تک نہ دی گئی۔ یہ حضرت ہی کی ذات بابرکات ہے کہ انہوں نے مورخہ ۳؍دسمبر ۲۰۰۶ء کو رحمانی فاؤنڈیشن کے ایک عظیم الشان جلسے میں اس کتاب کی رسم اجرا کروائی اور سند سے نوازا۔ میں حضرت کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔

اس کے بعد حضرت کی عنایتیں مجھ پر ہونے لگیں۔ کبھی ڈائری آ رہی ہے، کبھی کھجوریں، کبھی عطریات اور کبھی مٹھائی کا ڈبہ۔ ایک دفعہ خانقاہ سے فون آیا 'حضرت آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔' پھر دوسری جانب سے حضرت کی شیریں آواز سنائی دی۔

''آج رات کا کھانا آپ میرے ساتھ تناول فرمائیے۔ اور ساتھ میں اپنے شاگرد ارمان حسین کو بھی لیتے آیئے۔'' میں نے فوراً ارمان کو فون کیا اور انہیں رات کے پروگرام سے آگاہ کیا۔ وقت مقررہ پر وہ حاضر ہوئے اور پھر ہم دونوں خانقاہ کی جانب روانہ ہوئے۔ پہلے ہمیں حسب معمول انتظار گاہ میں بٹھایا گیا۔ اس کے بعد اندر سے بلاوہ آیا اور ہم وہی مختصر سی راہداری عبور کر کے اندر برآمدے میں پہنچے تو دیکھا کہ حضرت اپنی مخصوص کرسی پر

فروکش ہیں۔ ہم لوگوں نے سلام کیا۔ تپاک سے سلام کا جواب دیا اور پھر جو گفتگو کا سلسلہ دراز ہوا تو وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا۔ حضرت کی گفتگو اس قدر شگفتہ و شاداب ہوتی ہے کہ بے ساختہ احمد فراز کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے:

سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

اس روز مجھے پہلی بار اس بات کا اندازہ ہوا کہ حضرت شعر و ادب پر بھی گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ اور بلا شبہ آجکل کے اردو اساتذہ ان کے آگے طفل مکتب سے زیادہ نہیں۔ اس دوران نازک نازک پیالیوں میں نہایت خوشبودار اور لذیذ چائے آئی۔ ساتھ ہی ساتھ باتیں بھی ہوتی رہیں اور پھر جب رات کافی بھیگ چلی تو صحن کے چبوترے پر لمبا چوڑا دستر خوان بچھایا گیا اور انواع و اقسام کے کھانے چنے گئے جن کی اشتہا خوشبو نے ہمارے دل و دماغ معطر کر دئے۔ اور جب ہم سیر ہو گئے تو ہمیں خانقاہ کی جیپ میں بٹھا کر گھر تک پہنچا دیا گیا۔

اس روز حضرت نے ایک کام بھی میرے سپرد کیا۔ اور وہ کام تھا اردو کے مشہور شاعر بہزاد لکھنوی کے کلام کی ترتیب و تدوین۔ میں نے حامی بھر لی اور انہوں نے ٹائپ شدہ مواد میرے غریب خانے پر بھجوا دیا۔ میں نے اپنا کام مکمل کر لیا مگر وہ مسودہ ہنوز میرے پاس رکھا ہوا ہے۔ حضرت غالباً دوسرے مفید کاموں میں اس قدر مشغول ہو گئے انہیں پھر اس مسودے کی یاد نہیں آئی۔

غالباً ۲۰۰۸ء کی سردیاں تھیں۔ میں اپنے ایک نجی کام کے سلسلے میں دلی گیا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کی حضرت بھی آجکل یہیں تشریف فرما ہیں اور حضرت نظام الدین کے ایک گیسٹ ہاؤس میں قیام پذیر ہیں۔ میں اپنے ایک پرانے شاگرد شاہد الاسلام، جو ان دنوں انڈین اکسپریس نامی اخبار سے وابستہ ہیں اور جن پر حضرت کی بھی نظر عنایت ہے، کے ہمراہ ان کی قیام گاہ پر پہنچا۔ دن کے گیارہ بج رہے ہونگے۔ ٹھنڈ تو تھی مگر سورج روشن تھا۔ ایک خادم کی رہنمائی میں ہملوگ حضرت کے آگے حاضر ہوئے۔ حضرت ایک بڑی سی بالکنی میں تشریف فرما تھے۔ ہملوگوں نے سلام کیا تو انہوں نے سلام کا جواب دے کر گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ اس روز حضرت مسلسل فون پر باتیں کر رہے تھے اور لوگوں کو ہدایت دے رہے تھے۔ اس دوران کبھی تو ان کا لہجہ نرم ہو جاتا اور کبھی سخت۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ ایک اچھے رہنما میں جتنی خوبیاں ہونی چاہئیں وہ سب کی سب حضرت کے اندر موجود ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ سرکار کی جانب سے اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لئے بہت ساری اسکیمیں چلائی جاتی ہیں لیکن متعلقہ اراکین پارلیامنٹ اور وزراء کی تساہلی کی وجہ سے اس کا فائدہ حقداروں کو نہیں مل پاتا ہے۔ چنانچہ وہ کمر میں ستّو باندھ کر دلی میں بیٹھے ہوئے ہیں تاکہ یہ اسکیمیں لاگو کی جا سکیں۔ اسی دن انہوں نے رحمانی فاؤنڈیشن مونگیر میں N.C.P.U.L کے اشتراک سے

''پہلی جنگ آزادی کی تحریکات.....ابتدا سے انیسویں صدی تک'' کے عنوان سے ایک سیمینار منعقد کرنے کا خاکہ بھی پیش کیا۔اس دوران ویسی ہی نازک نازک پیالیوں میں نہایت لذیذ اور خوشبودار چائے آئی۔حضرت نے بتایا کہ یہ خاص قسم کی چائے ہے جسے صرف خاص لوگوں کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

دلی سے لوٹنے کے بعد مجوزہ سیمینار کے سلسلے میں مسلسل حضرت کے پیغامات آتے رہے۔اور پھر جب حضرت مونگیر تشریف لائے تو انہوں نے اس سلسلے میں ایک میٹنگ کی جس میں مجھے بھی شریک ہونے کا موقع ملا۔اس میٹنگ میں دیگر امور کے ساتھ یہ بھی طے پایا کہ اسکول کے بچوں اور بچیوں کے لئے ایک انعامی مقابلہ رکھا جائے جس میں اردو کے مشہور شعراء کا کلام یاد کر کے ترنم کے ساتھ سنانا تھا۔اس پروگرام کی ذمہ داری حضرت نے اس حقیر پر تقصیر کو سونپ دی۔اور میرے ساتھ مولانا منظر قاسمی کو TAG کر دیا۔پہلی نظر میں مجھے یہ کام ناممکن دکھائی دیا کیونکہ مونگیر اور اطراف کے لوگوں کی شین قاف اکثر نادرست ہے۔بہر کیف! میں نے مولانا منظر قاسمی کے ہمراہ شہر اور مضافات کے مختلف اسکولوں کا دورہ کیا اور اپنے خدشات کو صحیح پایا۔کوئی بھی طالب علم یا طالبہ اس لائق نہیں تھا کہ وہ اس پروگرام میں حصہ لے سکے۔مگر حضرت کے ذہن جس کام کی طرف بن جاتا ہے وہ اپنے پایۂ تکمیل تک ضرور پہنچتا ہے۔مولانا منظر قاسمی نہ صرف خوبصورت شخصیت کے مالک ہیں بلکہ خوبصورت آواز کے بھی مالک ہیں اور ساتھ ہی ساتھ حضرت کا دست شفقت بھی ان کے سر پر ہے۔انہوں نے اپنی محنت شاقہ سے ایک مختصر عرصے میں نہ صرف ان بچوں کا تلفظ درست کر دیا بلکہ انہیں اسٹیج پر PERFORM کرنے کے طریقے بھی سکھلا دئے۔اور جب پروگرام ہوا تو ان بچوں کی مترنم آواز اور درست تلفظ نے ایک سماں باندھ دیا۔یہ حضرت کی عنایت ہے کہ انہوں نے اس کی کامیابی کا سہرا اس ناچیز کے سر باندھ دیا۔بہر حال!''پہلی جنگ آزادی کی تحریکات.....ابتدا سے انیسویں صدی تک'' کے موضوع پر مورخہ ۲۱ تا ۲۳ فروری ۲۰۰۹ء ایک نہایت کامیاب سہ روزہ سیمینار منعقد ہوا جس میں کئی مشاہیر نے اپنے گرانقدر مقالے پیش کئے۔اس سیمینار میں اس ناچیز کو بھی مقالہ پڑھنے کا اعزاز حاصل ہوا۔

اس پروگرام کے بعد حضرت نے ایک بار پھر مجھے کھانے پر بلایا۔ان دنوں میں کچھ زیادہ ہی فربہ ہو رہا تھا چنانچہ گوشت خوری سے اجتناب کرتے ہوئے سبزی خوری کی جانب مائل تھا۔جس کا تذکرہ بھی میں نے چند لوگوں سے کیا تھا۔اس روز میں اپنے صاحبزادے ثالث آفاق کو بھی اپنے ہمراہ لے گیا جو خالص گوشت خور ہیں۔وہاں جب دسترخوان چنا گیا تو ہر طرف سبزیوں کی بہار تھی۔میں نے گنا تو آٹھ قسم کی سبزیاں تھیں۔میں نے کہا۔

''حضرت! آج تو ہر طرف سبزیاں ہی سبزیاں نظر آ رہی ہیں۔کیا بات ہے؟''مسکرا کر بولے۔

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ آجکل آپ سبزیوں کی جانب مائل ہیں۔''میں بحر حیرت میں غوطے

کھانے لگا اور حضرت کے NETWORK پر عش عش کر اُٹھا۔پھر میں نے کہا۔

''لیکن حضرت! میرے صاحبزادے تو گوشت کے بغیر کھانا ہی نہیں کھاتے ہیں۔''میری بات سن کر حضرت نے اپنے خادم کو کوئی اشارہ کیا اور چند ہی ثانیوں میں صاحبزادے کے لئے گوشت کی بنی کوئی ڈش سامنے آ گئی۔بہر کیف! کھانا نہایت لذیذ تھا۔

حضرت کی ذات با برکات بیک وقت کئی مقامات پر علم و آگہی کے چراغ روشن کر رہی ہے۔۱۹۹۹ء میں مونگیر کی مشہور نواب کوٹھی میں رحمانی فاؤنڈیشن کا قیام عمل میں آیا جس کے تحت ۲۰۰۰ء میں N.C.P.U.L کی جانب سے کمپیوٹر کورس کا آغاز ہوا جس سے ہر سال طلباء کی ایک بڑی تعداد فیض یاب ہوتی ہے۔علاوہ ازیں یہاں وقفے وقفے سے مفت آئی کیمپ کا انعقاد ہوتا ہے جس میں مریضوں کا مفت علاج کیا جاتا ہے اور انہیں زندگی کی نئی روشنی ملتی ہے۔ذکر بالا سیمینار کے علاوہ ۳ تا ۵ مارچ ۲۰۰۸ء کو''جنگ آزادی میں بہار و بنگال کا حصہ اور اردو زبان و ادب'' کے موضوع پر ایک اور سیمینار کا انعقاد ہوا تھا۔ان دنوں چونکہ میں شہر میں موجود نہیں تھا اس لئے اس پروگرام میں شریک نہیں ہو سکا تھا۔

رحمانی فاؤنڈیشن نے حضرت کی تحریک پر SUPER 30 کے طرز پر انیس آباد (پٹنہ) میں رحمانی ۳۰ شروع کیا گیا جس میں غریب و نادار لیکن ہونہار طلباء کو نہ صرف I.I.T کی مفت کوچنگ دی جاتی ہے بلکہ انکے قیام و طعام کا بھی مفت انتظام کیا جاتا ہے۔الحمد اللہ! رحمانی ۳۰ نے روز اول سے ہی اپنی پہچان قائم کر لی اور اس کی اتنی شہرت ہوئی کہ دوسری ریاستوں سے بھی اس کی شاخیں کھولنے کی درخواستیں آنے لگیں۔چنانچہ اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں بھی اس کی ایک شاخ کھل چکی ہے۔مہاراشٹر کے ہی پونے میں C.A. کی کوچنگ کا بھی نظم کیا گیا ہے اور پھلواری شریف (پٹنہ) میں مولانا منّت اللہ رحمانی آئی ٹی آئی سنٹر بھی حضرت کی دیکھ ریکھ میں کام کر رہا ہے۔ان کے کام کی سراہنا نہ صرف ہندوستان بلکہ پوی دنیا میں ہو رہی ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شیخ طریقت حضرت مولانا محمد ولی رحمانی دامت برکاتہم ایک فعال اور ہمہ جہت شخصیت ہیں اور ان کے دم سے نہ صرف مونگیر اور بہار بلکہ پورے ہندوستان کا نام ساری دنیا میں روشن ہو رہا ہے۔دعا گو ہوں کہ ان کا سایہ تا دیر ہمارے سروں پر قائم رہے۔(آمین)

◂◂ ● ▸▸

● منتخب افسانہ
● راجندر سنگھ بیدی

کوارنٹین

ہمالہ کے پاؤں میں لیٹے ہوئے میدانوں پر پھیل کر ہر ایک چیز کو دھندلا بنا دینے والی کہرے کے مانند پلیگ کے خوف نے چاروں طرف اپنا تسلط جما لیا تھا۔ شہر کا بچہ بچہ اس کا نام سن کر کانپ جاتا تھا۔ پلیگ تو خوف ناک تھی ہی، مگر کوارنٹین اس سے بھی زیادہ خوف ناک تھی۔ لوگ پلیگ سے اتنے ہراساں نہیں تھے جتنے کوارنٹین سے، اور یہی وجہ تھی کہ محکمۂ حفظانِ صحت نے شہریوں کو چوہوں سے بچنے کی تلقین کرنے کے لیے جو قد آدم اشتہار چھپوا کر دروازوں، گزرگاہوں اور شاہراہوں پر لگایا تھا، اس پر ''نہ چوہا نہ پلیگ'' کے عنوان میں اضافہ کرتے ہوئے ''نہ چوہا نہ پلیگ، نہ کوارنٹین'' لکھا تھا۔

کوارنٹین کے متعلق لوگوں کا خوف بجا تھا۔ بحیثیت ایک ڈاکٹر کے میری رائے نہایت مستند ہے اور میں دعوے سے کہتا ہوں کہ جتنی اموات شہر میں کوارنٹین سے ہوئیں، اتنی پلیگ سے نہ ہوئیں، حالاں کہ کوارنٹین کوئی بیماری نہیں، بلکہ وہ اس وسیع رقبہ کا نام ہے جس میں متعدی وبا کے ایّام میں بیمار لوگوں کو تندرست انسانوں سے ازروئے قانون علاحدہ کر کے لا ڈالتے ہیں تاکہ بیماری بڑھنے نہ پائے۔ اگرچہ کوارنٹین میں ڈاکٹروں اور نرسوں کا کافی انتظام تھا، پھر بھی مریضوں کی کثرت سے وہاں آ جانے پر ان کی طرف فرداً فرداً توجہ نہ دی جا سکتی تھی۔ خویش و اقارب کے قریب نہ ہونے سے میں نے بہت سے مریضوں کو بے حوصلہ ہوتے دیکھا۔ کئی تو اپنے نواح میں لوگوں کو پے در پے مرتے دیکھ کر مرنے سے پہلے ہی مر گئے۔ بعض اوقات تو ایسا ہوا کہ کوئی معمولی طور پر بیمار آدمی وہاں کی وبائی فضا ہی کے جراثیم سے ہلاک ہو گیا اور کثرت اموات کی وجہ سے آخری رسوم بھی کوارنٹین کے مخصوص طریقہ پر ادا ہوتیں، یعنی سینکڑوں لاشوں کو مردہ کتوں کی نعشوں کی طرح گھسیٹ کر ایک بڑے ڈھیر کی صورت میں جمع کیا جاتا اور بغیر کسی کے مذہبی رسوم کا احترام کیے، پٹرول ڈال کر سب کو نذرِ آتش کر دیا جاتا اور شام کے وقت جب ڈوبتے ہوئے سورج کی آتشیں شفق کے ساتھ بڑے بڑے شعلے یک رنگ و ہم آہنگ ہوتے تو دوسرے مریض یہی سمجھتے

کہ تمام دنیا کو آگ لگ رہی ہے۔

کوارنٹین اس لیے بھی زیادہ اموات کا باعث ہوئی کہ بیماری کے آثار نمودار ہوتے تو بیمار کے متعلقین اسے چھپانے لگتے، تاکہ کہیں مریض کو جبراً کوارنٹین میں نہ لے جائیں۔ چوں کہ ہر ایک ڈاکٹر کو تنبیہ کی گئی تھی کہ مریض کی خبر پاتے ہی فوراً مطلع کرے، اس لیے لوگ ڈاکٹروں سے علاج بھی نہ کراتے اور کسی گھر کے وبائی ہونے کا صرف اسی وقت پتہ چلتا، جب کہ جگر دوز آہ و بکا کے درمیان ایک لاش اس گھر سے نکلتی۔

ان دنوں میں کوارنٹین میں بطور ایک ڈاکٹر کے کام کر رہا تھا۔ پلیگ کا خوف میرے دل و دماغ پر بھی مسلّط تھا۔ شام کو گھر آنے پر میں ایک عرصہ تک کاربالک صابن سے ہاتھ دھوتا رہتا اور جراثیم کش مرکب سے غرارے کرتا، یا پیٹ کو جلا دینے والی گرم کافی یا برانڈی پی لیتا۔ اگرچہ اس سے مجھے بے خوابی اور آنکھوں کے چندھے پن کی شکایت پیدا ہو گئی۔ کئی دفعہ بیماری کے خوف سے میں نے قے آور دوائیں کھا کر اپنی طبیعت کو صاف کیا۔ جب نہایت گرم کافی یا برانڈی پینے سے پیٹ میں تخمیر ہوتی اور بخارات اٹھ اٹھ کر دماغ کو جاتے، تو میں اکثر ایک حواس باختہ شخص کے مانند طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتا۔ گلے میں ذرا بھی خراش محسوس ہوتی تو میں سمجھتا کہ پلیگ کے نشانات نمودار ہونے والے ہیں...... اُف! میں بھی اس موذی بیماری کا شکار ہو جاؤں گا...... پلیگ! اور پھر...... کوارنٹین!

انھیں دنوں میں نو عیسائی ولیم بھاگو خاکروب، جو میری گلی میں صفائی کیا کرتا تھا، میرے پاس آیا اور بولا، ''بابو جی!...... غضب ہو گیا۔ آج ایمبو اسی محلّہ کے قریب سے بیس اور ایک بیمار لے گئی ہے۔''

''اکیس؟ ایمبولینس میں......؟'' میں نے متعجب ہوتے ہوئے یہ الفاظ کہے۔

''جی ہاں...... پورے بیس اور ایک...... اُنھیں بھی کونٹن (کوارنٹین) لے جائیں گے۔ آہ! وہ بے چارے کبھی واپس نہ آئیں گے؟''

دریافت کرنے پر مجھے علم ہوا کہ بھاگو رات کے تین بجے اُٹھتا ہے۔ آدھ پاؤ شراب چڑھا لیتا ہے۔ اور پھر حسب ہدایت کمیٹی کی گلیوں میں اور نالیوں میں چونا بکھیرنا شروع کر دیتا ہے، تاکہ جراثیم پھیلنے نہ پائیں۔ بھاگو نے مجھے مطلع کیا کہ اس کے تین بجے اٹھنے کا یہ بھی مطلب ہے کہ بازار میں پڑی ہوئی لاشوں کو اکٹھا کرے اور اس محلّہ میں جہاں وہ کام کرتا ہے، ان لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کاج کرے جو بیماری کے خوف سے باہر نہیں نکلتے۔ بھاگو تو بیماری سے ذرا بھی نہیں ڈرتا تھا۔ اس کا خیال تھا اگر موت آئی ہو تو خواہ وہ کہیں بھی چلا جائے، بچ نہیں سکتا۔

ان دنوں جب کوئی کسی کے پاس نہیں پھٹکتا تھا، بھاگو سر اور منہ پر منڈاسا باندھے نہایت انہماک

سے بنی نوع انسان کی خدمت گزاری کر رہا تھا۔ اگر چہ اس کا علم نہایت محدود تھا، تاہم اپنے تجربوں کی بنا پر وہ ایک مقرر کی طرح لوگوں کو بیماری سے بچنے کی تراکیب بتاتا۔ عام صفائی، چونا بکھیرنے اور گھر سے باہر نہ نکلنے کی تلقین کرتا۔ ایک دن میں نے اسے لوگوں کو شراب کثرت سے پینے کی تلقین کرتے ہوئی بھی دیکھا۔

اس دن جب وہ میرے پاس آیا تو میں نے پوچھا، ''بھاگو تمھیں پلیگ سے ڈر بھی نہیں لگتا؟''

''نہیں بابو جی..... بن آئی بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ آپ اِتنے بڑے حکیم ٹھہرے، ہزاروں نے آپ کے ہاتھ سے شفا پائی۔ مگر جب میری آئی ہوگی تو آپ کا دارو درمن بھی کچھ اثر نہ کرے گا..... ہاں بابو جی! آپ بُرا نہ مانیں۔ میں ٹھیک اور صاف صاف کہہ رہا ہوں۔'' اور پھر گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے بولا، ''کچھ کونٹین کی کہیے بابو جی..... کونٹین کی۔''

''وہاں کوارنٹین میں ہزاروں مریض آ گئے ہیں۔ ہم حتّی الوسع ان کا علاج کرتے ہیں۔ مگر کہاں تک، نیز میرے ساتھ کام کرنے والے خود بھی زیادہ دیر اُن کے درمیان رہنے سے گھبراتے ہیں۔ خوف سے ان کے گلے اور لب سوکھے رہتے ہیں۔ پھر تمھاری طرح کوئی مریض کے منھ کے ساتھ منھ نہیں جا لگاتا۔ نہ کوئی تمھاری طرح اتنی جان مارتا ہے۔ بھاگو! خدا تمھارا بھلا کرے۔ جو تم بنی نوع انسان کی اس قدر خدمت کرتے ہو۔''

بھاگو نے گردن جھکا دی اور منڈاسے کے ایک پلّو کو منھ پر سے ہٹا کر شراب کے اثر سے سرخ چہرے کو دکھاتے ہوئے بولا۔

''بابو جی، میں کس لائق ہوں۔ مجھ سے کسی کا بھلا ہو جائے، میرا یہ نکمّا تن کسی کے کام آ جائے، اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے۔ بابو جی بڑے پادری لابے (ریورینڈ مونت ل، آبے) جو ہمارے محلوں میں اکثر پرچار کے لیے آیا کرتے ہیں، کہتے ہیں، خداوند یسوع مسیح یہی سکھاتا ہے کہ بیمار کی مدد میں اپنی جان تک لڑا دو۔ میں سمجھتا ہوں۔''

میں نے بھاگو کی ہمّت کو سراہنا چاہا، مگر کثرتِ جذبات سے میں رُک گیا۔ اس کی خوش اعتقادی اور عملی زندگی کو دیکھ کر میرے دل میں ایک جذبۂ رشک پیدا ہوا۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ آج کوارنٹین میں پوری تن دہی سے کام کر کے، بہت سے مریضوں کو بقیدِ حیات رکھنے کی کوشش کروں گا۔ ان کو آرام پہنچانے میں اپنی جان تک لڑا دوں گا۔ مگر کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ کوارنٹین میں پہنچ کر جب میں نے مریضوں کی خوفناک حالت دیکھی اور ان کے منھ سے پیدا شدہ تعفّن میرے نتھنوں میں پہنچا، تو میری روح لرز گئی اور بھاگو کی تقلید کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ تاہم اس دن بھاگو کو ساتھ لے کر میں نے کوارنٹین میں بہت کام کیا۔ جو کام مریض کے زیادہ قریب رہ کر ہو سکتا تھا، وہ میں نے بھاگو سے کرایا اور اس نے بلا تامل کیا۔ خود میں

مریضوں سے دور دور ہی رہتا، اس لیے کہ میں موت سے بہت خائف تھا اور اس سے بھی زیادہ کوارنٹین سے۔ مگر کیا بھاگو موت اور کوارنٹین، دونوں سے بالاتر تھا؟

اس دن کوارنٹین میں چار سو کے قریب مریض داخل ہوئے اور اڑھائی سو کے لگ بھگ لقمۂ اجل ہو گئے۔ یہ بھاگو کی جانبازی کا صدقہ ہی تھا کہ میں نے بہت سے مریضوں کو شفایاب کیا۔ وہ نقشہ جو مریضوں کی رفتارِ صحت کے متعلق چیف میڈیکل آفیسر کے کمرے میں آویزاں تھا، اس میں میرے تحت میں رکھے ہوئے مریضوں کی اوسط صحت کی لکیر سب سے اونچی چڑھی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ میں ہر روز کسی نہ کسی بہانہ سے اس کمرہ میں چلا جاتا اور اس لکیر کو سو فیصدی کی طرف اوپر ہی اوپر بڑھتے دیکھ کر دل میں بہت خوش ہوتا۔

ایک دن میں نے برانڈی ضرورت سے زیادہ پی لی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ نبض گھوڑے کی طرح دوڑنے لگی اور میں ایک جنونی کی مانند اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ مجھے خود شک ہونے لگا کہ پلیگ کے جراثیم نے مجھ پر آخر کار اپنا اثر کر ہی دیا ہے اور عنقریب ہی گلٹیاں میرے گلے یا رانوں میں نمودار ہوں گی۔ میں بہت سراسیمہ ہو گیا۔ اس دن میں نے کوارنٹین سے بھاگ جانا چاہا۔ جتنا عرصہ بھی میں وہاں ٹھہرا، خوف سے کانپتا رہا۔ اس دن مجھے بھاگو کو دیکھنے کا صرف دو دفعہ اتفاق ہوا۔ دوپہر کے قریب میں نے اسے ایک مریض سے لپٹے ہوئے دیکھا۔ وہ نہایت پیار سے اس کے ہاتھوں کو تھپک رہا تھا۔ مریض میں جتنی بھی سکت تھی اسے جمع کرتے ہوئے اس نے کہا، ''بھئی اللہ ہی مالک ہے۔ اس جگہ تو خدا دشمن کو بھی نہ لائے۔ میری دو لڑکیاں.....'' بھاگو نے اس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا، ''خداوند یسوع مسیح کا شکر کرو بھائی..... تم تو اچھے دکھائی دیتے ہو۔''

''ہاں بھائی شکر ہے خدا کا..... پہلے سے کچھ اچھا ہی ہوں۔ اگر میں کوارنٹین.....'' ابھی یہ الفاظ اس کے منھ میں ہی تھے کہ اس کی نسیں کھچ گئیں۔ اس کے منھ سے کف جاری ہو گیا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ کئی جھٹکے آئے اور وہ مریض، جو ایک لمحہ پہلے سب کو اور خصوصاً اپنے آپ کو اچھا دکھائی دے رہا تھا، ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ بھاگو اس کی موت پر دکھائی نہ دینے والے خون کے آنسو بہانے لگا اور کون اس کی موت پر آنسو بہاتا۔ کوئی اس کا وہاں ہوتا تو اپنے جگر دوز نالوں سے ارض وسما کو شق کر دیتا۔ ایک بھاگو ہی تھا جو سب کا رشتہ دار تھا۔ سب کے لیے اس کے دل میں درد تھا۔ وہ سب کی خاطر روتا اور کڑھتا تھا۔ ایک دن اس نے خداوند یسوع مسیح کے حضور میں نہایت عجز وانکسار سے اپنے آپ کو بنی نوع انسان کے گناہ کے کفارہ کے طور پر بھی پیش کیا۔

اسی دن شام کے قریب بھاگو میرے پاس دوڑا دوڑا آیا۔ سانس پھولی ہوئی تھی اور وہ ایک دردناک آواز سے کراہ رہا تھا۔ بولا۔

''بابو جی.....! یہ کونٹین تو دوزخ ہے۔ دوزخ۔ پادری لابے اسی قسم کی دوزخ کا نقشہ کھینچا کرتا تھا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں بھائی، یہ دوزخ سے بھی بڑھ کر ہے۔ میں تو یہاں سے بھاگ نکلنے کی ترکیب سوچ رہا ہوں۔ میری طبیعت آج بہت خراب ہے۔''

''بابو جی اس سے زیادہ اور کیا بات ہوسکتی ہے۔ آج ایک مریض جو بیماری کے خوف سے بے ہوش ہوگیا تھا، اسے مردہ سمجھ کر کسی نے لاشوں کے ڈھیروں میں جا ڈالا۔ جب پٹرول چھڑکا گیا اور آگ نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، تو میں نے اسے شعلوں میں ہاتھ پانوں مارتے دیکھا۔ میں نے کود کر اسے اٹھا لیا۔ بابو جی! وہ بہت بری طرح جھلس گیا تھا۔ اسے بچاتے ہوئے میرا دایاں بازو بالکل جل گیا ہے۔'' میں نے بھاگو کا بازو دیکھا۔ اس پر زرد زرد چربی نظر آرہی تھی۔ میں اسے دیکھتے ہوئے لرز اٹھا۔ میں نے پوچھا۔

''کیا وہ آدمی بچ گیا ہے؟ پھر.....؟''

''بابو جی.....! وہ کوئی بہت شریف آدمی تھا۔ جس کی نیکی اور شریفی (شرافت) سے دنیا کوئی فائدہ نہ اٹھا سکی، اتنے درد و کرب کی حالت میں اس نے اپنا جھلسا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا اور اپنی مریل سی نگاہ میری نگاہ میں ڈالتے ہوئے اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔''

''.....ور بابو جی'' بھاگو نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا، ''اس کے کچھ عرصہ بعد وہ اتنا تڑپا، اتنا تڑپا کہ آج تک میں نے کسی مریض کو اس طرح جان توڑتے نہیں دیکھا ہوگا۔ اس کے بعد وہ مر گیا۔ کتنا اچھا ہوتا جو میں اسے اسی وقت جل جانے دیتا۔ اسے بچا کر میں نے اسے مزید دکھ سہنے کے لیے زندہ رکھا اور پھر وہ بچا بھی نہیں۔ اب ان ہی جلے ہوئے بازوؤں سے میں پھر اسے اسی ڈھیر میں پھینک آیا ہوں۔'' اس کے بعد بھاگو کچھ بول نہ سکا۔ درد کی ٹیسوں کے درمیان اس نے رُکتے رُکتے کہا، ''آپ جانتے ہیں وہ کس بیماری سے مرا؟ پلیگ سے؟ نہیں.....کونٹین سے.....کونٹین سے!''

اگرچہ ہمہ یاراں دوزخ کا خیال اس لامتناہی سلسلۂ قہر و غضب میں لوگوں کو کسی حد تک تسلی کا سامان بہم پہنچاتا تھا، تاہم مقہور بنی آدم کی فلک شگاف صدائیں تمام شب کانوں میں آتی رہتیں۔ ماؤں کی آہ و بُکا، بہنوں کے نالے، بیویوں کے نوحے، بچوں کی چیخ و پکار شہر کی اس فضا میں، جس میں کہ نصف شب کے قریب اُلّو بھی بولنے سے ہچکچاتے تھے، ایک نہایت الم ناک منظر پیدا کرتی تھی۔ جب صحیح و سلامت لوگوں کے سینوں پر منوں بوجھ رہتا تھا، تو اُن لوگوں کی حالت کیا ہوگی جو گھروں میں بیمار پڑے تھے اور جنھیں کسی یرقان زدہ کے مانند در و دیوار سے مایوسی کی زردی ٹپکتی دکھائی دیتی تھی اور پھر کوارنٹین کے مریض، جنھیں مایوسی کی حد سے گزر

کر ملک الموت مجسم دکھائی دے رہا تھا، وہ زندگی سے یوں چمٹے ہوئے تھے، جیسے کسی طوفان میں کوئی کسی درخت کی چوٹی سے چمٹا ہوا ہو، اور پانی کی تیز و تند لہریں ہر لحظہ بڑھ کر اس چوٹی کو بھی ڈبو دینے کی آرزومند ہوں۔

میں اس روز توہم کی وجہ سے کوارنٹین بھی نہ گیا۔ کسی ضروری کام کا بہانہ کر دیا۔ اگرچہ مجھے سخت ذہنی کوفت ہوتی رہی۔ کیوں کہ یہ بہت ممکن تھا کہ میری مدد سے کسی مریض کو فائدہ پہنچ جاتا۔ مگر اس خوف نے جو میرے دل و دماغ پر مسلّط تھا، مجھے پا بہ زنجیر رکھا۔ شام کو سوتے وقت مجھے اطلاع ملی کہ آج شام کو ارنٹین میں پانچ سو کے قریب مزید مریض پہنچے ہیں۔

میں ابھی ابھی معدے کو جلا دینے والی گرم کافی پی کر سونے ہی والا تھا کہ دروازے پر بھاگو کی آواز آئی۔ نوکر نے دروازہ کھولا تو بھاگو ہانپتا ہوا اندر آیا۔ بولا۔

''بابو جی.....! میری بیوی بیمار ہوگئی.....اس کے گلے میں گلٹیاں نکل آئی ہیں.....خدا کے واسطے اسے بچاؤ.....اس کی چھاتی پر ڈیڑھ سالہ بچہ دودھ پیتا ہے، وہ بھی ہلاک ہوجائے گا۔

بجائے گہری ہمدردی کا اظہار کرنے کے، میں نے خشمگیں لہجہ میں کہا۔

''اس سے پہلے کیوں نہ آسکے.....کیا بیماری ابھی ابھی شروع ہوئی ہے؟''

''صبح معمولی بخار تھا.....جب میں کونٹین گیا۔''

''اچھا.....! وہ گھر میں بیمار تھی۔ اور پھر بھی تم کوارنٹین گئے؟''

''جی بابو جی!'' بھاگو نے کانپتے ہوئے کہا۔ ''وہ بالکل معمولی طور پر بیمار تھی۔ میں نے سمجھا کہ شاید دودھ چڑھ گیا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی تکلیف نہیں۔ اور پھر میرے دونوں بھائی گھر پر ہی تھے.....اور سینکڑوں مریض کونٹین میں بے بس.....''

''تو تم اپنی حد سے زیادہ مہربانی اور قربانی سے جراثیم کو گھر لے ہی آئے نا۔ میں نہ تم سے کہتا تھا کہ مریضوں کے اتنا قریب مت رہا کرو۔ دیکھو میں آج اسی وجہ سے وہاں نہیں گیا۔ اس میں سب تمھارا قصور ہے۔ اب میں کیا کرسکتا ہوں۔ تم سے جانباز کو اپنی جانبازی کا مزہ بھگتنا ہی چاہیے۔ جہاں شہر میں سینکڑوں مریض پڑے ہیں۔''

بھاگو نے ملتجیانہ انداز سے کہا، ''مگر خداوند یسوع مسیح.....''

''چلو ہٹو..... بڑے آئے کہیں کے۔ تم نے جان بوجھ کر آگ میں ہاتھ ڈالا۔ اب اس کی سزا میں بھگتوں؟ قربانی ایسے تھوڑے ہی ہوتی ہے۔ میں اتنی رات گئے تمھاری کچھ مدد نہیں کرسکتا۔۔۔''

''مگر پادری لابے۔''

''چلو.....جاؤ.....پادری ل، آبے کے کچھ ہوتے۔''

بھاگو سر جھکائے وہاں سے چلا گیا۔ اس کے آدھ گھنٹہ بعد جب میرا غصہ رفو ہوا تو میں اپنی حرکت پر نادم ہونے لگا۔ میں عاقل کہاں کا تھا جو بعد میں پشیمان ہو رہا تھا۔ میرے لیے یہی یقیناً سب سے بڑی سزا تھی کہ اپنی تمام خودداری کو پامال کرتے ہوئے بھاگو کے سامنے گزشتہ رویہ پر اظہارِ معذرت کرتے ہوئے اس کی بیوی کا پوری جانفشانی سے علاج کروں۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور دوڑا دوڑا بھاگو کے گھر پہنچا۔ وہاں پہنچنے پر میں نے دیکھا کہ بھاگو کے دونوں چھوٹے بھائی اپنی بھاوج کو چارپائی پر لٹائے ہوئے باہر نکال رہے تھے۔ میں نے بھاگو کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''اسے کہاں لے جا رہے ہو؟ بھاگو نے آہستہ سے جواب دیا۔

''کونٹین میں۔''

''تو کیا اب تمھاری دانست میں کوارنٹین دوزخ نہیں..... بھاگو.....؟''

''آپ نے جو آنے سے انکار کر دیا، بابو جی.....! اور چارا ہی کیا تھا۔ میرا خیال تھا، وہاں حکیم کی مدد مل جائے گی اور دوسرے مریضوں کے ساتھ اس کا بھی خیال رکھوں گا۔''

''یہاں رکھ دو چارپائی۔ ابھی تک تمھارے دماغ سے دوسرے مریضوں کا خیال نہیں گیا؟ احمق.....؟''

چارپائی اندر رکھ دی گئی اور میرے پاس جو تیر بہ ہدف دوا تھی، میں نے بھاگو کی بیوی کو پلائی اور پھر اپنے غیر مرئی حریف کا مقابلہ کرنے لگا۔ بھاگو کی بیوی نے آنکھیں کھول دیں۔ بھاگو نے ایک لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''آپ کا احسان ساری عمر نہ بھولوں گا، بابو جی!''

میں نے کہا، ''مجھے اپنے گزشتہ رویہ پر سخت افسوس ہے بھاگو! ایشور تمھیں تمھاری خدمات کا صلہ تمھاری بیوی کی شفا کی صورت میں دے۔''

اسی وقت میں نے اپنے غیر مرئی حریف کو اپنا آخری حربہ استعمال کرتے دیکھا۔ بھاگو کی بیوی کے لب پھڑکنے لگے۔ نبض جو کہ میرے ہاتھ میں تھی، مدھم ہو کر شانہ کی طرف سرکنے لگی۔ میرے غیر مرئی حریف نے جس کی عموماً فتح ہوتی تھی، حسبِ معمول پھر مجھے چاروں شانے چت گرایا۔ میں نے ندامت سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''بھاگو! بدنصیب بھاگو!! تمھیں اپنی قربانی کا یہ عجیب صلہ ملا ہے..... آہ!''

بھاگو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

وہ نظارہ کتنا دل دوز تھا، جب کہ بھاگو نے اپنے بلبلاتے ہوئے بچے کو اس کی ماں سے ہمیشہ کے لیے علاحدہ کر دیا اور مجھے نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ لوٹا دیا۔

میرا خیال تھا کہ اب بھاگو اپنی دنیا کو تاریک پا کر کسی کا خیال نہ کرے گا۔ مگر اس سے اگلے روز

میں نے اسے بیش از پیش مریضوں کی امداد کرتے دیکھا۔ اس نے سینکڑوں گھروں کو بے چراغ ہونے بچا لیا۔ اور اپنی زندگی کو ہیچ سمجھا۔ میں نے بھی بھاگو کی تقلید میں نہایت مستعدی سے کام کیا۔ کوارنٹین اور ہسپتالوں سے فارغ ہو کر اپنے فالتو وقت میں نے شہر کے غریب طبقہ کے لوگوں کے گھر، جو کہ بدروؤں کے کنارے پر واقع ہونے کی وجہ سے، یا غلاظت کے سبب بیماری کے مسکن تھے، رجوع کیا۔

اب فضا بیماری کے جراثیم سے بالکل پاک ہو چکی تھی۔ شہر کو بالکل دھوڈالا گیا تھا۔ چوہوں کا کہیں نام ونشان دکھائی نہ دیتا تھا۔ سارے شہر میں صرف ایک آدھ کیس ہوتا جس کی طرف فوری توجہ دیے جانے پر بیماری کے بڑھنے کا احتمال باقی نہ رہا۔ شہر میں کاروبار نے اپنی طبعی حالت اختیار کر لی، اسکول، کالج اور دفاتر کھلنے لگے۔

ایک بات جو میں نے شدت سے محسوس کی، وہ یہ تھی کہ بازار میں گزرتے وقت چاروں طرف سے انگلیاں مجھی پر اٹھتیں۔ لوگ احسان مندانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے۔ اخباروں میں تعریفی کلمات کے ساتھ میری تصاویر چھپیں۔ اس چاروں طرف سے تحسین وآفرین کی بوچھار نے میرے دل میں کچھ غرور سا پیدا کر دیا۔

آخر ایک بڑا عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں شہر کے بڑے بڑے رئیس اور ڈاکٹر مدعو کیے گئے۔ وزیر بلدیات نے اس جلسہ کی صدارت کی۔ میں صاحبِ صدر کے پہلو میں بٹھایا گیا، کیوں کہ وہ دعوت دراصل میرے ہی اعزاز میں دی گئی تھی۔ ہاروں کے بوجھ سے میری گردن جھکی جاتی تھی اور میری شخصیت بہت نمایاں معلوم ہوتی تھی۔ پُرغرور نگاہ سے میں کبھی ادھر دیکھتا کبھی اُدھر۔ بنی آدم کی انتہائی خدمت گزاری کے صلہ میں کمیٹی، شکرگزاری کے جذبہ سے معمور ایک ہزار ایک روپئے کی تھیلی بطور ایک حقیر رقم میری نذر کر رہی تھی۔

جتنے بھی لوگ موجود تھے، سب نے میرے رفقائے کار کی عموماً اور میری خصوصاً تعریف کی اور کہا کہ گزشتہ آفت میں جتنی جانیں میری جانفشانی اور تن دہی سے بچی ہیں، ان کا شمار نہیں۔ میں نے نہ دن کو دن دیکھا، نہ رات کو رات، اپنی حیات کو حیاتِ قوم اور اپنے سرمایہ کو سرمایۂ ملت سمجھا اور بیماری کے مسکنوں میں پہنچ کر مرتے ہوئے مریضوں کو جامِ شفا پلایا۔ وزیر بلدیات نے میز کے بائیں پہلو میں کھڑے ہو کر ایک پتلی سی چھڑی ہاتھ میں لی اور حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے ان کی توجہ اس سیاہ لکیر کی طرف دلائی جو دیوار پر آویزاں نقشے میں بیماری کے دنوں میں صحت کے درجہ کی طرف ہر لحظہ افتاں وخیزاں بڑھی جا رہی تھی۔ آخر میں انھوں نے نقشہ میں وہ دن بھی دکھایا جب میرے زیرِ نگرانی چوّن (54) مریض رکھے گئے اور وہ تمام صحت یاب ہو گئے۔ یعنی نتیجہ سو فیصدی کامیابی رہا اور وہ سیاہ لکیر اپنی معراج کو پہنچ گئی۔

اس کے بعد وزیر بلدیات نے اپنی تقریر میں میری ہمت کو بہت کچھ سراہا اور کہا کہ لوگ یہ جان کر بہت خوش ہوں گے کہ بخشی جی اپنی خدمات کے صلہ میں لفٹیننٹ کرنل بنائے جا رہے ہیں۔

ہال تحسین وآفرین کی آوازوں اور پُرشور تالیوں سے گونج اُٹھا۔

ان ہی تالیوں کے شور کے درمیان میں نے اپنی پُرغرور گردن اٹھائی۔ صاحبِ صدر اور معزز حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک لمبی چوڑی تقریر کی، جس میں علاوہ اور باتوں کے میں نے بتایا کہ ڈاکٹروں کی توجہ کے قابل ہسپتال اور کوارنٹین ہی نہیں تھے، بلکہ ان کی توجہ کے قابل غریب طبقہ کے لوگوں کے گھر تھے۔ وہ لوگ اپنی مدد کے بالکل ناقابل تھے اور وہی زیادہ تر اس موذی بیماری کا شکار ہوئے۔ میں اور میرے رفقاء نے بیماری کے صحیح مقام کو تلاش کیا اور اپنی توجہ بیماری کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں صرف کردی۔ کوارنٹین اور ہسپتال سے فارغ ہوکر ہم نے راتیں ان ہی خوفناک مسکنوں میں گزاریں۔

اسی دن جلسہ کے بعد جب میں بطور ایک لفٹیننٹ کرنل کے اپنی پُرغرور گردن کو اُٹھائے ہوئے، ہاروں سے لدا پھندا، لوگوں کا ناچیز ہدیہ، ایک ہزار ایک روپے کی صورت میں جیب میں ڈالے ہوئے گھر پہنچا، تو مجھے ایک طرف سے آہستہ سی آواز سنائی دی۔

''بابو جی.....! بہت بہت مبارک ہو۔''

اور بھاگو نے مبارک باد دیتے وقت وہی پُرانا جھاڑو قریب ہی کے گندے حوض کے ایک ڈھکنے پر رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں سے منڈاسا کھول دیا۔ میں بھونچکا سا کھڑا رہ گیا۔

''تم ہو.....؟ بھاگو بھائی!'' میں نے بہ مشکل تمام کہا۔

''دنیا تمھیں نہیں جانتی بھاگو، تو نہ جانے..... میں تو جانتا ہوں۔ تمھارا یسوع تو جانتا ہے..... پادری ل، آبے کے بے مثال چیلے..... تجھ پر خدا کی رحمت ہو.....!''

اس وقت میرا گلا سوکھ گیا۔ بھاگو کی مرتی ہوئی بیوی اور بچے کی تصویر میری آنکھوں میں کھچ گئی۔ ہاروں کے بارِگراں سے مجھے اپنی گردن ٹوٹتی ہوئی معلوم ہوئی اور بٹوے کے بوجھ سے میری جیب پھٹنے لگی۔ اور..... اتنے اعزاز حاصل کرنے کے باوجود میں بے توقیر ہوکر اس قدر شناس دنیا کا ماتم کرنے لگا۔

◀◀ ● ▶▶

● شموئل احمد

قصاب کی محبوبہ

سادھونی جبّار قصاب کی محبوبہ تھی۔ وہ بھاری جسموں والی عورت تھی۔ آنکھیں چھوٹی اور گول تھیں۔ قصاب کو ان میں جھیل سی گہرائی نظر آتی۔ ہونٹ باریک تھے اور سینہ تھل تھل تھا۔ اس کے چہرے پر ملائمت ملی عجیب سی کرختگی تھی۔ ایسا لگتا ابھی شعلہ ہے ابھی شبنم ہوجائے گی۔ لیکن قصاب کو اس کی ناک پسند نہیں تھی جو بدھنی کی ٹونٹی کی طرح اوپر اٹھی ہوئی تھی کہ نتھنے نمایاں ہوگئے تھے۔ نظر پہلے نتھنوں پر پڑتی اور جبّار قصاب کو لگتا وہ جڑواں سرنگ کے دہانے پر کھڑا ہے۔ اس کے جی میں آتا نتھنوں میں انگلی پھرا کر دیکھے..... لیکن پھر اپنے اس خیال پر اس کو کراہیت سی محسوس ہوتی۔ وہ سرنگ سے نظریں ہٹا کر اجھیل میں جھانکنے لگتا۔

جبّار تھا تو قصاب لیکن چہرے پر معصومیت تھی۔ رنگ سانولا تھا آنکھیں شگفتہ تھیں۔ بال گھنگھریالے تھے۔ جسم بھرا بھرا تھا اور بازوؤں کی مچھلیاں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ ہنستا تو جامنی ہونٹوں کے درمیان دانت موتیوں کی طرح چمکتے۔ اس نے دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی پھر خاندانی پیشے سے لگ گیا تھا۔ وہ صبح کا اخبار ضرور پڑھتا اور چٹ پٹی خبروں پر سر دھنتا۔

لیکن محبوبہ کی ایک بات ایسی تھی کہ قصاب لطف بھی لیتا اور گھٹن بھی محسوس کرتا۔

محبوبہ عالم بالا میں ہوتی تو اول فول بکتی۔ منہ سے اس قسم کے کلمات ادا ہوتے۔'' ارے کصیّہ..... ارے حرامی..... ہائے ری ہائے..... مار ڈالا رے مار ڈالا..... ہو..... ہو..... ہو..... ارے تیری بہن کو مہیشوا اٹھا کر لے گیا..... تیری بہن چھنال..... ارے منہ جھونسہ.....!'' قصاب اس کی بکواس کو ان سنی کر دیتا لیکن لطف اندوز بھی ہوتا۔ اس کی ہو ہائے مزہ دیتی۔ اس کو برا بھی لگتا کہ بہن کے بارے میں اول فول بک رہی ہے لیکن اس کی بکواس کو وہ کسی نہ کسی واقعہ سے جوڑ کر بھی دیکھتا تھا۔ مثلاً جھگی جھوپڑی میں جو دلت لڑکی رہتی تھی اس کو سورن اٹھا کر لے گئے تھے لیکن بات سورنوں کی تھی اس لیے معاملہ رفع دفع ہوگیا تھا۔ قصاب کو لگتا سادھونی نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس نے سادھونی کی بات گرچہ ان سنی کر دی تھی لیکن گھر آیا اور بہن پر نظر پڑی تو اسے تشویش ہوئی۔ بہن کے بارے میں ایسا کیوں کہا ؟ وہ مہیش سنگھ کو جانتا تھا۔ وہ علاقے کا مشہور غنڈہ تھا۔ دلت لڑکی کی اجتماعی عصمت دری میں وہ بھی شریک تھا۔ سادھونی

کے بنگلے میں اس کا آنا جانا تھا۔اس نے خود کو سمجھایا کہ اس کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔تشویش کی کوئی بات نہیں تھی پھر بھی اس نے بہن کو سختی سے منع کیا کہ گھر سے باہر نہیں نکلے گی۔

محبوبہ عالم بالا سے اترتی تو سب کچھ بھول جاتی۔اسے یاد نہیں رہتا کہ کیا بک رہی تھی۔ وہ شبنم ہو جاتی اور قصاب کے چونچلے کرتی۔'' ہائے ری کصیّہ..... بڑا تیز تیرا چھرا...جگ جگ جیئے میرا یارا.....!'' وہ اسے کا جو کھلاتی اور گرم دودھ پلاتی۔اور جبّار قصاب کو لگتا کوئی پھولوں بھری وادیوں سے اسے آواز دے رہا ہے۔وہ خوش ہوتا کہ کوئی چاہنے والا بھی ہے۔

سادھونی سے قصاب کی پہلی ملاقات سائیں مندر کی سیڑھیوں پر ہوئی تھی۔وہ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔سادھونی اتر رہی تھی۔اس کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔وہ بھی ٹھٹھک گیا۔لیکن پھر آگے بڑھ گیا تھا۔وہ پجاری کو پھولوں کا ہار دے کر لوٹا تو سادھونی سیڑھی پر ہی کھڑی تھی۔اس نے قصاب کو ٹوکا۔

'' تو یہاں کیسے.....؟ تو تو قصائی ہے۔''

قصاب کو حیرت ہوئی۔اس نے پہچانا کیسے.....؟ وہ ایسے کپڑے بھی نہیں پہنے ہوا تھا کہ پہچانا جاتا، پھر بھی اس نے سکون سے جواب دیا۔

''پجاری جی کو پھول دینے آیا تھا۔''

''اچھا.....؟ تو پھول کب سے بیچنے لگا؟''

''جب سے جوگی جی نے بوچڑ خانے بند کیے۔''

واہ جی واہ !بوچڑ خانے بند ہوئے تو قصائی مالی ہوگیا۔لیکن یہ تو ہندوؤں کا مندر ہے۔یہاں تیرا کیا کام؟''

اس کے جی میں آیا جواب دے کہ سائیں تو مسلمان تھے۔بھکتوں نے انہیں بھگوان بنا دیا۔''لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور آگے بڑھ گیا۔

اور یہ حقیقت تھی۔بوچڑ خانے بند ہوئے تو اس کے پاس کوئی روزگار نہیں تھا۔جبّار کے ماموں کی پٹنہ میں دکان تھی۔اس نے جبّار کو پٹنہ بلایا کہ یہاں کاروبار سنبھالے۔لیکن جبّار پٹنہ جانا نہیں چاہتا تھا۔اس کو خدشہ تھا کہ وہاں گیا تو ماموں کی کانی لڑکی سے شادی کرنی پڑے گی۔اس نے سائیں کے چرن پکڑ لیے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ سائیں سے جو مانگو ملے گا۔وہ مسلم صوفی تھے لیکن مندر بھی جایا کرتے تھے۔جس مسجد میں رہتے تھے اس کا نام دوار کا مائی رکھ دیا تھا۔سائیں مندر میں دیوی دیوتاؤں کے ساتھ سائیں کی بھی آرتی اتاری جاتی تھی جس پر اچاریہ جی کو اعتراض تھا۔انہوں نے فرمان جاری کیا تھا کہ ہندو دیوی دیوتاؤں کے ساتھ سائیں کی آرتی نہیں اتاری جاسکتی ورنہ سائیں بھکتوں پر گنگا اشنان تنگ کر دیا جائے گا۔لیکن بھکتوں

پر کوئی اثر نہیں ہوا۔آرتی بھی اتارتے رہے اور گنگا اشنان بھی کرتے رہے۔

قصاب کو سائیں سے عقیدت تھی۔اس نے مندر میں پرارتھنا کی کہ سائیں راستہ سجھاؤ.....کیا کروں۔مندر سے باہر آیا تو ایک لنگڑے کو پھول بیچتے دیکھا۔سمجھ گیا سائیں کا اشارہ ہے پھول بیچو۔اس نے جمع پونجی سے مندر کے بازو میں پھولوں کی دکان کھولی۔شروع شروع میں اس بات کا خدشہ تھا کہ لوگ یہاں بیٹھنے نہیں دیں گے۔لیکن پجاری نے اس کا ساتھ دیا۔اس نے سمجھایا کہ سائیں مندر میں اونچ نیچ اور ذات پات کا کوئی بھید نہیں ہے کوئی بھی مندر آسکتا ہے اور ماتھا ٹیک سکتا ہے۔سائیں کہا کرتے تھے اللہ مالک سب کا مالک۔ان کا قول تھا تم مجھے دیکھو میں تمہیں دیکھوں گا۔

جبّار کی دکان چل پڑی۔شادی بیاہ میں منڈپ سجانے کا کام ملنے لگا۔کبھی دلہے کی گاڑی سجاتا کبھی شب عروسی کی پلنگ۔کبھی پریمی جوڑے گلدستے خرید کر لے جاتے۔ ایک بار کسی راج نیتا نے اسے مہنگائی ورودھی ریلی میں بلایا اور کٹ آوٹ اور دروازہ سجانے کا کام دیا۔لیکن اس کام میں اسے خسارہ اٹھانا پڑا۔نیتا نے اسے دام کے بھی دام نہیں دیئے۔یہ کہہ کر ٹرخا دیا کہ مہنگائی ورودھی ریلی میں تو اتنے مہنگے پھول بیچے گا.....؟ وہ نامراد واپس لوٹ گیا۔

وہ مندر میں پجاری کو باقاعدہ پھولوں کی مالا فراہم کراتا تھا لیکن پیسے نہیں لیتا تھا۔اچاریہ جی کے اعلان کے بعد سادھونی مندر نہیں آتی تھی۔اس نے اپنے بنگلے پر ہنومان جی کا مندر بنایا تھا اور آرتی اتارتی تھی لیکن ادھر سے گزرتی ضرور تھی اور اکثر اس پر نگاہ غلط بھی ڈالتی۔قصاب بھی اسے کنکھیوں سے دیکھتا تھا۔نظر پہلے سرنگ پر پڑتی پھر نیچے پھسلتی.....پھر نیچے.....اس کا تھل تھل سینہ.....

ایک دن سادھونی نے آدمی بھیج کر بنگلے پر بلوایا۔وہ ڈر گیا۔ بنگلے پر کیوں بلوایا؟ کہیں دکان اٹھانے کے لیے تو نہیں کہے گی.؟ ایسا تو نہیں کہ وہ ان کی نگاہوں میں کھٹکنے لگا ہے؟ لیکن یہی وہ گھڑی تھی جب کلیاں چٹکیں اور باد صبا کے جھونکے چلے۔قصاب بنگلے پر پہنچا تو سادھونی مسکرا رہی تھی۔اس کے چہرے پر کرختگی کے آثار نہیں تھے۔قصاب کو اطمنان ہو کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔سادھونی نے اسے گلاب کے پھولوں سے ہنومان جی کا مندر سجانے کے لیے کہا۔اس وقت اس کے پاس صرف گیندے کے پھول تھے۔اس نے دو پہر تک کا وقت مانگا اور سہ پہر میں گلاب کی ٹوکری لیے پہنچ گیا۔ بہت جتن سے مندر کی دیواروں پر پھول سجائے اور دروازے پر بھی گلاب کی مالا ڈالی۔سادھونی کمر پر دونوں ہاتھ رکھے کھڑی اس کا کام دیکھتی رہی۔سادھونی کی موجودگی میں وہ سہج محسوس نہیں کر رہا تھا۔وہ اس کے بہت قریب کھڑی تھی اور مسلسل مسکرا رہی تھی۔ پھر بھی انہماک سے اپنے کام میں لگا رہا۔ایک بار پھولوں میں دھاگہ پروتے ہوئے ہاتھ کھینچا تو سادھونی کے کولہے سے مس ہوگیا۔ہاتھ بہت غلط انداز سے ٹکرایا تھا۔اس نے کولہے کا

لمس بہت صاف محسوس کیا تھا۔ وہ مسکرائی۔

''کیا رے.....؟ کھر بچّے پر چھرا.....؟''

وہ سمجھ نہیں سکا کہ سادھونی کیا کہہ رہی ہے۔ دھاگہ دوسری بار کھینچا تو ہاتھ پھر ٹکرایا۔ سادھونی ہنس پڑی۔

''اوئی ماں.....فساد کرائے گا کیا؟'' اور اس نے قصاب کے کولہے پر دھپ لگایا۔

قصاب گھبرا گیا۔ اس کی نیت قطعی نہیں تھی کہ ایسا کرے۔ سادھونی مسلسل ہنس رہی تھی۔ اس نے ایک اور دھپ لگایا۔

''رے کصیّا.....اپنا چھرا سمبھال کر رکھ !'' قصاب نے ایک بار اس کی طرف دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔

سادھونی نے اس کے گال سہلائے۔ ''بڑا بھولا ہے ری تو۔''

اس بار وہ مسکرائے بغیر نہیں رہا۔ سادھونی نے بہت سے پیسے دیئے۔ ایک بار پھر گال سہلائے اور سرگوشیوں میں بولی۔

'' اتوار کو دوپہر میں آنا۔''

''اور سن.....مانس مت کھایا کر۔ لہسن پیاز بھی نہیں۔''

جبّار حیران تھا۔ سادھونی کی سرگوشی نے اس میں عجیب سی گدگدی پیدا کر دی تھی۔ گھر آیا تو ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ بار بار سادھونی کی ادائیں یاد آ رہی تھیں....وہ اس کی سرگوشی، وہ اس کے گال سہلانا.....وہ ابھی تک اپنے گالوں پر اس کی انگلیوں کا لمس محسوس کر رہا تھا۔ کھر بچّے پر چھرا.....کھر بچّے پر یا تر بچّے پر.....؟ ہا.....ہا.....ہا..... وہ اس طرح خوش تھا جیسے لاکھوں کی لاٹری ہاتھ لگ گئی ہو۔

اگلے اتوار کو اس نے غسل کیا۔ ناریل کے تیل سے بالوں کو سونٹا۔ ایک سیاہ رنگ کی جینس تھی جسے وہ وقتاً فوقتاً استعمال کرتا تھا۔ اس نے یہی جینس پہنی۔ ایک سفید ٹی شرٹ اسے بہت پسند تھی۔ لیکن آستین پر داغ تھا۔ پھر بھی یہی شرٹ زیب تن کر بنگلے پر پہنچ گیا۔ دوراز ے کے قریب ایک بار پھر جیب سے کنگھی نکال کر بالوں کو سونٹا اور اندر داخل ہوا۔

سادھونی جیسے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے بال کھلے تھے۔ اس نے نائٹی پہن رکھی تھی۔ اوپر کے دو بٹن کھلے تھے۔ قصاب کو دیکھ کر مسکرائی اور گالوں میں چٹکی لی۔

''ارے واہ ! پورا جینٹل مین ہو گیا ہے۔''

سادھونی زیادہ صبر نہیں کر سکی۔ ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے گئی اور لیے دیئے پلنگ پر

گری۔ قصاب نے اسے بانہوں میں بھرا اور منہ چومنا چاہا لیکن سادھونی نے اس کا منہ پرے کر دیا۔

'' مانس مانس مہکتا ہے۔'' وہ ناک پر رومال رکھتی ہوئی بولی۔ نتھنے اور واضح ہو گئے۔ قصاب نے بے اختیار اپنی انگلی نتھنے میں ڈالی۔ سادھونی کو چھینک آ گئی۔

'' کیا کرتا ہے ری تو.....؟'' اس نے گالوں پر ہلکی سی چپت لگائی۔ قصاب ہنسنے لگا۔

''نتھنیا پہ گولی مارے!''

''سیّاں ہمار!'' سادھونی نے مسکرا کر فقرہ پورا کیا۔

قصاب نے پھر سادھونی کو دبوچا اور ہونٹوں پر جھکا تو اس نے پھر اس کا منہ پرے کر دیا اور چھاتیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''ادھر!''

یہ وصال کی پہلی گھڑی تھی۔ معشوقہ عالم بالا میں پہنچی لیکن بہت اول فول سے کام نہیں لیا۔ صرف ہائے ہو کر کے رہ گئی۔ نیچے اتری تو چونچلے کیے۔ معشوق کے گال سہلائے۔ گرم دودھ پلایا اور بولی۔

''مانس کھانا چھوڑ دے۔ لہسن پیاز بھی۔''

''کا جو کھایا کر۔''

''بہت مہنگا ہے۔''

''میں ہوں نہ.....!'' اور اس نے قصاب کو پھر لپٹا لیا۔

معشوق جانے لگا تو پیسے دیئے اور سرگوشی کی۔

''بدھ وار کو آنا۔''

بدھ وار! قصاب نے گدگدی سی محسوس کی۔ سرگوشیوں کا انداز ایسا تھا کہ اس کو سہرن سی ہوتی تھی۔ وہ بدھ وار کو وقت سے پہلے پہنچ گیا۔ اس بار گلدستہ لے گیا۔ سادھونی خوش ہوئی۔ اسے مالی کہہ کر پکارا۔

''ہائے ری میرا مالی.....! اچھا ہوا جو تو نے پھولوں کا کاروبار شروع کیا ورنہ وہ بھی کوئی دھندہ تھا.....نردوش پشو کی ہتّیا.....؟

اس دن عالم بالا میں وہ ایسی بات کہہ گئی کہ قصاب کو کوفت کا احساس ہوا۔

''ارے حرامی.....ارے کصیّا.....ہائے.....ہائے.....بڑا تیز تیرا چھر..... ہو..... ہو..... ہو.....ارے کٹوا.....گاڑی کے نیچے پلّہ آ جائے تو افسوس ہوتا ہے.....ارے کمینہ..... تجھے کپڑوں سے پہچانیں گے.....ہائے.....ہائے.....ہائے.....!''

اس کو یاد آ گیا یہ مکھیا جی کا قول تھا۔ مکھیا جی اسے پسند تھے۔ ودیش بھرمن کرتے اور مور کو دانہ دیتے۔ آج کل داڑھی بڑھالی تھی اور سنت لگتے تھے۔ کہتے بھی تھے۔ ''میرا کیا ہے؟ فقیر ہوں جھولا اٹھاوں

گا اور چل دوں گا۔''

اس کو دکھ ہوا۔ کٹھوا کہتی ہے۔ لیکن خاموش رہا۔ پیسے لیے اور دودھ پی کر گھر آ گیا۔

ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ بکواس کرتی رہی اور وہ دودھ پیتا رہا۔ پیسے ملتے رہے۔ پھر بھی اس کو احساس ہوتا کہ وہ مکھی کی طرح مکڑی کے جال میں پھنسا ہوا ہے۔ اس جال سے نکلنا مشکل ہے۔ وہ ایک طرح سے اس کی چاکری کر رہا ہے۔ لیکن پھر خود کو سمجھاتا کہ اس میں حرج ہی کیا ہے۔ اب تک تو اس کا نقصان نہیں ہوا۔ الٹے پیسے ملتے ہیں۔ وہ اس کا نقصان کرے گی بھی نہیں۔ وہ اس سے پیار کرتی ہے۔ کس طرح چونچلے کرتی ہے.....؟ بس اس کی بکواس کو سہہ لینا ہے۔

لیکن ایک دن بات برداشت سے باہر ہوگئی۔ اس کی خالہ کو گالی پڑی۔

ارے منھ جھونسوا.....ارے سوئر..... ارے حرامی..... تیری موسی کتّے کے ساتھ پکڑی گئی۔ ہو.....ہو.....ہو.....!

قصاب کی طبیعت مکدّر ہوگئی۔ عجب اتّفاق تھا کہ خالہ کتّا رکھتی تھی۔ قصاب کو بہت غصّہ آیا۔ محبوبہ ہوش میں آئی تو احتجاج کر بیٹھا۔

'' تو اول فول کیوں بکتی ہے؟''

'' کچھ نہیں بکتی میں !''

''میری موسی کو گالی کیوں دی؟''

''ہو.....ہو.....ہو....بھلا گالی کیوں دینے لگی ؟''

''یاد کر کیا بک رہی تھی؟''

''بھگوان کسم کچھ یاد نہیں ہے۔

''تو جھوٹ بول رہی ہے۔''

''ہائے میرا مالی.....میرا دُلارا.....لے، کا جوکھا.....!'' سادھونی نے کاجو کی پلیٹ سامنے رکھ دی۔

قصاب خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ انتہائی نفرت سے اس نے سوچا کہ اب وہ بھی اول فول بکے گا۔ مثلاً یہ کہ تیری ماں سوئر کے پاس گئی تو تو جنمی۔

سادھونی نے اسے سمبار کے دن بلایا اور سمبار کے روز وہ سکتے میں آ گیا۔

اس دن اس نے نیا لباس زیب تن کیا تھا اور عطر لگایا کہ سادھونی خوشبو کو محسوس کرے اور اس کا منہ پرے نہیں کرے۔ وہ ایک بڑا سا گلدستہ لے کر پہنچا تھا۔ سادھونی مسکرائی۔

''کیا بات ہے ؟ بڑا خوشبو مہک رہا ہے۔'' جواب میں قصاب مسکرایا۔

''نماز پڑھ کر آ رہا ہے؟'' قصاب ہنسنے لگا۔

اس بار سادھونی نے اس کا منہ پرے نہیں کیا۔ قصاب نے محبوبہ کے ہونٹوں کا طویل بوسہ لیا۔

محبوبہ عالم بالا میں پہنچی تو قصاب کو کاٹھ مار گیا۔

''ہائے ری کصیّا.....ارے اتنے کم لوگ کیسے مرے.....؟ کہاں پر سائکل کھڑی کی.....بیچ بازار میں کھڑا کرتا.....ہائے.....ہائے.....ہوہوہو.....کصیّا.....پاپی.....سوئر کا جنا.....کتّے کی اولا.....!''

محبوبہ عالم بالا سے اُتری تو حسب معمول قصاب کا دلار کرنے لگی لیکن وہ جیسے سکتے میں تھا۔ اس کو مالیگاؤں کی مسجد یاد آ گئی جہاں بم دھماکے سے کئی نمازی شہید ہوئے تھے۔ اس کو پہلی بار سادھونی کا چہرہ ڈراونا محسوس ہوا۔ اس کو لگا سادھونی ایک دیونی ہے جو اس کو تھوڑا تھوڑا چکھتی ہے اور ایک دن نگل جائے گی۔ سادھونی نے دودھ لا کر دیا تو اس نے خاموشی سے پی لیا۔ وہ کوئی ردّعمل ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک دم بت بنا رہا۔ سادھونی نے اگلے اتوار کو بلایا۔

جبّار قصاب گھر آیا تو آنکھیں پرنم تھیں۔ دل درد کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب رہا تھا۔ اس کو لگا اس عورت سے وابستہ ہو کر گناہ عظیم کا مرتکب ہوا ہے۔ اس نے شہدا کی روح میں زخم لگایا ہے۔ کس طرح کہتی تھی.....اتنے کم لوگ کیسے مرے.....؟ کہاں پر سائکل کھڑی کی.....؟ اس کے جی میں آیا چیخ چیخ کر روئے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگے۔

اگلے اتوار کو قصاب بنگلے پر نہیں گیا۔ لیکن وہ فکرمند تھا کہ پیچھا آسانی سے نہیں چھوٹے گا۔ وہ ضرور کسی کو بھیجے گی۔ اور اس نے مہیش سنگھ کو بلانے کے لیے بھیجا۔ اس نے بیماری کا بہانہ بنایا۔ قصاب کو مہیش سنگھ سے خوف محسوس ہوا۔ وہ اس کے گھر میں گھس سکتا تھا۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ وہ مہیش سنگھ کا کیا بگاڑ لیتا ؟ بہتری اسی میں ہے کہ شہر چھوڑ دیا جائے۔

قصاب نے چپکے سے دکان سمیٹی اور پٹنہ چلا آیا۔ یہاں اس نے ماموں کا کاروبار سنبھالا اور کانی لڑکی سے شادی کر لی۔

◀◀ ● ▶▶

201, lily Blossom Apartment, Attapur,
Chintalmet,Road,in front of pillar no 177,
Next to SDR PEARL PALACE
Hyderabad 500048 Telanga
Mob 9835299303

● اسرار گاندھی

ہڈیاں

اس کی زندگی ہڈیوں کے درمیان اُلجھ کر رہ گئی تھی۔

ہڈیاں جو اہم بھی ہیں اور غیر اہم بھی۔

جب سے اُس کی زندگی اور زندگی کی تمام خوشیاں ہڈیوں کے درمیان اُلجھ کر رہ گئی تھیں، اسے سوتے جاگتے ہر وقت اپنے گرد ہڈیوں کا رقص نظر آنے لگا تھا۔

اس کا جسم کبھی سکڑنے لگتا، کبھی پھیلنے لگتا، کبھی بے جان سا ہو جاتا۔ مگر ہڈیوں کا رقص اسی طرح ہوتا رہتا۔ کبھی آہستہ، کبھی تیز۔

اس کی زندگی ہڈیوں کے درمیان لٹک کر رہ گئی تھی۔

اچانک ایک جیٹ تیزی سے اس کے سر پر سے گذرا اور دور خلاؤں میں کہیں گم ہو گیا۔ اس نے نظریں دور آسمان کی طرف اُٹھائیں تو خلا میں صرف غلیظ دھوئیں کی ایک لکیر رہ گئی تھی جو اَب آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ مگر اس کے کانوں میں اب بھی جیٹ کی آواز گونج رہی تھی۔ اس کے کان بڑے حسّاس تھے اور نظریں بڑی تیز۔ دادی ماں جیسی نہیں، جن کو نہ تو جیٹ دکھائی پڑتا تھا اور نہ جیٹ کی آواز سنائی پڑتی تھی۔

وہ ہمیشہ سوچتی کہ اس کی دادی ماں کتنی عجیب ہیں۔ بالکل میوزیم میں رکھنے کے لائق اور اسے ہمیشہ اپنے اس خیال پر ہنسی بھی آجاتی۔ اس نے دوبارہ آسمان کی جانب دیکھا تو دھوئیں کی لکیر بھی فضا میں یوں گھل مل گئی تھی جیسے جسم مٹّی میں گھل مل جاتا ہے اور کسی کو خبر تک نہیں ہوتی۔

وہ جب آنگن سے کمرے کی جانب مُڑی تو اس کی آنکھیں کمرے سے آتی ہوئی دادی ماں کی آنکھوں سے ٹکرا گئیں اور اسے عجیب سی بے چینی محسوس ہوئی۔ اس کی آنکھیں جب بھی دادی ماں کی آنکھوں سے ٹکرا جاتیں اُسے ہمیشہ یوں ہی بے چینی محسوس ہوتی تھی۔ اسے لگتا کہ جیسے دادی ماں کی آنکھیں پھیل کر بڑی سی اسکرین بن گئی ہوں اور اُس پر ہڈیوں کا رقص ہو رہا ہو۔

اسے اس وقت بھی یوں ہی لگا۔

وہ تیزی سے کمرے میں چلی آئی اور بدحواس ہو کر بستر پر گر پڑی۔ اسے دادی ماں سے چڑ سی ہو گئی تھی کہ ہڈیوں کا یہ رقص پہلی بار دادی ماں کی پُتلیوں سے ہی شروع ہوا تھا۔

دادی ماں..... جو جیٹ کی آواز نہیں سن سکتیں۔

دادی ماں..... جو میوزیم میں رکھنے کے قابل ہیں۔

''اگر دادی ماں مر جائیں تو ہڈیوں کا یہ رقص بند ہو سکتا ہے۔'' اس نے جل کر سوچا مگر دادی ماں مرنے کے بجائے جب خاموشی سے ہاتھ میں کوئی چیز لیے کمرے میں داخل ہوئیں تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور دل چاہا کہ وہ ان کے جھرّیوں سے بھرپور چہرے کو اپنے نکیلے ناخنوں سے نوچ ڈالے۔

ایسا نہیں تھا کہ اسے بچپن سے ہی دادی ماں سے نفرت رہی ہو۔ اسے تو اس وقت بھی نفرت نہیں ہوئی تھی کہ جب آہستہ آہستہ اسے اپنے جسم میں ایک انجانی سی اُتھل پُتھل محسوس ہونی شروع ہوئی تھی..... ایک نامانوس سی اینٹھن..... تناؤ..... میٹھا میٹھا درد..... اور نہ جانے کیا کیا۔

نفرت تو اسے اس وقت بھی نہیں ہوئی تھی جب اچانک ایک دن اس پر ایک اُفتاد ٹوٹ پڑی تھی اور اس کی ماں نے اسے دیر تک سمجھاتے ہوئے کہا تھا کہ اب تمھاری زندگی کا دوسرا دور شروع ہو چکا ہے اور تمھیں بہت سمجھداری سے رہنا ہوگا۔

نفرت تو اسے اس وقت سے ہوئی جب اچانک ایک دن دادی ماں کے گلے میں ایک سیدھی سی ہڈی اٹک گئی تھی۔

ہڈی..... جو صرف ہڈی ہوتی ہے اور کچھ نہیں۔

ہڈی..... جو بوڑھوں کے گلے میں اکثر اٹک جاتی ہے۔

ہڈی..... جو دادی ماں کے گلے میں بھی اٹک گئی تھی اور پھر رقص شروع ہو گیا تھا۔

اور اس طرح ذات پات کی کئی ہڈیاں یکے بعد دیگرے دادی اماں کے گلے میں اٹکتی چلی گئیں اور اس کی شادی ٹلتی چلی گئی۔ ہڈیاں جو صرف ہڈیاں ہوتی ہیں۔

جون کا سورج اپنی تمام تر خباثتوں سمیت پچھّم میں دفن ہو رہا تھا۔ وہ کھڑکی پر کھڑی ہمیشہ کی طرح آج بھی آسودہ نظروں سے سورج کے زوال کو دیکھ رہی تھی۔

کھڑکی کے نیچے سے گذرتی ہوئی سڑک آہستہ آہستہ بارونق ہوتی جا رہی تھی۔ کاروں کا شور بڑھنے لگا تھا۔ اچانک اس کی نظریں اس آدمی پر ٹِک گئیں جو سر سے پیر تک ننگا، کالا بھجنگ اور ہٹّا کٹّا تھا۔ اس کے پورے جسم پر بالوں کے گچھے ہی گچھے تھے۔

سر پر بالوں کے گُچھے ..... چہرے پر بالوں کے گُچھے ..... سینے پر بالوں کے گُچھے ..... سینے سے نیچے..... نیچے.....اور نیچے.....اور.....

اس کے جسم پر بالوں کے گُچھے ہی گُچھے تھے۔ منہ سے رال ٹپک رہی تھی اور چہرے پر مکھیاں بھن بھنا رہی تھیں۔ یہ وہی پاگل تھا جو دن بھر اِدھر سے اُدھر گھومتا پھرتا۔

اسے اس آدمی کو دیکھ کر بڑی کراہیت محسوس ہوئی لیکن جیسے جیسے اس کی نگاہیں سینے سے نیچے کی طرف اُتر رہی تھیں اسے اپنے اندر ایک بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی جیسے سر سے پیر تک اور پیر سے سر تک چونٹیاں ہی چونٹیاں رینگ رہی ہوں اور جسم کے اندر کوئی گرم گرم سا سیّال دوڑ رہا ہو۔ سارا وجود دھیرے دھیرے بے قابو ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے لگا کہ اس کا پورا جسم کسی رقیق شے میں تبدیل ہوتا جا رہا ہو اور وہ قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہو۔ چمکتے ہوئے چکنے چکنے قطرے جس پر کوئی پاؤں رکھ دے تو پھسل کر کسی نشیب میں جا پڑے۔

وہ آدمی بھیڑ میں کہیں دور گم ہو گیا۔

اس کے اندر کا ہیجان اب دھیرے دھیرے ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ ویسے اس کے جسم کے ریشوں ریشوں میں اب بھی ہلکی ہلکی سی تھرتھراہٹ باقی تھی۔ جیسے وِینا کے تار چھو لینے کے بعد دیر تک لرزتے رہتے ہیں۔

وہ اس کیفیت سے چھٹکارا پانے کے لیے کمرے میں رکھی ہوئی چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔ سامنے میز پر ٹیبل لیمپ رکھا ہوا تھا جس کا شیڈ سرخ رنگ کا تھا۔

رات جب بلب روشن ہوتا تو ہر طرف سرخی سی پھیل جاتی اور یہی سُرخی تو اس کے بدن میں بھی دوڑ رہی تھی.....تیز.....جلتی ہوئی.....آگ کی طرح مگر اس میں روشنی کہاں تھی۔ روشنی تو ٹیبل لیمپ کے جلتے ہی بکھر جاتی۔

شیلف پر کتابیں رکھی تھیں مگر ان کتابوں میں اس کے لیے کیا رکھا تھا۔ یہ کتابیں اس کے اندر کی بھبکتی ہوئی جوالا کو نہیں بجھا سکتی تھیں اور کونے میں رکھا ہوا شمع دان جس میں ادھ جلی سی مومی شمع لگی ہوئی تھی۔

گول.....سڈول.....خوبصورت سی.....

شمع.....جو تاریکی مٹاتی ہے۔

اور تاریکی.....جس سے ہیجان پیدا ہوتا ہے۔

پھر شمع دان سے اس کی نظریں ہٹیں تو میز پر جا رکیں، جس پر کالے رنگ کا خوبصورت میز پوش بچھا ہوا تھا اور یہی کالا رنگ تو اس پاگل کے بالوں کا بھی تھا جو سر سے پیر تک ننگا تھا۔ جس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی اور جس کے جسم پر بالوں کے گُچھے ہی گُچھے تھے۔

سر پر بالوں کے گُچھے ..... چہرے پر بالوں کے گُچھے ..... سینے پر بالوں کے گُچھے ..... سینے سے نیچے..... نیچے.....اور نیچے.....اور.....

اس کے جسم پر بالوں کے گُچھے ہی گُچھے تھے۔

اس کا جسم پھر بے قابو ہونے لگا۔

اس کی نظروں نے کمرے میں رکھی ہوئی چیزوں کا دوبارہ جائزہ لینا شروع کیا۔

ٹیبل لیمپ اور اس میں لگا ہوا سُرخ رنگ کا شیڈ، شلف میں لگی ہوئی کتابیں، میز پر بچھا ہوا کالا مگر خوبصورت میز پوش اور.....اور کونے میں رکھا ہوا شمع دان اور شمع دان میں ایک ادھ جلی، خوبصورت سڈول مومی شمع۔

اس کی نگاہیں شمع دان پر ٹک گئیں۔

رات کے ابھی دس ہی بجے تھے کہ اچانک بجلی چلی گئی اور پورے گھر میں اندھیرا ہو گیا۔ ماچس کے سہارے کوئی شمع دان لینے کمرے میں گیا اور پھر دادی ماں کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

''پتہ نہیں شمع دان سے شمع کہاں چلی گئی۔ شام تک تو تھی۔ اب تو دوکانیں بھی بند ہو گئی ہوں گی۔''

وہ چپ چاپ خموشی سے اپنے پلنگ پر لیٹی تیز تیز سانسیں لے رہی تھی اور پورا جسم پسینے سے تر بتر ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔

''کمبخت بجلی کو بھی آج ہی جانا تھا۔''

◀◀ ● ▶▶

E18/ 11J/6D Karamat ki Chauki
Prayag Raj (Allahabad)- 211O16

پردہ سخن کا (شعری مجموعہ)	میری کتابیں اور مبصرین (تعارف)
ڈاکٹر نذیر آزاد	پروفیسر صادق
صفحات: ۱۸۲ قیمت: ۵۰۰/روپے	صفحات: ۱۶۰
رابطہ: نزد مسجد عائشہ، زعفران کالونی، پنٹھا چوک۔ ۱۹۱۱۰۱ سری نگر (جموں کشمیر)	قیمت: ۱۰۰/روپے
7006577610	سنہ اشاعت: ۲۰۲۰ء
	رابطہ: ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس، دہلی

● احمد رشید (علیگ)

سفید لباس، سیاہ راتیں

موت کی کہانی بہت پرانی ہے لیکن ہمیشہ نئی بن کر آتی ہے اور نیا غم لاتی ہے۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھ دیوار سے مار دیئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ گھر میں ایک کہرام سا مچا ہوا تھا۔

’’نہیں......ن......ہی......نہیں......دلہن...... یہ جائز نہیں ہے۔‘‘

’’ہائے...... ہائے......دھپ......دھپ......‘‘ رونے کے ساتھ ساتھ وہ سینہ کوبی کر رہی تھی۔ ’ارے......وہ تو میرے شوہر ہیں۔ میرے شریک حیات ...... ساتھ چھوڑ گئے...... میں تمہارے...... ہاتھ جوڑتی ہوں......آں......آں ہائے......ایں...... مجھے ان کا آخری دیدار کرا دو...... ارے مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو......‘‘

’’میری بچی تمہارے رشتہ صرف زندگی تک تھا، سانسوں کی ڈور توٹتے ہی رشتہ ختم ہو گیا۔‘‘

آئیں......آں......ایں...... ہائے...... ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کی کرچیاں زمین پر بکھر گئی تھیں۔ مگر ان کی نوکیں اس کے جسم میں آج تک چبھ رہی ہیں۔ وہ سوچتی ہے جانے والا چلا گیا لیکن میری راتیں سونی کر گیا اور دن اداس!

چار سال گزرنے کے بعد بھی زندگی کی ہر رات جنگل کی طرح ویران اور سنسان ہو گئی ہے۔ کوئی امنگ ہے نہ کوئی ترنگ سوائے ان آنسوؤں کے جو اس کی آنکھوں سے بہہ کر رات کی خاموشی میں شامل ہو کر اس کی سیاہی کو اور بھی گہرا کر دیتے ہیں۔ چوڑیاں ٹوٹ چکی ہیں...... رشتے بھی ٹوٹ چکے ہیں......لیکن ٹیس، چبھن، کرب اور آنسوؤں سے جیسے رشتہ گہرا ہو گیا ہے...... وہ سوچتی ہے کیا وہ لمحات بھی ٹوٹ گئے جو ہم نے ایک ساتھ گزارے......نہیں نہیں......ان گزرے ہوئے لمحات کی نشانی میرے پاس ہے......نہیں......نہیں یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے......تمہاری محبت کی لذت......وہ خوشبو......وہ پھول جو میرے دامن میں کھل رہا ہے......تمہارا شبّو ......اس کی آنکھیں بھی تمہاری طرح بہت گہری

ہیں......سمندر کی طرح گہری اور پُر سکوت ہیں......اور اس سمندر کی تہہ میں پوشیدہ طوفان کا اظہار تم اکثر اپنے آنسوؤں سے کیا کرتے تھے ’’ناصرہ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں......تمہارے لیے شبّو کے لیے‘‘......لیکن ایسا ہوا نہیں اور ایسا تب ہی ہوتا......اگر میں خدا ہوتی......ن......ہی......نہیں......اگر خدا چاہتا......پھر......نہ شبّو کا باپ مرتا......نہ میرا شریک شب و روز مرتا۔

اس نے قریب سوئے ہوئے شبّو کو باہوں میں بھر لیا......اور اپنی چھاتی سے مسلنا شروع کر دیا......اپنی گرفت کو مضبوط کرتے ہوئے......اس کے چہرے کو جگہ جگہ سے چومتے وقت......’’میرے سلیم......مے......رے......سلیم......میرے......پیارے......‘‘

’’امی......امی......مِ......مِ......!‘‘

نہیں......نہیں......پُچ......پُچ...... میرے بیٹے......میرے پیارے...... میرے دلارے۔‘‘ ہذیانی کیفیت سے نکل کر آہستہ آہستہ تھپکی دی۔

شبّو سو گیا تھا۔ رات کی سیاہی گہری ہو گئی تھی...... رات کی طوالت آنکھوں میں کھٹک رہی تھی...... بستر پر کانٹے اُگ آئے تھے...... وہ بے چین کروٹیں بدل رہی تھی۔ رات نے جب کروٹ لی، دھوپ آنگن سے ہوتی ہوئی کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں...... پپوٹے جل رہے تھے۔ آنکھوں میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں...... جیسے ہی اس نے اپنی بوجھل پلکوں سے سوئیاں نکالنے کی سعی کی......سامنے اس کی ساس جھاڑو دے رہی تھی اور کمرے کی دھوپ دھول میں اٹ رہی تھی۔

’’لایئے امی مجھے جھاڑو......‘‘

’’نہیں......نہیں سوتی رہو......ابھی صبح کہاں ہوئی ہے؟‘‘

’’رات بھر نیند نہیں آئی......‘‘ سوچنے لگی میری زندگی ایسی رات میں ڈوب گئی ہے جس کی کوئی صبح نہ ہو گی۔

’’جب ہی دیر تک سوتی رہیں؟‘‘ ساس نے طنز کیا

اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اس نے ان کو آنچل سے پونچھا۔

’’نہیں......نہیں...... بہو......میری بیٹی...... بوڑھی ہو گئی ہوں نا......سٹھیا گئی ہوں‘‘ اس کو گلے لگا کر خود بھی زار و قطار رونے لگی

’’نہیں......نہیں امی......تمہارے علاوہ میرا کون ہے۔ ڈانٹ ڈپٹ کرنے والا۔‘‘

بڑھیا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی..... اور دونوں ایک دوسرے کو رونے اور بہلانے کی ناکام کوشش کرنے لگیں۔

افق کی سرخی، جب سیاہی میں غرق ہوئی تو رات آہستہ آہستہ کالی ناگن کی طرح اس کے جسم میں رینگنے لگی۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ نیلے رنگ کے تیلولے اس کی نظروں کے سامنے تیرنے لگے۔ صاف وشفاف آسمان کے نیچے چاند کی جانب ہوائی کشتی پر سوار ہلکے پھلکے غبارے کی طرح بے سمت اڑی جا رہی تھی کہ اچانک چپّو آسمانی سمندر میں گر گیا۔ بغل میں سوئے شبو کو بائیں طرف کروٹ سے دودھ پلایا اور اسے تھپکنے لگی۔ آنکھیں کھل گئی تھیں آنکھوں میں نہ نیند تھی، نہ کوئی خواب۔ نگاہیں چھت پر ٹکی ہوئی تھیں۔ انگارے بھرے بستر پر دائیں جانب کروٹ لی۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ پسینہ میں شرابور تھی۔ بستر سے اٹھی کمرے کا دروازہ کھولا۔ ہوا کا ہلکا سا جھونکا اس کے تمتماتے ہوئے چہرے سے ٹکرایا۔ اسے بے نام لذت کا سا احساس ہوا۔ ایک آشنا سی لذت اسے گدگدانے لگی۔ آسمان پر پورا چاند اگ رہا تھا۔ اس میں شاید.....س.....ل.....ی.....م.....سلیم بیٹھا ہوا تھا..... پورے چاند نے سمندر میں طوفان برپا کر دیا تھا۔ اچانک سفید آنچل سر سے کھسک کر اس کے شانے پہ اس طرح جھول گیا جس کا ایک پلو کمر پر تھا اور دوسرا سامنے لٹک رہا تھا..... ہوا کی خنکی اس کے دل کو چھو گئی..... وہ سوچنے لگی کیا چاند کو بھی کسی سے بچھڑنے کا غم ہے؟ جو بیوگی کا لباس پہنے ہے؟ .....نہیں.....نہیں.....میری طرح کوئی بھی بدنصیب نہ ہوگا۔

صبح ہوئی.....سورج کی کرنیں پھیل رہی تھی۔ برتن مانجھنے کے بعد ناشتہ بنانے میں مصروف ہوگئی۔ ظہیر کے کالج جانے کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ جانتی تھی وقت پر ناشتہ نہیں ملا تو طوفان کھڑا ہو جائے گا۔ اس نے سوجی کا حلوہ پلیٹ میں رکھا اور چائے ظہیر کے سامنے رکھی۔

''بھابی، کیا چائے میں چینی نہیں ڈالی؟''

''حلوے کے اوپر چائے پھیکی لگ رہی ہوگی۔''

''اس کا مطلب ہے، میں جھوٹ بول رہا ہوں''؟ ظہیر کا لہجہ تُرش تھا۔

وہ سوچنے لگی اب کیا جواب دے؟ مزید دلیل دی تو یقیناً حلوہ کی پلیٹ زمین پر ہوگی اور اس کا دماغ عرش معلیٰ پر۔ اس نے عافیت اسی میں جانی کہ خاموش ہو جائے اور روٹی پکانے میں مصروف ہوگئی۔ آنگن میں چارپائی پر پڑوس کی دو بوڑھی عورتیں بیٹھی تھیں۔

''بہن تمہاری بہو کے پاؤں اچھے نہیں ہیں.....'' ایک بوڑھی عورت نے کہا۔

''ہاں..... بیٹے کو کھا گئی.....'' دوسرے بوڑھی عورت نے قطع کلامی کی۔

اس کے ذہن میں آگ سی بھر گئی۔ سوچنے لگی میرے پاؤں کا سلیم کی موت سے کیا تعلق؟ اس نے جلدی جلدی بھٹ..... بھٹ روٹی پکانا شروع کر دیا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے.....مگر ایسا ممکن کہاں؟.....کیا دنیا گونگی ہو جائے گی؟..... یا خود بہری!..... وہ سوچتی ہے امی کا صرف بیٹا مرا ہے..... میری.....م.....ے.....ری.....تو دنیا ہی لٹ گئی..... میرا شوہر مر گیا.....میرے شبو کا باپ مر گیا..... یہ بات، میں دنیا کو کیسے سمجھاؤں.....؟ سوائے اس کے کہ بس رو سکتی ہوں..... اور آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے.....اس کے رخساروں سے ڈھلکتے ہوئے گردن کے پسینہ میں شامل ہو گئے۔

رفتہ رفتہ خوں آلود آنسو دور مغرب میں پھیل گئے۔ اور وہ سرخی، سیاہ مائل ہوگئی۔ وہ سیاہی دھیرے دھیرے اس کے جسم میں داخل ہوگئی۔ چند لمحہ چوڑیوں کی کرچیاں جسم کی رگوں میں رقص کرنے لگیں ان کی میٹھی میٹھی چبھن ایسی محسوس ہو رہی تھی جیسے پیروں کے تلوؤں پر چیونٹیاں رینگ رہی ہوں۔ اس نے سرہانے سے تکیہ نکال کر اپنی بغل میں دبا لیا اچانک تکیہ کے جیسے مضبوط بازو نکل آئے.....اور وہ اس کی باہوں میں سمٹ گئی اسے گلے سے لگ کر سختی سے دبوچ لیا۔ اچانک وہی چیونٹیاں رینگتے رینگتے اس کو کاٹنے لگیں۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ سبک سبک رونے لگی۔ اس کے آنسو رات کی سیاہی کو پھیکا کرنے لگے اور سیاہی اتر گئی۔ سورج طلوع ہو رہا تھا اس کی مہندی لگی داڑھی زمین کو چھو رہی تھی جب اس نے اس کی پیشانی کو چھوا تو اس کی آنکھیں بے خواب ہوگئیں۔ صبح کی مشغولیات سے فرصت پا کر اس نے غسل کیا..... بالوں کو تولیہ سے پھٹکارا۔ پانی کی بوندیں ادھر ادھر بکھرنے لگیں۔

''نہ جھٹکو زلف سے پانی یہ موتی ٹوٹ جائیں گے۔'' ظہیر گنگنایا۔

''اب تو سب کچھ ٹوٹ گیا۔'' یہ کہہ کر وہ بھی جبراً مسکرا گئی۔

سلیم کی موت کے بعد وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ یہ کیسی مسکراہٹ ہے۔ گھر میں چہ میگوئیوں کی بھنک اس کے کانوں کو بھی مل گئی تھی..... گذشتہ کچھ دنوں سے ظہیر کے روّیہ میں بھی بدلاؤ آیا تھا..... وہ اپنے کمرے میں تنہا تھی.....ٹیبل پر فوٹو فریم رکھا تھا.....'' دیکھ رہے ہو شبو کے ابو..... یہ لوگ تمہاری ناصرہ.....تم سے چھین لینا چاہتے ہیں..... یہ بھی خدا ہو گئے، جس کو جب چاہا چھین لیا..... ہاں یہ تو اسی کا حق ہے کہ جو دیتا ہے وہی واپس لیتا ہے۔'' وہ سوچ رہی تھی'' کیا عورت لولی پوپ ہے؟'' نہیں .....نہیں سلیم میں تمہاری ہوں..... میں تمہاری ہوں اور ہمیشہ تمہاری رہنا چاہتی ہوں۔''

پورا دن اسی طرح گزر گیا۔ کب رات ہوئی اسے پتہ ہی نہ چلا۔ سردی شباب پر تھی.....

سرہانے رکھے تکیہ کو اپنے سینہ سے دبا لیا اور سسک سسک کر رونے لگی..... تکیہ کا ایک سرا گیلا ہو گیا۔ رات کے نہ جانے کون سے حصہ میں سلیم فریم سے نکلا اور پالتی مار کر اس کے سر کو اپنے زانو پر رکھے آہستہ آہستہ بال کریدنے لگا۔ آنکھیں بند تھیں، گرم گرم دبیز رخساروں کو اپنی ہتھیلیوں میں بھر کر اس کے ہونٹوں کا بوسہ لیا۔ اس نے کروٹ لی اور اس کے سینہ سے لپٹ کر اس میں سمٹ گئی دائیں ہاتھ کی انگلیاں اس کے گداز جسم پر رقص کرنے لگیں۔ بے خودی کے عالم میں وہ اسے چومنے لگی۔ دانت تکیہ پر گاڑ دیئے اور نوچ نوچ کر اس کی روئی تتر بتر کر دی۔ جب ہیجانی سی کیفیت دور ہوئی..... اس کی سانس پھول رہی تھیں..... وہ پسینہ میں شرابور تھی۔ تکیہ تر بتر تھا۔ گیلے پن کے احساس سے اسے گج گجی آنے لگی۔ اس نے تکیہ زمین پر اچھال دیا اور سہمی سہمی نگاہوں سے ایسے دیکھنے لگی جیسے زہریلا ناگ ہو.....

وہ رات بھی سہمے سہمے انداز میں آگے کھسک رہی تھی۔ رات اتر چکی تھی مگر اس کا خوف بدستور تھا۔ اس نے غسلِ طہارت کیا۔ فجر کی نماز ادا کی۔ اللہ سے توبہ کی جیسے کوئی گناہ کبیرہ سرزد ہو گیا ہو۔ سورج خون میں نہایا ہوا آسمان کے سمندر سے نکل رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی خون کے سمندر سے آج اسے بھی گزرنا ہے۔ نکاح کے بعد اسے دلہن کے سرخ جوڑے میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں بیٹھا دیا گیا۔ عورتیں اپنے اپنے گھر جا چکی ہیں۔ گھر کی چہل پہل ختم ہو گئی ہے۔ رات کی سیاہی پر چاندی کی پرت چڑھ گئی تھی۔ اس نے کمرے کی لائٹ کو بجھا دیا..... چاندنی کی چند قاشیں کمرے میں داخل ہو رہی تھیں اور وہ بستر پر لیٹ گئی۔ سوچنے لگی چاہے زندگی کے راستے بدل جائیں لیکن انسان اپنے ماضی سے رشتہ نہیں توڑ پاتا۔ لیکن اب اگر میں سلیم کے بارے میں سوچوں بھی تو یہ پاپ ہے۔ کیونکہ وہ غیر مرد ہو گیا..... لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے.....؟ ایجاب وقبول کے چند کلمات کی بنیاد پر ایک غیر مرد ''اپنا مرد'' ہو گیا..... اور اپنا مرد نامحرم..... کیا صرف بولوں کی بولی پر رشتہ بدل جاتے ہیں؟ بچوں کے باپ بدل جاتے ہیں..... مائیں بدل جاتی ہیں۔ عورتوں کے مرد بدل جاتے ہیں.....'' کمرے میں آہٹ ہوئی وہ چونک گئی۔ گھبراہٹ اور حیا کے ملے جلے احساس کے ساتھ چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

ظہیر اس کے قریب بیٹھ گیا، کمرے میں کوئی دوسرا پلنگ تھا بھی نہیں..... وہ سمٹ کر پیچھے کھسک گئی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو..... تھوڑی دیر تک کمرے میں خاموشی رہی

''دیکھو بھابی..... میں سوچ نہیں پا رہا کہ کیا اچھا ہے؟ اور کیا برا ہے؟..... بس اتنا جانتا ہوں..... ن..... ا..... ص..... رہ..... ناصرہ اچھا وہ بھی نہ تھا..... چونکہ عورت کی تکمیل مرد کے بغیر نامکمل ہے۔'' ظہیر نے گفتگو کا سلسلہ پکڑا۔

وہ خاموش بیٹھی ہوئی تھی..... اس کی ہر بات کا جواب صرف آنسوؤں سے دے رہی تھی۔

''میں یہ بھی نہیں جانتا ن..... ا..... صرہ..... یہ سب..... یہ سب کچھ تمہاری مرضی..... یا کچھ میری مرضی سے ہوا ہے..... اچھا ہوا ہے کہ برا ہوا ہے..... میں نے..... اور..... تم نے سب کچھ قبول کیا ہے..... زندگی آدمی اپنی مرضی سے گزارے یا دوسروں کی مرضی سے، اپنے لیے گزارے یا دوسروں کے لیے۔ بہر حال گزارنی ہوتی ہے۔''

''ہاں.....'' وہ سسکیوں سے رونے لگی۔

''روؤ نہیں..... بھابی..... دیکھو ناصرہ..... ذرا شبو کا خیال کرو..... روؤ نہیں.....'' ظہیر نے اس کی کمر پر ہاتھ رکھا اور آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

باہر ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی..... اترتی سردی تھی..... منظر پر دھندلا پن چھایا ہوا تھا..... اِکّا دکّا ستارے جھلملانے کے لئے بے چین تھے..... ان کے درمیان خاموشی کے ساتھ ساتھ فاصلہ بھی قائم تھا۔ اچانک آسمان پر بجلی سی کوند گئی..... دو بادلوں کے ٹکڑے جو ایک دوسرے میں داخل ہو رہے تھے برقی لپیٹ میں آ گئے..... اور کمرے کے باہر بوندا باندی شروع ہو گئی۔

◀◀ ● ▶▶

Gali Rahat Wala Kuan
Sarai Rehman
Aligarh-202001
Mob: 09897411153.

احسن امام احسن کی تصانیف

مہاراشٹر کے قلم کار (تحقیق)	جھاڑکھنڈ کے قلم کار (تاثراتی مضامین)
صفحات: ۱۲۰	صفحات: ۱۴۴ قیمت: ۱۰۰/روپے
قیمت: ۱۰۰/روپے	رابطہ: بی۔بی۔ا۔سی، ایم، پی، ڈی، آئی، نزد ٹی
سنہ اشاعت: ۲۰۱۷	وی سنٹر، پوسٹ: سینک
خواب کا سمندر (شاعری)	اسکول، بھونیشور۔۷۵۱۰۰۵
قیمت: ۱۰۰/روپے	9438716033

● تنویر احمد تمّاپوری

وائرس

سمارٹ فون پہلے ضرورت تھا۔ اب عادت بن چکا ہے۔ جب تک اس کا وجود نہیں تھا انسان کا حافظہ بہت مضبوط ہوا کرتا تھا۔ پچاس پچاس نمبر ازبر ہوا کرتے تھے۔ اب تو بیوی کا نمبر بھی سیری سے پوچھنا پڑتا ہے۔ ماضی میں عاشق کے دماغ معشوق کی گلیوں کا گوگل ہوا کرتے تھے۔ حال کا یہ حال ہے کے خود اپنے گھر کا راستہ بھی جی پی ایس سے ہوکر گزرتا ہے۔ آج صبح میری آنکھ ایک بری خبر کے ساتھ کھلی۔ میرا فون ہینگ ہو چکا تھا۔ شاید نیچے گر کر یا پھر کسی وائرس کا شکار ہوکر۔ نہ ماننے کی ضد پکڑ چکا تھا۔ کافی ٹھونک بجا کر دیکھا۔ بیٹری کی چھان پٹک کر لی۔ متعدد بار ری اسٹارٹ بھی کر لیا۔ مگر افاقہ نہ ہوا۔

اتوار کے دن دوپہر سے پہلے بستر چھوڑنے کا مطلب عموماً کوئی ناگہانی افتاد ہوتی ہے۔ فون کا خراب ہونا بھی ایک آفت ہی تھی۔ اور پورے گھر کے لیے تھی۔ بیگم کا موڈ خراب تھا۔ بچے الگ بسورر ہے تھے۔ بہت دنوں بعد یہ پہلا اتوار تھا جس دن مجھے ناشتہ نہیں ملا۔ ماتم نے گھر کا راستہ ڈھونڈ لیا۔ یہ فون میری فیملی کے لئے جینے کا اساس تھا۔ لائف اسٹائل کا پورا پیٹرن۔ بیوی کا نیٹ فلکس، بیٹی کے لیے فلٹر کیمرہ اور بیٹے کے لئے آئی پی ایل اسٹیڈیم۔ سب کچھ اسی سے منسلک تھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کے یہ گھر کا اکلوتا فون ہو مگر چونکہ آئی فون تھا۔ اس لیے اپنی گوناگوں خصوصیت کے دم پر گھر کی ساری ایلیکٹرانک ذمہ داریاں پینسٹھ ہزار کے اپنے بیش قیمت کندھوں پر اٹھائے رکھا تھا۔ یہ دراصل فون کی شکل میں علاء الدین کا چراغ تھا۔ گھر کی ساری خوشیاں اس کی گھسائی میں مضمر تھیں۔ ظاہر ہے اداسی کو پورے گھر پر ایک آسیب کی طرح پسرنے سے کون روک سکتا تھا۔

باہر سڑکیں اتوار ہونے کے سبب ویران تھیں۔ یا پھر میرے گھر کے اندر کا سناٹا باہر نکل آیا تھا۔ اتوار کی صبح رہائشی علاقے ویسے ہی طوفان سے پہلے والی خاموشی کی زد میں ہوتے ہیں۔ چہ جائیکہ میرا علاقہ تو مضافات میں شامل تھا۔ کرونا کرفیو جیسا ماحول یہاں کا حق تھا۔ موسم آج گرم بھی زیادہ تھا۔ حبس زدہ ماحول میں لوگ باہر نکلنے سے ویسے ہی کتراتے ہیں۔ میں نے علاقے کی ایک بڑی موبائل شاپ میں اپنا مقدمہ پیش کیا۔ پیشی کے لئے اگلی تاریخ کے بجائے اگلی دکان ملی۔ جس کے لئے مجھے شہر کے ایک تجارتی مرکز کی

طرف کوچ کرنا پڑا۔ تعطیل کی صبح بڑی کسلمند اور بھاری ہوتی ہے۔ ممبئی شہر کی بھاگتی دوڑتی زندگی بھی اس سے مبرا نہیں تھی۔ نقل وحمل کے ذرائع بھی معمول سے ہٹ کر یہاں سست ہو جاتے ہیں۔ عام طور پر صبح کے اوقات میں تین منٹ کے دورانئے سے چلنے والی لوکل بھی اتوار کے دن بیس، پچیس منٹ کا وقفہ لیتی ہے پہلے رکشہ پھر ٹرین، ڈیڑھ گھنٹے بعد میں کرلا میں تھا۔

یہ علاقہ شہر کے ان حصوں میں سے ایک ہے جہاں دن اور رات کے بیچ کا فرق نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ آٹھوں پہر اور ساتوں دن یہاں ایک میلا سا لگا رہتا ہے۔ جم غفیر معمول کے مطابق بھاگتا رہتا ہے۔ کرلا ویسٹ میں پولیس چوکی کی عقبی گلی، علاقے کا ایک مشہور بازار تھا۔ یہاں بہت ساری موبائل کی دکانیں بھی تھیں۔ ایک کو میں نے چن لیا۔ میرا چونکہ آئی فون تھا اس لیے اس کی مرمت زرا مشکل امر تھی۔ پہلی دکان میں منشا پوری تو نہیں ہوئی تاہم ایک دوسری جگہ کا پتا ضرور ملا۔

اگلی گلی میں موجود وہ دکان خلاف معمول خالی تھی۔ مجھے لگا دکان کا مالک میرا ہی منتظر تھا۔ مدعا سننے کے بعد اس شاطر شکل شخص نے اثباتی ہنکارہ بھرا۔ اس کی بڑی بڑی مٹیالی آنکھوں میں تجربے کا کائیاں طوطی بول رہا تھا۔ چہرے کے کرخت پیٹرن باطن کے سارے بہی کھاتوں کا اظہاریہ تھے۔ رنگ پکا تھا۔ کھوپڑی کا آدھا حصہ صاف تھا۔ پچھلے حصے سے چپکے ہوئے بال ایک جھالر کی شکل میں لٹک رہے تھے۔ اس نے ایک آنکھ پر گھڑی ساز کا عدسہ لگایا اور میرے فون پر پل پڑا۔ کچھ منٹ میرے لیے کافی صبر آزما رہے۔ پندرہ منٹ اور دو ہزار روپیوں کی قربانی، ایپل کے ایک سو اٹھائیس گیگا اونٹوں پر لدا میرا گمشدہ خزانہ مجھے واپس دے گئی۔ یا کم سے کم مجھے ایسا لگا جو بعد میں خیال خام ثابت ہوا۔ کیونکہ اگلے لمحے اسپیکر کے خراب ہونے کا عقدہ میرا منتظر تھا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ میں ابھی تک وہیں تھا۔ نہیں تو پھر نئے سرے سے دھکے کھانے کا سلسلہ الگ شروع ہو جاتا۔ میری جیب پر اس شاطر انسان کا اگلا سرجیکل اسٹرائیک اسپیکر کی بحالی کے لیے تھا۔ جس کا کولاٹرل نقصان مزید تین ہزار روپئے کی شکل میں جھیلنا پڑا۔ اس بار فون کے گونگے پن کا علاج ایک نئی بیماری کو راہ دے گیا۔ نیا وقوع پذیر مسئلہ بڑا عجیب تھا۔ نمبر چاہے جو بھی ڈائل کیا جائے۔ کنکشن صرف آخری ڈائل شدہ نمبر سے ہو پا رہا تھا۔

جب کرلا کی ساری دکانیں اس نئی ''گوگلی'' کے سامنے چیں بول گئیں تب مجھے میرے دوست مکند کی یاد آئی۔ اس طرح کے عجیب وغریب مسائل سے چھٹکارے کا چورن اسی کے پاس ملتا تھا۔ اور خوش قسمتی یہ بھی تھی کہ میرا فون اس وقت صرف اسی سے رابطے میں تھا۔ کیونکہ آخری ڈائل شدہ نمبر کی شرفیت اسی کے کھاتے میں تھی۔ مکند مہتا ایک کامیاب بینکر اور ہوشیار تاجر تھا۔ مالیات میں مہارت گجراتیوں کا

اختصاص ہوتی ہے۔لہذ''منی میٹرز''اس کے بھی تگڑے تھے۔روکڑے'' سے جڑے تمام راز و نیاز کو سمجھنے اور سمجھانے میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ خاص کر ایلیکٹر انک گھپلے کی پہچان اور تدارک اس کا میدان تھے۔میں نے اپنا معاملہ بھی اس کے سامنے رکھ دیا۔وہ کافی دیر تک ہنستا رہا۔آئی فون دس کا خوب مذاق اڑاتا رہا۔ اسے ایک معمولی''چونے کی ڈبی'' سے تشبیہ دی۔ بہت ساری ٹانگ کھنچائی کے بعد ایک نئی لوکیشن اور ڈھیر سارے مشوروں پر میرا معاملہ نپٹایا۔ یہ تو اچھا تھا کہ میرے فون کا واٹس اپ اور نیویگیشن اب بھی موثر تھے۔میں نے اگلے مطلوبہ پتے تک پہنچنے کے لے جی پی ایس پر اپنی سیٹ بیلٹ باندھ لی۔اور سنٹرل ریلوے کی ٹکٹ کھڑکی کی طرف چل دیا۔

سورج سوا نیزے سے آگے نکل چکا تھا۔دوپہر گذرے دیر ہو چکی تھی۔سڑکوں پر بھیڑ بڑھ رہی تھی۔طمازت گھٹ رہی تھی۔تاہم پسینے کی بوندیں اب بھی ناگواری کے زون میں ہی تھے۔کبوتر خانہ ممبئی کا اکلوتا ایسا علاقہ تھا جو اسم با مسمیٰ تھا۔ورنہ اس شہر میں گھاٹ کے بغیر ایک گھاٹ کوپر بھی ہے۔چکا چوند روشنی اور فلمی ستاروں کی کہکشاں ہونے کے باوجود ایک علاقہ یہاں اندھیری بھی کہلاتا ہے۔مگر کبوتر خانے میں کبوتر بھی تھے اور ان کا خانہ بھی۔اس وقت میں لوکل اسٹیشن سے باہر نکل کر اسی کی طرف جا رہا تھا۔چاروں طرف انسانوں کا سیلاب تھا۔سب کے سب یہاں اپنی کھال میں مست اور مشغول تھے۔شہر کے اس حصے میں اتوار کو تہوار کی طرح منایا جاتا ہے۔ پاس پڑوس کے سارے مکین خریداری کے لیے یہاں اسی دن کا انتخاب کرتے ہیں۔کیونکہ کبوتر خانے میں سوموار کے دن تعطیل ہوتی ہے۔لوگوں کے اس جنگل سے بچ بچا کر نکلنا اور اپنے مطلوبہ مقام تک پہنچنا دراصل ایک بڑا چیلنج ہی ہوتا ہے۔اس کے بعد بھی مطلوبہ چیز نہ ملے تو کوفت بنتی تھی۔مہاویر ٹریڈرس میں شاید کسی عزیز کی موت ہوگئی تھی۔اس لئے دکان بند ملی۔

میرے پاس اگلی لوکیشن محمد علی روڈ کی تھی۔وہاں تک پہنچتے پہنچتے جیب کی ساری نقدی اور شہر میں موجود نقل وحمل کے تمام ذرائع میرے استعمال میں آ چکے تھے۔سنٹرل اور ہاربر ریلوے پہلے ہی جھیلی جا چکی تھی۔اب ویسٹرن کی باری تھی۔گرانٹ روڈ پر اترا اور آگے کے لیے ٹیکسی کر لی۔محمد علی روڈ کافی گہما گہمی والا علاقہ تھا۔مکند کی بتائی ہوئی جگہ تک پہنچتے پہنچتے شام کے سائے بھی لمبے ہونے لگے تھے۔ٹیکسی چھوڑ کر کچھ دور پیدل بھی چلنا پڑا۔وہ ایک نہایت پتلی سی گلی تھی۔جس کے مدخل پر ایک بہت بڑی اور علاقے کی مشہور ہوٹل تھا۔ہمہ اقسام کے ذائقے میں لپٹی ہوئی بواس حبس بھرے ماحول کو قدرے ناگوار بنا رہی تھی۔تاہم یہ بھی حقیقت ہے کے گوہر مقصود ہمیشہ اسی طرح کے پر پیچ راستوں اور سنکری گلیوں میں ملتا ہے۔آخر کار وہ بوسیدہ عمارت مل ہی گئی، جو میری ممکنہ منزل تھی۔تین سیڑھیاں چڑھ کر میں دو بائی آٹھ

کے ایک مسطح چبوترے پر پہنچ گیا۔سامنے المونیم کی فریم میں کانچ کا ایک نیا اور خوبصورت دروازہ نسب تھا۔میں اندر داخل ہوا۔بائیں طرف ایک کاونٹر تھا۔عمارت باہر سے جتنی بوسیدہ تھی اندر سے اتنی ہی پر کشش اور نئی نویلی نکلی۔میرے دماغ میں کسی دکان یا ورکشاپ کا تصور تھا۔مگر وہ تو ایک آفس جیسی کوئی جگہ تھی۔سامنے ایک دیودار سے بنی کنگ سائز میز لگی ہوئی تھی۔جس پر ایک کمپیوٹر اور کچھ فائل رکھے ہوئے تھے۔اس کے دائیں بائیں دو چرمی کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔چہار جانب کی چمک دمک، روشنیاں، دیوار پر لگی پینٹنگز اور دیودار کا فرنیچر اس کمپنی کے بیلنس شیٹ کی قصیدہ خوانی کر رہے تھے۔

چاند کو لوگوں نے اکثر پہاڑوں یا بادلوں کے اوٹ سے نکلتے دیکھا ہوگا۔لیکن میں نے اسے میز کے عقب سے نکلتے دیکھا تھا۔شاید وہ اب تک میز کے نیچے ایلکٹر ک کے کسی پلگ سے نبرد آزما تھی۔ طرح دار سراپا، گول مٹول چہرہ، غزالی آنکھیں، گلابی ہونٹ اور اس پر کالا تل۔سب کچھ منفرد تھا۔شاید وہ نئی بھرتی تھی۔جاب کے لیے بھی اور ممبئی کے لیے بھی۔اس کے سراپے اور زبان میں کوئی یارہ نہ تھا۔اس کے الفاظ پر ملیالی مانجھا چڑھا ہوا تھا۔پھر بھی بھلے لگ رہے تھے۔کیونکہ ان میں شہد کی مقدار معمول سے زیادہ تھی۔زبان آئے، نہ آئے خوبصورت چہروں کو اپنی بات سمجھانے اور منانے میں زیادہ دقت نہیں ہوتی۔روم نمبر تیرہ کے دروازے تک میں بھی گلابی ہونٹ اور اس کے کالے تل کے زیر سایہ ہی پہنچا۔

فرنیچر، پینٹ، چھت پر لگا جھومر اور سامنے بیٹھا سولنکی، کمرہ نمبر تیرہ کی ہر چیز سے امارت ایسے جھلک رہی تھی، جیسے سب کچھ نوٹ چھاپنے کی مشین سے برآمد ہوئے ہیں۔بے داغ ارمانی سوٹ، مکھن جیسا تمتماتا چہرہ، سنہری کمانی کی عینک۔چھوٹی چھوٹی ترشی ہوئی ہر شد مہتا چھاپ مونچھیں۔سولنکی نے روایتی تاجرانہ مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا۔اس سے پہلے کے میں اپنا تعارف کرواتا اس نے پرتپاک انداز میں سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، اور کہا۔

''معلوم ہے معلوم ہے.....بیٹھو، آپ کو مکند بھائی نے بھیجا ہے، بروبرناں.....لاو اپنا فون دو۔''

وہ ایک کاروباری آدمی تھا۔کاروباری آدمی زیادہ بولنا اور سننا گھاٹے کا سودا سمجھتے ہیں۔

میرا فون لے کر اس نے چیک کیا۔اپنا نمبر ڈائل کیا۔اپنی سیکریٹری کا نمبر ڈائل کیا۔ہر بار گھنٹی مکند کے یہاں بجی۔دس منٹ انتظار کا کہہ کر وہ اندرونی حصے میں کہیں غائب ہوگیا۔جاتے جاتے چائے بھیجنا نہیں بھولا تھا۔چائے کے ساتھ ریسپشن والی لڑکی بھی آ گئی۔کچھ کاغذات سولنکی کی میز پر رکھ کر واپس جانے لگی۔جاتے جاتے خوبصورت اور پیشہ ور مسکراہٹ میری چائے میں ملا گئی۔چائے نے دماغ کو تر و تازہ کر دیا۔جب تک چائے ختم ہوتی سولنکی بھی واپس آ گیا۔میرا فون بن چکا تھا۔آج علاؤالدین کے چراغ کو

اس کا اپنا جن مل گیا تھا۔فون بھی مل گیا اور مختتانہ بھی بچ گیا۔واہ بھائی مکند تیرے تو جلوے ہیں ہر طرف۔

میرے پاس بہت سے سوال تھے۔ بہت سی فکریں تھیں۔ بے تحاشہ حیرت بھی تھی۔ باہر نکلتے ہی مکند کو فون کرنا بنتا تھا۔

''ہاہا۔کچھ نہیں تمھارے فون پر ایک ضدی وائرس کا حملہ ہوا تھا۔مبارک ہو۔سولنکی نے اسے نکال دیا ہے۔اور پانچ سال کے لیے اینٹی وائرس ڈال بھی دیا ہے۔ٹینشن نئیں لینے کا؟ میں ہوں ناں۔''

دوسری طرف خالص بمبیا اسٹائل میں مکند کے قہقہے تھے۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔مگر وہاں موبائل کی دکان یا ورکشاپ نہیں تھی۔'' مجھے بہت حیرت تھی۔

''بروبر ہے۔وہ موبائل کی دکان نہیں تھی.....مگر وائرس کا کارخانہ تو تھا۔''

''میں سمجھا نہیں۔''میری حیرت مزید بڑھ گئی۔

''فکر نا کرو موٹا بھائی.....تم آم کھاؤ، پیڑ بہت گنتے ہو۔''اس نے پھر قہقہہ لگایا۔

''مطلب.....؟''

''وہ ایک سافٹ ویر کمپنی اور ورکشاپ کے سلسلے کا کنٹری ہیڈ آفس ہے۔وہاں ایلکٹرانک ووٹنگ مشینوں کی 'مرمت' ہوتی ہے۔اس کا سافٹ ویر بنتا ہے۔''

◀◀ ● ▶▶

Reyaz(Saudi Arabia)
Post box no 4398
+966501724826

سہ ماہی ''اردو''	عالمی زبان
مدیر: وسیم فرحت (علیگ)	سرپرست: وکیل نجیب
صفحات: ۱۱۲	مدیران: ڈاکٹر سیفی سرونجی، آفاق سیفی، استوتی اگروال
قیمت: ۱۰۰/روپے	صفحات: ۳۲
رابطہ: ادبستان، نزد وحید خاں اردو بی ایڈ کالج، وال گاؤں روڈ، امراوتی۔۴۴۴۶۰۱	قیمت: ۲۰/روپے
9370222321	رابطہ: سیفی لائبریری، سرونج۔۴۶۴۲۲۸
	9977955000

● زویا حسن

کھڑکی میں اُگا وجود

کھڑکی کے اندر اور باہر کی زندگی میں طلائی پل سا بن گیا تھا۔وہ دنیا جو باہر کی فضا میں رواں دواں ہے اور کئی قدم اور کئی چہرے اس کے نقوش کو معنی دیتے ہیں کھڑکی کے اس پار ایک وجود میں وہ سب کے سب اپنی لہریں چھوڑ جاتے ہیں۔اس وجود نے جس کی آنکھوں نے آگہی کے بارہ سال اس کھڑکی میں بیٹھ کر طے کیے ہیں، وہ وجود جو صبح مسا میں پہاڑی چشمے سا ابلتا ہے اور پھر کھڑکی سے باہر کی بپھرتی لہروں میں ضم ہو جاتا ہے کچھ چلتر عورتوں کی زبان کی تولد لپیٹتے اکثر سائے لمبے ہوتے ہوتے اپنے مرکز پہ سمٹ جاتے ہیں کبھی عمر رفتہ کو اپنے جھکے کاندھوں پہ لادے کوئی سایہ جو اپنے عہد سے نا جانے کس پہر بچھڑ گیا تھا اس کی دہلیز پہ سوئی سیڑھیوں پہ آ بیٹھتا تو اس کی سانسوں کے نوحے اس کا سکون چھین لیتے۔مرکز سے بچھڑے سایوں کے بھی الگ ہی عذاب ہوتے ہیں البتہ حالات حاضرہ پہ تبصرے وجود میں کچھ خاص وبال نہ لا پاتے شاید اس لیے بھی کہ حال جینے کے لیے ماضی مارنا پڑتا ہے سو وہ مار نہ سکی بارہ سال کے ماضی میں اتنا کچھ تو تھا کہ کٹا نا جا سکے۔۔شوہر کی بے اعتنائیاں، نظر اندازی کے دکھ، چپ کی کوکھ میں رقصاں درد کے سات سر، شوخی سے چھنکتی چوڑیوں میں سرائیت ہوتے آگہی کے پر آشوب نغمے، کچھ بکھرا کاجل اور الجھتی زلفیں پاؤں میں رقصاں گیتوں میں پڑتی جمود کی بیڑیاں اور بدن میں جمتا جوانی کا ڈھیتا بھوبل.....

مگر کھڑکی کے اس پار سے ایک ٹھنڈے ہوا کا جھونکا بھی تو آتا تھا جس کے انتظار میں وہ دن سے رات کرتی تھی کھڑکی کے اس پار ایک خوبصورت باغ تھا جس میں کالونی کے بچے، بوڑھے، عورتیں اور مرد حضرات ہر وقت چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں آتے جاتے تھے باغ اور فضیلت کے گھر کے درمیان ایک پختہ سڑک تھی اور باغ کی سرحد کے گرد درخت اس سڑک کو ٹھنڈا رکھتے تھے انہیں میں سے ایک درخت کے سائے تلے وہ روز صبح صادق ہی آ بیٹھتا تھا ٹانگوں پہ معذوری کے قفل تھے مگر زبان ہر چوکھٹ کھٹکھٹاتی تھی۔نا جانے پہلے وہ کہاں تھا کن پانیوں میں سرگرداں تھا پھر اچانک ایک دن وہ وہاں بیٹھنے لگا تھا۔۔کالج یونیورسٹی جاتے لڑکوں کو دن چڑھتے آتے جاتے دیکھنا ان دونوں کا محبوب مشغلہ تھا تو قیرا گر کبھی گھر ہوتا تو اس کے اٹھنے سے

پہلے سارے گھر کی جھاڑ پونچھ کر ناشتہ بنا وہ کھڑکی میں آ بیٹھتی اور وہ اسے وہیں آنکھوں میں شوخی اور ہلکی ہلکی کمینگی لیے ملتا وہ ہر اس بانک ہلکی بھیکتی مسوں والے لڑکے کو روک اس سے محلے کی دلاریوں کے قصے سنتا جو وہاں سے گزرتا تھا۔ شہروز صاحب کی لڑکی پہ جوانی ٹوٹ کر برسی تھی کہ جب وہ چلتی تھی تو زمین کے توازن میں بگاڑ پیدا ہوتا تھا راوف صاحب کی دلاری کی آنکھوں میں بے شرمی کی شرارتیں اٹھکیلیاں بھرتی تھیں تو مولوی جمیل کی دوشیزاوں کے سروقد اور خمدار بدنوں سے اٹھتے شرارے کس کس بانکے کو رات بھر مخمور رکھتے تھے سب پہ تبادلہ خیال کرتے جب وہ بے حال ہوتا ہنستا تھا تو فضیلت کے زہن میں غصے اور نفرت کے سانپ پھن اٹھائے کھڑے ہو جاتے اور وہ ان سانپوں سے کئی بار اس کے مکروہ چہرے پہ ڈستی اور کبھی کبھار جب اس کے ہاتھ بھی کسی لڑکی کا نمبر لگ جاتا تو وہ گھنٹوں فون کان سے لگائے من چاہی دنیا میں راحتیں ڈھونڈنے نکل جاتا۔ تب فضیلت ادھر ادھر کا جائزہ لیتی اندر کے جہنم میں باہر کا جہنم بھرتی رہتی ہاں تب اس کیلیے وہ جہنم ہی تو تھا۔ مگر پھر ذرا دھوپ ڈھلے ریٹائرڈ اور بے کار بوڑھے اپنے پوتے پوتیوں کو اٹھائے گلی میں نکلتے تو وہ ان کو بھی روک ان کے من چاہے ٹاپکس مذہب، سیاست اور ادب سب پہ سیر حاصل بحث کرتا تو فضیلت کا سارا غصہ پیار میں بدل جاتا بوڑھے داد دیتے مسکراتے گھر کی طرف مسرور سے لوٹتے۔ کیسا علم دوست تھا وہ اور بوڑھوں کی وقت گزاری بھی خوب ہوتی تھی۔

توقیر سے پسند کی شادی کے بعد وہ اس کی زندگی میں سے کب نکل گئی اسے معلوم نہ تھا بس وہ فضیلت پہ شک کرتا تھا اور اس کے گھر والوں نے فضیلت کو قبول ہی نہ کیا تھا تو توقیر نے اسے ایک کرائے کے مکان میں ٹھہرا رکھا تھا۔ مگر فضیلت کو سختی سے کہیں آنے جانے سے روک دیا تھا۔ شروع شروع میں فضیلت اگر کبھی کسی ہمسائی کیا صرار پہ مارکیٹ تک ہو آتی تو اس بات پہ خوب جھگڑے ہوتے۔ فضیلت کا چھت پہ جانا بھی توقیر کو نا پسند تھا۔ پہلے پہل وہ لڑنے جھگڑنے کے بعد فضیلت کو یوں منا لیتا کہ اسے اپنے ساتھ کہیں گھمانے پھرانے لے جاتا مگر وہاں جا کر بھی الگ مسلے شروع ہو جاتے کسی کے فضیلت کی طرف دیکھ لینے پہ یا پاس سے گزر جانے پہ ہی توقیر ہتھے سے اکھڑ جاتا اور بات مار دھاڑ تک پہنچ جاتی۔ گھر آ کر فضیلت کی بھی کلاس ہوتی کہ وہ ہی منہ بنائے بیٹھی تھی تو توقیر کو اسے لے کے جانا پڑا۔ اور پھر اس دن جب وہ توقیر کی غیر موجودگی میں بیرونی دروازے پہ دستک پہ ہمسائی کے خاوند سے بریانی وصول رہی تھی تو توقیر آ گیا تھا۔ توقیر نے فضیلت کو مار مار کر ادھموا کر دیا تھا اور آئندہ اس کے گھر سے باہر ایک قدم بھی رکھنے پہ پابندی لگا دی تھی۔ زندگی سے محبت لفظ کے تمام معنی روپوش ہو گئے۔ توقیر شروع سے ہی رات کو دیر سے آتا تھا اب تو رات رات گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ وہ ایک کھوکھلا مرد تھا جس کے پاس کسی عورت کو دینے کے

لیے نہ تو جسمانی راحت تھی نا زہنی خوشی۔ فضیلت دھیرے دھیرے چپ ہو گئی اور وہاں اس نے اپنی سانسوں کی سہولت کے لیے ایک روزن تلاش کر لیا تھا گھر میں کچن اور واش روم کے علاوہ دو ہی کمرے تھے ایک بیڈ روم اور ایک ڈرائینگ روم۔ ڈرائینگ روم میں ایک کھڑکی تھی اور اس کھڑکی میں فضیلت کے جینے کا کچھ سامان رکھا تھا اس کھڑکی میں بیٹھی وہ اپنے حصے کی دنیا دیکھتی رہتی وہ دنیا جو دس سال تک اس کا کُل بن گئی۔ اس دنیا میں توقیر کے علاوہ سب کچھ تھا وہ اس کھڑکی سے اپنے لیے زندگی کشید کرتی تھی ہنسنے رونے کے بہانے، محبت و نفرت کی ہنگامہ خیزیاں، حیرانی و تجسس کے فریب سب اس ایک کھڑکی سے کشید ہوتا تھا۔

جسم......جسم وہ کہاں تھا اسے نہیں یاد تھا کہ توقیر کے ساتھ لمحہ وصل میں برہنہ جذبات نے کبھی آتشگی کے حظ اٹھائے ہوں اور اب تو امید رکھے بھی کئی سال گزر گئے۔ مگر سالوں کی گنتی بھی اب بھولنے لگی تھی کھڑکی میں نمو پذیر وجود کو سالوں سے سروکار ہی کیا تھا روح کے لیے بہت سامان تھا مگر جسم۔ جسم نے بھی اپنی عرضی جلد ہی فضیلت کے سامنے رکھ دی۔ وہ روح کا بار اٹھا اٹھا تھک گیا تھا۔ اپنے ہونے کا احساس دلانے لگا تھا۔ اور تب اس کھڑکی ہی نے تو سامان راحت فراہم کیا تھا۔ وہ جو باہر بیٹھا تھا تصور کی آنکھ سے اندر جھانکنے لگا تھا۔

دوپہر کا کھانا بناتے اسے اپنے ذہن و جسم پہ رستے زخموں کا خیال آتا جو توقیر اکثر و بیشتر اپنے ذہن کے انتشار کو کم کرنے کی خاطر اسکو دیتا تھا اندرون کے انتشار کو نکیل ڈالنے کے لیے جسمانی چارہ جوئی ضروری ہوتی ہے مگر اسکا جسم درست سمت میں انتشار کو رام کرنے کے قابل نہ تھا تو وہ فضیلت کو ذدوکوب کر کے خود کی محرومیوں کے بھرم قائم رکھتا تھا۔

دوپہر کا کھانا بناتے وہ زخم رسنے لگتے اور نا جانے کہاں سے دو گرم اور پیاس سے بے قابو ہوتے ہونٹ کھڑکی کی جالیوں سے راستہ بناتے اسکی کمر کے زخموں پہ آ کر پیوست ہو جاتے وہ مسرور سی ہوتی آنکھیں موند لیتی ان ہونٹوں کی گیلاہٹ اسکے وجود میں سرسرانے لگتی تو وہ جان لیوا کیفیت میں دیوار سے آ لگتی اس کا جسم بے قابو ہوتا لباس کے ساتھ ساتھ خود سے بھی آزاد ہو جاتا اور وہ نیم جان سی کچن میں ہی زمان و مکان کے بندھنوں سے باہر نکل کر خود کو پا لیتی۔ تب کوئی اسکے کان میں سرگوشی کرتا۔

"تخیل کبھی معذور نہیں ہوتا دیکھ لیا تم نے اسکو کھڑکی سے باندھ کر رکھنا ناممکن ہے۔"

وہ سرشاری سی اٹھتی اور قد آور آئینے میں خود کے انگ انگ کو چھوتی سراہتی، چمکارتی رقص کرنے لگتی۔

"ہاں تخیل کبھی معذور نہیں ہوتا۔"

یہ تخیل کے پنکھ بھی تو اس کھڑکی سے ہی کشید ہوئے تھے۔ وہ جو کھڑکی سے باہر بیٹھا تھا اس نے فضیلت کو ملے بغیر اس کے تمام دکھ بانٹ لیے تھے اور ایک وہ تھا جو ایک کمرے میں ساتھ ہوتا تھا مگر کبھی

فضیلت کے کسی جذبے میں اس کے پاس نہ ہوا تھا۔شام گہری ہوتی جب رات کو آغوش میں بھرنے لگتی تو وہ اپنی وہیل چیئر گھسیٹتا فضیلت کی کھڑکی کے ساتھ آ لگتا۔اور اس سے سرگوشیوں میں باتیں کرتا اس کو تمام محلے کے قصے سناتا۔فضیلت اس کے ساتھ مل کر محلے کے پریمیوں کی ملاقاتوں سے لے کر شادیوں تک کے منصوبے بناتی۔اس کے کہنے پہ فضیلت نے کتابیں سننی شروع کی تھیں۔اور فضیلت اس کو سنتے کہانی کی وادیوں میں گھومتی رہتی۔کتنے ناول تھے جو اس نے پڑھے اور فضیلت نے سنیں۔زندگی یوں ہی گزر سکتی تھی مگر توقیر جو اسے ہر اتوار اپنے ساتھ بازار لے جاتا تھا کہ جو خریدنا ہے خرید لو اس پہ بھی اس نے پابندی لگا دی۔وہ حیران تھا کہ فضیلت اتنی قید کے بعد بھی نکھرتی کیوں جا رہی ہے حالانکہ اتوار کو وہ ستم گر جو کھڑکی سے باہر تھا اپنے گھر ہی رہتا تھا کہ اس کے سوتیلے بھائیوں کو کاروبار سے چھٹی ہوتی تھی تو وہ بھی گھر ہوتے تھے پھر بھی توقیر کو شک تھا کہ کوئی تو بات ہے کہ فضیلت پہ اس کے کسی ستم کا اثر نا ہوتا تھا تو اس دن فضیلت سے سچ اگلوانے کو فضیلت توقیر کے ہاتھوں بہت پٹی تھی تو اس نے خواہش کی تھی کہ کاش کوئی ہوتا جس کے سہارے وہ اس جہنم سے آزادی حاصل کر سکتی۔۔تب اس رات اس وجود کے ساتھ لگ وہ بہت روئی تھی۔وہ دیر تک اسے ڈھارس دیتا رہا۔فضیلت نے اسے کہا کہ،

''وہ اسے سب کچھ مہیا کرتا ہے، ہر جذبے کا پاس رکھتا ہے مگر اسے امید کیوں نہیں دیتا۔کیوں نہیں کہتا کہ تم ایک دن آزاد ہو جاؤ گی اور تمہارے گھر والے تمہیں قبول کر لیں گے تو تم نے گھر سے بھاگ کر بہت بڑا گناہ کیا مگر اس کی سزا تم کاٹ چکی۔تم کیوں نہیں کہتے۔''

فضیلت ہچکیوں کے بیچ روتی تھی۔تب اس نے کہا تھا۔

''حاصل سوائے لاحاصل کو جنم دینے کے کچھ بھی نہیں فضیلت۔چاند پہ پہنچ جانا مریخ پہ پہنچ جانے کی حسرت کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔کیا جنت کے حاصل نے زمین کے لاحاصل کو جنم نہیں دیا تھا تم واپس جنت میں جا کر کیا کرو گی۔''اور فضیلت اسے بے یقینی سے دیکھتی تھی۔

''شائد میں بھی اس کے جینے کا واحد سہارا ہوں مجھے کھو کر اس کے پاس بھی تو کچھ نہیں بچے گا۔ایک واحد میں ہی تو ہوں جو اس کو ہر وقت سننے کو دستیاب رہتی ہوں۔ماں باپ مر گئے اور سوتیلے بھائی کیوں کر اس کی سنیں۔رات گئے اسے لینے آتے ہیں.....آہ.....میں بھی کتنی خود غرض ہوں اپنے محسن کو چھوڑ بھاگ جانا چاہتی ہوں۔''درد اب ندامت کے آنسوؤں میں بدل گیا تھا۔

''فضیلت! دیکھو میں تم کو کسی ایسی شے کی امید رکھنے کے لیے نہیں کہہ سکتا جو حقیقت میں صرف سراب ہے.....دیکھو کس طرح تم یہاں بیٹھ تخیل کے پر اوڑھے تمام دنیا پھر آتی ہو۔کیا تم نے جمیل

صاحب،تصوف صاحب، کنیز بوا یا جن جن کے گھروں کے واقعات میں تمہیں سناتا ہوں ان کے گھر کبھی حقیقت میں گئی ہو۔نہیں نا! مگر تم تخیل کے گھوڑے پہ سوار ان سب کے گھروں تک پہنچ جاتی ہو۔ہے کہ نہیں؟ اس نے اشتیاق سے پوچھا تھا۔''

''ہاں ہاں تم درست کہتے ہو۔مجھے تو اب یہ تک گمان ہو جاتا ہے کہ جمیل صاحب اپنی جمع پونجی کدھر رکھتے ہوں گے، اور راوف صاحب کی بیگم نے بیٹی کے جہیز کے لیے کتنے زیورات بنا لیے ہوں گے۔تم۔تم درست کہتے ہو۔''

فضیلت نے اس روز کے بعد اس کھڑکی کو جہنم سے تعبیر کرنا چھوڑ دیا تھا اور وہاں سے فرار کی امید اسے گناہ لگتی تھی۔کئی سال گزر گئے تھے اب تو۔امید نے اب بھول کر بھی ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔مگر اس دن زور کے بادل گرجے تھے کہ کھڑکیاں ٹوٹ ٹوٹ جاتی تھیں۔بدن نے شور مچا رکھا تھا اور فضیلت سرگوشیوں میں اسے چپ کراتی تھی۔مگر وہ سن کے نہ دیتا تھا۔بضد تھا کہ روح سے کچھ ہی دیر کو سہی فرار ہو۔وہ ناچنے لگی تھی اور بدن بارش کی بوندوں میں بھیگتا جاتا تھا۔زور سے بادل گرجا تو وہ آسودگی کی کھڑکی ٹوٹ گئی.....وہ ہونٹ جو کب کے بے چین کھڑکی پہ دستک دیتے تھے گھر میں دھڑلے سے داخل ہوئے تھے اور فضیلت کے انگ انگ کو چومتے جاتے تھے۔وہ صحن کے بیچوں بیچ بھیگتی کانپتی ماہی بے آب سی کیفیت میں تھی مگر سکون تھا کہ جان نکالتا تھا۔اور تبھی توقیر بیرونی تالا کھول گھر داخل ہوا اس کے ساتھ اس کا کوئی دوست بھی تھا۔فضیلت کو بے لباس دیکھ اس نے فضیلت کی چٹیا کھینچ لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔فضیلت جب نیم مردہ سی لڑھک گئی تو توقیر نے اسے طلاق دے دی تھی اور خود وہاں سے نکل گیا تھا۔

تین دن یونہی زندگی موت کے بیچ جنگ کرتے فضیلت نے جب ہوش کیا تو تمام واقعات یاد کر پریشان سی ہو گئی کہ اب وہ کہاں جائے گی۔ابا کا گھر کتنا پرایا ہو گیا تھا کہ وہاں جاتے شرم آتی تھی۔دس سال لاپتہ رہنے والی لڑکی بیٹی کہاں ہوتی ہے.....وہ تو بدچلن و بدکردار عورت بن جاتی ہے۔عرصے بعد وہ بہت روئی تھی مگر پھر اسی کھڑکی نے جیسے ڈھارس بندھائی تھی۔ساتھ ہی ایک خوشی کی لہر اس میں کوند کر آئی۔

'ہاں اب وہ جو کھڑکی کے باہر ہے وہ اور'میں ہم دونوں ایک دوسرے کا ہمیشہ کے لیے سہارا بن جائیں گے۔کتنا بے وقوف تھا وہ۔نجانے اس رخ پہ کبھی کیوں نہ سوچا تھا اس نے۔اگر ماں کے گھر واپسی کی امید غلط تھی تو کیا وہ مجھے ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ کی امید نہ دلا سکتا تھا۔شائد اسے اپنی معذوری کی لاج آتی ہو مگر وہ نہیں جانتا کہ میں بھی تو معذوری کی زندگی گزارتی آئی ہوں اور پھر اس نے مجھے تخیل کے سہاروں سے چلنا سکھایا۔''

فضیلت اس دن خوب خوب تیار ہوئی۔چوڑیاں، پائل اور گہنے پہنیں کاجل اور لپ اسٹک سے

خود کو سجایا۔ گھر کو دیکھ وہ کئی بار روئی کہ اب نہ جانے یہاں رہنا نصیب ہو یا نہیں..... کہ اب تو جہاں وہ وہاں فضیلت..... سرشار سی ہوتی اس نے گھر سے قدم نکالا تھا۔

آزادی کتنی بڑی نعمت ہے۔

وہ مسکرائی تھی۔

''وہ سامنے ہی تو ہوگا مجھے سامنے دیکھ کہیں وہیل چیئر چھوڑ مجھے تھام لے گا تو۔ اُف جان ہی تو نکل جائے گی میری۔''

فضیلت نے جھکی نظریں اُٹھائی تھیں۔ سامنے پارک میں بچے کھیل رہے تھے اور جمیل صاحب جو روز فضیلت کی کھڑکی کے سامنے سے گزر دودھ لینے جاتے تھے اور جن کی تمام تر کہانیاں وہ سُن چکی تھی سامنے سے آ رہے تھے۔ مگر وہ..... وہ کہاں تھا فضیلت نے حیرانی سے اردگرد دیکھا۔ پچھلے دس سال میں اتوار کے علاوہ ایک دن بھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ نا آئے..... مگر آج.....

''کہیں تو قیر نے تو اس کو..... نہیں نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔''

پسلیوں میں دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔

''جمیل صاحب!..... جمیل صاحب.....!!'' وہ ان کی طرف لپکی تھی۔ مگر وہ سنتے کیوں نہ تھے۔ وہ تیز قدم اٹھاتی ان کے پاس پہنچ گئی۔

''جمیل صاحب میری بات سنیں۔''

''جی! آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟''

''جی وہ میں فضیلت..... خیر آپ مجھے کہاں جانتے ہوں گے مگر میں آپ کو بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں جمیل صاحب! مہربانی فرما کر یہ بتا دیں کہ جو ادھر پارک کے پاس ایک اپاہج آدمی بیٹھتا تھا وہیل چیئر پہ..... سوری میرے الفاظ شاید غلط ہیں۔ آپ کا دوست جو ادھر بیٹھتا ہے روز وہ کہاں ہے؟ آج نظر نہیں آ رہا۔'' فضیلت پرجوش لہجے میں بولی تھی۔

''محترمہ میں جمیل نہیں اور نہ ہی یہاں کوئی اپاہج آدمی کبھی میں نے دیکھا۔ الحمدللہ! اس کالونی میں سب تندرست لوگ ہی رہتے ہیں۔''

فضیلت کو دھچکا لگا مگر فوراً سنبھلتی وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

''آپ مذاق کر رہے ہیں نا! چلیں اب بتا بھی دیں مجھ سے اب مزید دھوپ میں کھڑا نہیں ہوا جا رہا۔ عرصہ ہوا یوں دھوپ اور روشنی کو دیکھے۔'' وہ بڑبڑائی تھی۔

''محترمہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں آپ سے مذاق کیوں کروں گا؟ میرا نام منور ہے اور یہاں کوئی اپاہج آدمی کبھی نہیں دیکھا گیا۔''

فضیلت کے سامنے آسمان گھوم گیا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی راوف صاحب کے گھر گئی مگر وہاں سے کوئی شکور صاحب برآمد ہوئے۔ شام تک ہر ہر جگہ اسے ڈھونڈ جب وہ نڈھال سی ہوگئی تو تھک کر پارک کے ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ اپنے تصور کے پنکھ سامنے رکھ وہ ماتم کرتی تھی۔ مگر پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ ساری حقیقت واضح ہوگئی تھی۔ اس کی اصل دوست تو وہ خود ہی تھی۔ تو اب رونا کس بات کا وہ ایک بار پھر ہنسی تھی۔ اور تبھی وہ اس کے پاس آ بیٹھا تھا۔

''تم نے امید کا چہرہ کیوں نہ دیکھا فضیلت! یہ نا امیدی کے خمیر سے ہی طلوع ہوتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ تم امید اپنے اندر خود پیدا کرو سو جانتے بوجھتے تم کو اس کے معنی نہ بتائے۔ تم جو خزاں کے بعد بہار آنے پہ کھڑکی کھولتی ہوگی تو وہاں سوکھے درختوں پہ جو ننھے پتے چٹختے ہوں گے تو وہ امید تھے ان نا امید کوکھوں کے لیے جو خود کو بانجھ جان کر وقت کی دیوار پہ ابد کا راہ تکتی ہیں۔ تم نے امید کو ہر چڑھتے سورج سے کشید کیوں نہ کیا جو ہر روز غروب سے پہلے خوب خوب جوبن پکڑتا تھا۔ تم نے اپنے تخیل کے پنکھ اس قدر کمزور کیوں کر دیئے۔ بعض دفعہ امید مستقبل کے کسی پرفسوں لمحے سے کشید کرنی پڑتی ہے۔ تمہیں تخیل کے پنکھ سنبھال کر رکھنے چاہیے تھے۔ کیا تم نے کتابیں پڑھنا چھوڑ دی تھیں۔ سنو فضیلت! کتاب پڑھنا اور کتاب سننا دو الگ باتیں ہیں۔

کیا تم پارک کے اس خزاں زدہ بھورے گھاس کے اس پار ٹھاٹھیں مارتا سمندر دیکھ سکتی ہو؟''

اور اس بار فضیلت نیلے سمندر کی لہروں میں اٹھکیلیاں کرتی تھی اور وہ اس پہ پانی پھینکتا تھا تو بدن کے ساتھ روح تک سرشار ہو جاتی تھی۔

◀◀ ● ▶▶

Adv. Hamad Hassan, Diamond city colony
house147
E block
chprar road
Sialkot cantt.
Ph # 00923006952001

● آسیہ رئیس خاں

رفاقت

''بھیا!'' دادی مجھے دیکھتے ہی مجھ سے لپٹ کر رونے لگیں۔ میں جو پچھلے آدھے گھنٹے سے بدترین وسوسوں اور خدشات سے نبرد آزما انھیں گلیوں میں ڈھونڈ رہا تھا، مطمئن سانس خارج کر کے ان کا سر تھپتھپانے لگا۔

''کتنی دیر سے یہاں بیٹھی انتظار کر رہی ہوں، کیوں اتنی دیر کر دی؟ میں کتنا ڈر گئی تھی۔'' وہ اس وقت برسوں قبل کے کسی منظر میں تھیں اور مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھ رہی تھیں۔ وہ اکلوتا بڑا بھائی جو میری پیدائش سے قبل ہی اس دنیا سے کوچ کر گیا تھا۔ میں نے انھیں پرانی تصویروں میں دیکھا تھا بس۔

''سوری!'' میں نے ان کے چہرے سے پسینہ پونچھا اور دوپٹا سر پر درست کیا۔

''گھر چلیں، سب انتظار کر رہے ہیں۔''

''ہاں چلو چلو.....'' انھوں نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑا۔

دادا کے بعد یہ تیسری دفعہ ہوا تھا کہ وہ تنہا گھر سے نکل کر راستہ بھول گئی تھیں۔ اب تک دادا ہی ان کا خیال رکھتے تھے اور ان پر نظر بھی۔ ان کے بعد ہم سب کتنی بھی کوشش کرتے، ایک دادا کے مقابلے میں ہم سب کوششیں کم پڑ جاتی تھیں۔

علامتوں کا ظہور بتدریج ہوا تھا۔ سب سے پہلے وہ اعداد و شمار اور تاریخ میں گڑبڑ کرنے لگی تھیں۔ پھر وقت اور پہر کا اندازہ بگڑ۔ دوپہر میں آواز لگاتیں کہ ابھی تک ناشتہ نہیں دیا، رات میں دو بجے دادا کو فجر کے لیے اُٹھاتیں کہ جلدی کریں سورج نکلنے ہی والا ہے تو کبھی دوپہر میں انھیں کہتیں کہ مارننگ واک کا وقت ہو گیا ہے۔ پھر وہ چیزیں اور جگہیں بھولنے لگیں۔ ان کی غائب دماغی نے باورچی خانے اور غسل خانے میں قدرے بڑے حادثے رونما کیے تو صبا کے اصرار پر میں انھیں ڈاکٹر کے پاس لے گیا ورنہ امّی ابّا اور دادا تو اسے عمر کا تقاضہ اور نسیان مان کر طبی مدد کو تیار نہ تھے۔ ڈاکٹر سے ملی الزائمر کی خبر نے سب کو فکر مند کر دیا۔ ڈاکٹر نے بہت تفصیل سے بات کی تھی۔ وہاں تو وہ بڑے تحمل سے سب سنتی رہی تھیں لیکن گھر آ کر رونے لگیں تو دادا نے ان کے ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

''میں ہوں ناں..... تمھیں سنبھالوں گا بھی اور سب یاد بھی دلاتا رہوں گا۔''

اور پھر دادا نے واقعی یہ مشکل اور صبر آزما ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔

''کاش یاد دلانا اتنا آسان ہوتا۔''

آنے والے مہینوں میں کتنی بار میں نے دادا کی گیلی آنکھیں دیکھ کر یہ سوچا تھا۔ جب دادی بالکل اجنبی نظر سے انھیں دیکھتیں یا ان کی مکمل بات سن کر پوچھتیں، ''آپ کون؟'' اور دادا خوشدلی سے کہتے، ''تمھارا اپنا ہی ہوں۔'' اور دادی بھی ''اچھا!'' کہہ کر انھیں بغور دیکھتے ہوئے یاد کرنے کی کوشش کرتیں۔

آہستہ آہستہ وہ ماضی قریب اور حال بھولتی گئیں اور ان کی پرانی یادیں تازہ ہوتی گئیں۔ کبھی انھیں جوانی کا کوئی قصہ یاد آ جاتا، کبھی اپنے والدین کی کوئی بات تو کبھی اپنے بہن بھائیوں کی اور کبھی ابّا اور پھوپھو کے وہ قصے جو انھیں بھی یاد نہ تھے۔

امی مشکوک ہو جاتیں کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ابھی کی بات یاد نہیں اور گڑے مردے اکھاڑے جا رہے ہیں۔ ایسے میں صبا انھیں چھیڑتی کہ ''پھوپی یہ خاندانی بھی ہو سکتا ہے، اللہ کو ناراض نہ کریں۔''

دراصل امّی کا مزاج ہی کچھ ایسا تھا۔ انھیں دادی کی اکثر باتوں پر اعتراض ہوتا تھا اور برسوں کے مشاہدے سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ امّی کی یہ نفسیات دادا دادی کی ازدواجی زندگی اور ابّا اور ان کی ازدواجی زندگی کے تضاد کی وجہ سے تھی۔ بقول امّی، ابّا کا مزاج، ٹھنڈا اور دھیما تھا۔ رومانس انھیں چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔ جب کہ دادا دادی اپنی محبت اور رشتے کی گرم جوشی نہ چھپاتے تھے نہ اس پر شرمندہ ہوتے تھے۔ دادا دادی کو چھیڑتے رہتے، کبھی رومانی شعر سناتے، تو کبھی اخبار پڑھ کر سناتے، چہل قدمی کو جاتے تو دادی کا ہاتھ تھامے رہتے۔ دادی اپنے لگائے پودوں سے پھول توڑ کر بالوں میں سجاتیں تو کبھی چنبیلی اور موتیا کے گجرے لگاتیں۔ کاجل تو ہمیشہ ان کی آنکھوں میں سجا رہتا۔ وہ کہتیں تیرے دادا کو کوری آنکھیں بالکل نہیں پسند۔ بالوں میں پابندی سے مہندی لگاتی تھیں۔ اب صبا کے آنے کے بعد صبا سے ہاتھوں پر بھی شوق سے مہندی لگواتی تھیں۔ امّی کو یہ سب 'چونچلے' لگتے اور اب صبا بھی دادی کے ان چونچلوں میں شامل رہتی۔ صبا تھی تو امّی کی بھتیجی لیکن مزاج ان کے برعکس تھا۔ وہ بہت حساس اور ہمدرد تھی۔ یہ صبا کا 'آئیڈیل بڑھاپا' تھا۔ وہ اکثر مجھے کہتی، ''ذیشان مجھے ہمارا بڑھاپا بھی ایسا ہی چاہیے۔ آپ دادا دادی کو دیکھ کر ہوم ورک کر لیں۔''

دادا کی محبت اور ہمت کی وجہ سے دادی کی بڑھتی علامتوں، دشواریوں اور جسمانی پریشانیوں کے باوجود سب ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ ایک رات دادا ایسے سوئے کہ پھر جاگ ہی نہ سکے۔ دادا کی میت کو دیکھ کر جب دادی نے تاسّف سے کہا، 'اچھا انسان تھا بے چارہ چلا گیا' تو سب کے لیے صبر کرنا مشکل ہو گیا

تھا۔ دادا کی زندگی میں بھی کبھی کبھی وہ دادا کو پہچانتی تھیں اور ان کے جانے کے بعد بھی اکثر ان کا پوچھتیں،
''کہاں گئے؟ ابھی تک آئے نہیں؟''

دادا کے بعد یہ مشکل کام ہم سب کے ساتھ ساتھ خاص طور پر صبا نے سنبھال لیا تھا۔ اس کی لاابالی طبیعت اور کم عمری کے لحاظ سے یہ اس کے لیے ہرگز آسان نہ تھا اور سچ کہوں تو میں روز اسے دیکھ کر نئے سرے سے حیران ہوتا تھا۔ امّی کی بھتیجی کی یہ خوبیاں میرے لیے نئی تھیں۔

''ذیشان!'' میں سمجھ رہا تھا وہ سوگئی ہے لیکن صبا کی پُرسوچ پکار پر میں نے اس کی سمت کروٹ بدلی۔

''ممم.....؟''

''جس دن دادا کا انتقال ہوا انھوں نے میری اور دادی کی باتیں سن لی تھیں۔'' اس کے سنجیدہ اور آزردہ انداز پر میں چونکا لیکن چپ رہا کہ کوئی خاص بات ہے جو وہ کہنا چاہ رہی تھی۔

''اس دن دادی مجھے اپنی بچپن کی سہیلی شوّ سمجھ کر اپنے راز بتا رہی تھیں کہ اس عید پر عارف نے انھیں سب سے چھپا کر چوڑیاں تحفے میں دی ہیں، ان دونوں نے منت مانگی ہے کہ اس کی امّاں مان جائیں اور یہ کہ اس سے شادی نہ ہوئی تو میں مرجاؤں گی شوّ۔'' میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

''میں نے آج ابّا سے پوچھا عارف کے متعلق کہ وہ کون تھے۔'' اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

'' انھوں نے بتایا کہ وہ دادا کے سب سے اچھے دوست تھے۔'' میں نے بے اختیار ہاتھ بڑھا کر اسے قریب کیا اور وہ رونے لگی۔ میں نہیں چاہتا تھا صبا اس وقت میرا چہرہ دیکھے۔

اگلے دن آفس میں میں پورا دن بے قرار رہا۔ صبا کی باتیں میرے ذہن سے نکل ہی نہیں رہی تھیں۔

شام میں میں کمرے میں آیا تو وہ الماری کھولے کھڑی تھی۔

''صبا!'' میں فیصلہ کر کے آیا تھا۔

''ارے، جلدی آگئے آج!'' وہ پلٹی۔

''مجھے کچھ کہنا ہے۔'' میں دروازہ بند کر کے اس کی سمت بڑھا۔

میں نہیں چاہتا تھا صبا کا 'آئیڈیل بڑھاپا' خراب ہو۔

◀◀ ● ▶▶

701-B Roshan Heights Guruprasad
CHS Plot no 42 ,Sector 40
Seawoods Nerul WestNavi,Mumbai, 400706
9987021374

● تاج الدین محمد

سو روپے کا نوٹ

مجھے کالج سے آتے ہوئے آج کافی دیر ہوگئی تھی۔ صبح بغیر ناشتے کے ہی گھر سے نکل پڑا تھا۔ بھوک کی شدت آنتوں میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ میں بچپن سے ہی ٹھیلے ریڑی پر کچھ کھانے پینے کا عادی نہیں ہوں۔ اگر کبھی دوستوں کے اصرار پر کھا بھی لیا تو قے ہونا یا پیٹ میں درد اور مروڑ ہونا لازمی تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی پہلا جملہ میرے منہ سے نکلا۔

''ماں جلدی سے کچھ کھانے کو دو، تیز بھوک لگی ہے۔'' کرایے کے معمولی سے گھر میں باورچی خانہ نہیں تھا۔ ایک کمرے کو ہی امی نے باورچی خانہ بنایا ہوا تھا۔ ایک مٹی کا چولہا جس میں دو چھوٹے بڑے منہ تھے، جسے مٹی سے لیپ پوت کر سجا سنوار دیا جاتا تھا۔ لکڑی اور کوئلے کا زمانہ تھا، جس سے کھانا بنتا تھا۔ آجکل کی طرح کوئی نعمت خانہ بھی نہیں ہوا کرتا تھا۔ چولہے کے آس پاس ہی برتنوں کو قرینے سے سجانا اور دو چار کیلوں کو دیوار میں گاڑ کر بھاری برتنوں کو ٹانگ دینا عورتوں کا خاص ہنر تھا۔ لیکن آج یہ کیا؟ آج تو چولہے میں آگ نہیں تھی اور سب سنسان پڑا تھا؟ برتن سب دھلے دھلائے سلیقے سے سجے ہوئے تھے۔ بے ترتیبی اور بے قاعدگی ہی کسی مثبت تعمیر کا اشارہ دیتی ہے۔ ماں کمرے کے دوسری جانب الماری کے نیچے کچھ تلاش کرنے میں مشغول تھیں۔ انہوں نے ایک نظر میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آج کالج سے جلدی آگئے؟'' بجھی بجھی سی آنکھیں، تھکی ہوئی نڈھال سی طبیعت اور مایوسی چہرے پر صاف جھلک رہی تھی۔ میں نے سر ہلا کر بے دلی سے اثبات میں جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

''سب خیریت تو ہے..... بہت پریشان لگ رہی ہیں..... کیا بات ہے..... کیا تلاش کر رہی ہیں..... آج کھانا نہیں بنا..... اور سب تو ٹھیک ہے نا..... کیوں خاموش سی ہیں؟'' بہت سارے سوالات بھوک کی شدت نے پیدا کیے تھے۔ ورنہ میں ایک بار میں اتنے سوالات کرنے کا کبھی عادی نہیں رہا۔

انہوں نے میری جانب نگاہ اٹھائی اور مایوسی بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بوجھل قدموں سے آگے بڑھ کر ٹوٹی پھوٹی آواز میں کہنے لگیں۔

''سو کا نوٹ کہیں گم ہوگیا ہے۔ صبح سے پورا گھر تلاش مارا، کہیں نہیں ملا۔ بس وہی پیسہ تھا ہمارے

پاس، اسی لیے کھانا نہیں بنا سکی۔ سوچا پڑوس سے کچھ لا کر بنا دوں، لیکن دل کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر آمادہ نہیں ہوا۔ پھر خیال آیا کہ دکاندار سے ادھار لے آؤں، لیکن اگلے ہی لمحے یہ سوچتے ہوئے رک گئی کہ یہیں کہیں گر گیا ہوگا، مل ہی جائے گا۔ وقت کا پتہ ہی نہیں چلا، اور تم آ گئے؟''

''بس اتنی سی بات کے لیے اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟'' یہ کہہ کر نوٹ گم ہونے کا وقت اور جگہ پتہ کر کے میں ادھر ادھر تلاش کرنے میں لگ گیا۔ امی کافی تھک چکی تھیں۔ تھکن محنت و مشقت کی نہیں، مایوسی و ناامیدی کی تھی، قلت و تنگدستی کی تھی، غربت و افلاس کی تھی۔ تہی دستی اور پریشانی کی تھی۔ یہ سب زندگی کے وہ لاحاصل بوجھ تھے جو زندگی کو اجیرن بنا دیتے ہیں اور وقت پہاڑ کی مانند کٹتے نہیں کٹتا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب سو روپے کے نوٹ سے گھر میں ہفتے بھر کا راشن آرام سے آجایا کرتا تھا۔

میں کالج سے فارغ اوقات میں ایک پریس میں پروف ریڈنگ کا کام کر لیا کرتا تھا۔ جس سے میرے پڑھنے لکھنے کا خرچ نکل آتا تھا، اور پاکٹ خرچ بھی پورا ہو جاتا تھا۔ اور اسی معمولی سی رقم سے گھر میں گاہے گاہے کچھ دے دینا بھی میرا معمول تھا۔ پریس کا مالک نہایت کنجوس اور سخت دل آدمی تھا۔ ایڈوانس کے نام پر تیوریاں چڑھا لینا اس کی فطرت تھی۔ اس لیے ملازمین سخت ضرورت اور مجبوری کی حالت میں بھی اس سے اپنی پریشانی بیان کرتے ہوئے جھجکتے اور گھبراتے تھے۔

تبھی ماں نے مدھم سی آواز میں کانوں کے پاس آ کر کہا۔

''تم کہہ رہے تھے کہ تمہیں بھوک لگی ہے؟ پڑوس سے کھانے کے لیے مانگ کر کچھ لا دوں؟''

لیکن فوراً ہی انہیں خیال آیا، کہنے لگیں، کچھ بہانہ بنا دوں گی۔ یہ وہی ماں تھی جس نے میری بھوک کی خاطر اب اپنی خودداری کو طاق پر رکھ دیا تھا۔ میں نے ان کا سر چومتے ہوئے کہا۔

''بھوک کا کیا ہے، اب اتنی بھی بھوک نہیں کہ میں ایک گھنٹہ صبر نہ کر سکوں؟ جوان آدمی کو بھوک لگتی ہے، تو وہ اسے سہنا بھی جانتا ہے، آپ ایسا کیجئے چائے بنا لیجئے، میں جب تک نوٹ تلاش کر رہا ہوں۔''

چائے بن چکی تھی۔ انہوں نے مجھے چائے کی پیالی پکڑاتے ہوئے کہا۔

''میں اب عصر کی نماز پڑھنے جا رہی ہوں۔ اللہ سے دعا کروں گی..... شاید کہیں مل جائے۔ جہاں میری نگاہیں نہ پہنچ سکیں ہوں ممکن ہے وہاں اللہ کی رحمت پہنچ جائے۔ شاید کسی موذی چوہے کے ہاتھ لگ گیا ہوگا اور کمبخت نے ہماری غربت میں چار چاند لگا دیے۔ اللہ اسے غارت کرے۔'' مایوسی نے انہیں کافی مضمحل اور نڈھال کر دیا تھا، اور حد درجہ دکھی اور رنجیدہ بھی۔ نوٹ گم ہونے کا ملال چہرے سے صاف ظاہر تھا۔

ماں وضو کر کے نماز میں مشغول ہو گئی تھیں کہ اچانک میرا خیال دروازے کی جانب چوہے کے

باہر نکلنے کی جگہ پر گیا۔ ماں نماز سے فارغ ہو کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھیں کہ میں نے سو کا نوٹ ہاتھوں میں رکھتے ہوئے کہا۔

''لو مل گیا، اللہ نے آپ کی دعا سن لی۔'' ماں اپنے دونوں ہاتھوں کو چہرے پر پھیرتے ہوئے حیرت سے مجھے تکتے ہوئے کہنے لگیں۔

''میں نے تو کوشش کی ساری حدیں پار کر دیں، لیکن بدبخت ملا ہی نہیں۔ اللہ تمہیں خوش رکھے، ایک مرد کی موجودگی گھر والوں کو کبھی تنہا اور اداس نہیں ہونے دیتی۔ دیر سویر امیدیں بر آتی ہیں۔ انسان کو کبھی اتنا جلدی مایوس و ناامید بھی نہیں ہونا چاہیے۔''

اس بات کو ہفتوں گزر چکے تھے۔ آج گھر میں بھائی اور دو بہنوں کے اسکول کی فیس ادا کرنے کو پیسے نہیں تھے۔ میری تنخواہ کا وقت ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ ماں نے سب کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''آج تمہارے ماموں آنے والے ہیں۔ ان سے سو روپیہ دل پر جبر کر کے ادھار مانگ لوں گی لیکن تم سب کا اسکول کل سے ناغہ نہیں ہوگا۔'' اسکول سے کئی بار بچوں کی معرفت زبانی نوٹس آ چکا تھا۔ اسکول انتظامیہ نے اسکول آنے سے صاف صاف منع کرتے ہوئے کہہ دیا تھا، پیسے لے کر ہی آنا، ورنہ مت آنا۔ ماں صبح سے پریشان تھی۔ بے بضاعتی و بے مائیگی نے اسے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔

دوپہر سر پر تھی۔ سورج آسمان کے سینے میں دہک رہا تھا۔ کھانا بن چکا تھا۔ میں آج کالج نہ جا کر کچھ ضروری کام سے پیسے کی فکر لیے ہوئے سیدھے پریس کو نکل گیا۔ ماں نے دونوں بہنوں کو حکم صادر کر دیا تھا۔

''تم دونوں آج گھر کی پوری طرح صاف صفائی کر لو۔ بستر کو درست کر دو۔ بیڈ کے نیچے جھاڑو لگا دو۔ چولہے کی راکھ کو نکال کر باہر پھینک آو۔ کتابوں کو ترتیب سے سجا دو۔ جھالے جھاڑ دو۔ الماری صاف کر لو۔ وقت ملے تو بچے ہوئے کپڑے دھو ڈالو۔ ہو سکے تو باہر کی نالی بھی صاف کر دو۔''

سورج اب اپنی تپش کھو چکا تھا۔ دھوپ میں شدت برائے نام تھی۔ ماں نے بستر کو دھوپ میں رکھ چھوڑا تھا۔ بستر اٹھا کر بیڈ پر رکھتے ہوئے دیوار کی جانب انہیں کچھ دکھائی دیا۔ وہ ٹھٹھک کر رہ گئیں۔ انہوں نے اسے اچھی طرح دیکھ کر اپنی ہاتھوں میں دبا لیا۔ تھوڑی ہی دیر میں سب کچھ سمجھ گئی تھیں۔ زار و قطار رونے کی آواز سن کر بہن کمرے میں آ کر پوچھنے لگی۔

''کیا ہوا امی؟ اچانک اتنا رو کیوں رہی ہیں؟ مجھے بھی تو کچھ بتائیے؟'' لیکن آج ان کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ مٹھی بندھی ہوئی تھی اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

میرا کام ختم ہو چکا تھا۔ میں جیسے ہی گھر میں داخل ہوا، آہٹ پا کر بہن جلدی سے دروازے پر آئی

اور کہنے لگی۔

''امی بہت رو رہی ہیں، ان کی مٹھی میں کچھ ہے؟ میں نے کئی بار پوچھا، لیکن وہ نہیں بتا رہی ہیں، نہ ہی مٹھی کھول رہی ہیں۔ کہہ رہی ہیں، تمہارے بھائی کو ہی دکھاؤں گی۔ میں نے تو ایسی کوئی غلطی نہیں کی ہے؟ کیا آپ نے؟'' کہہ کر میری جانب دیکھنے لگی۔

میں جلدی سے ماں کے پاس پہنچا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ پاس جا کر ان کا سر سہلاتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

''کیا ہے مٹھی میں؟ کیوں رو رہی ہیں؟ مجھے تو دکھایئے؟'' میرے پوچھنے پر انہوں نے مٹھی کھول دی۔ مڑے ہوئے بوسیدہ اور پسینے سے شرابور کھویا ہوا سو روپے کا نوٹ ان کی ہاتھوں میں تھا۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا۔

اس دن وہ خوب روئی تھیں، اور ساتھ ساتھ مجھے بھی رلایا تھا۔

◀◀ ● ▶▶

House No. N-69/B,
Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar,
Okhla, New Delhi-110025.
9891 565 748. 9717 925 786

اقبال حسن آزاد
کی تنقیدی کتاب
نثری اصناف ادب
اور
طنز و مزاح کی روایت
منظرِ عام پر

● **نشاط پروین**

شور

''اف خدا! یہ شور شرابا۔''

ابھی تو فجر کی نماز پڑھ کر سوئی ہوں۔ نیند بھی پوری نہیں ہوئی ہے۔ نماز پڑھ کر جو سوتی ہوں تو پھر سات بجے سے پہلے اٹھتی نہیں ہوں لیکن نیند کیا خاک آئے گی۔ صبح سے ہی شور شرابا شروع ہو جاتا ہے۔ کالونی میں جتنے بھی گھر ہیں سب آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ کسی گھر میں کوکر کی سیٹی بج رہی ہے تو کوئی ٹیمپو والا ہارن دیتا ہے۔ کوئی رکشے والا کسی بچے کا نام لے کر پکار رہا ہے..... جلدی کرو..... دیر ہو جائے گی۔۔۔ ہر طرف گہما گہمی رہتی ہے۔ میرے گھر کے نچلے حصے میں کرائے دار رہتے ہیں۔ ان کے بھی دو چھوٹے بچے ہیں۔ وہ لوگ بھی سویرے ہی اُٹھ جاتے ہیں۔ ٹفن پیک کرنا..... ڈریس پہنانا..... یہ سب کام خاموشی سے بھی ہو سکتے تھے..... لیکن نہیں جو کام بھی ہوگا شور شرابہ کے ساتھ ہی ہوگا۔ سبھی آوازیں کان میں چھید کرتی ہوئی نکلتی ہیں۔ جب سارے بچے اسکول چلے جاتے تو بالکل سناٹا چھا جاتا ہے۔ کہیں سے کوئی آواز نہیں آتی۔ سارا ماحول پُرسکون ہو جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے سبھی لوگ اپنے بچوں کو اسکول بھیج کر پھر سے گہری نیند کی آغوش میں کھو گئے ہوں۔ لیکن اب میرے اُٹھنے کا وقت ہو جاتا ہے۔ میں اپنی نیند کو خیر باد کہہ کر تیار ہو جاتی ہوں۔ پھر تو مجھے بہت سارے کام کرنے ہوتے ہیں۔ میرے شوہر کو بھی آفس جانا ہے۔ لیکن پہلے انہیں بیڈ ٹی بنا کر دینا ہے، ہلکے ناشتہ کے ساتھ۔ ہر بات کا خیال رکھنا ہے۔ پھر سوچنا کہ ناشتے میں کیا بنانا ہے..... لنچ میں کیا لے جانا ہے؟ ان سے مشورہ کر کے میں اپنے کاموں میں لگ جاتی ہوں۔ وقت پر سب کام کر دینا ہے۔

ان کے جانے کے بعد گھر کے بچے ہوئے کاموں کو نپٹانا۔ یہ سب روز کا معمول ہے۔ دن کے وقت میں اپنی نیند پوری کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن جیسے ہی نیند آئے گی، کوئی نہ کوئی آ جائے گا..... کسی نہ کسی کام سے۔ لگتا ہے جیسے سب کو پتہ ہے کہ میں سوئی ہوئی ہوں۔ گھر میں اکیلی ہوں۔ اس لیے ہر وقت الرٹ رہنا پڑتا ہے۔ کون کب آ جائے۔ اس لیے اب تو دن میں سونا بھی حرام ہو گیا ہے۔ آنکھ بند بھی کرتی ہوں تو نیند نہیں آتی۔ دیر رات گئے تک جاگنے کا اب تو فیشن بن گیا ہے۔ دیر رات تک جاگنا..... صبح لیٹ سے اُٹھنا۔

کبھی کبھی رات میں نیند بھی اُچٹ جاتی ہے اور پھر کب آتی ہے پتہ بھی نہیں۔ چلتا دماغ میں الارم فٹ ہے۔ جیسے ہی کانوں میں اذان کی آواز آئے گی، نیند کھل جائے گی۔ اذان سن کر میں اُٹھ جاتی ہوں۔ نماز پڑھتی ہوں، پھر سو جاتی ہوں۔ ابھی نیند بھی نہیں آتی ہے کہ کالونی میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ ورکنگ ڈے ہے۔ سب کے پاس الگ الگ طریقے کے کام ہیں۔ آلو پیاز والا، سبزی والا، دودھ والا، مچھلی والا...... ساری آوازیں گونجنے لگتی ہیں۔ سب کو صبح صبح ہی آنا ہوتا ہے۔ ساری آوازیں کانوں سے ٹکراتی ہوئی...... میری پیاری سی نیند کو بھگاتی ہوئی...... مجھے اپنے بیڈ کو خیر باد کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

لیکن آج میرے کان سے ایک الگ آواز ٹکرائی۔ آپ ابھی تک سوئی ہیں...... نیند پوری نہیں ہوئی ہے؟ سات کب کے بج چکے ہیں۔

میں آنکھ ملتی ہوئی اُٹھی۔ بالکنی سے جھانک کر باہر دیکھا تو ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کہیں کوئی ہلچل نہیں تھی۔ سب اپنے اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔ کیونکہ پورے ملک میں لاک ڈاؤن نافذ کر دیا گیا تھا۔ نہ کسی کو کہیں جانا ہے نہ کسی کو آنا ہے۔ اسکول، کالج، آفس سب بند پڑے تھے۔ کسی کو کوئی جلدی نہیں تھی۔ میری رگ وپے میں عجب طرح کا سکون اُترتا چلا گیا۔ کیا میں کوئی خواب دیکھ رہی تھی؟ میں نے اپنے بازو میں ہلکی سی چٹکی لی۔ نہیں یہ حقیقت تھی۔ آج بچوں کو اسکول نہیں جانا تھا۔ بڑوں کو آفس نہیں جانا تھا۔ سبزی والے، ٹھیلے والے سب غائب تھے۔ میں نے ایک زور کی سانس لی اور اس پُرسکون فضا کو اپنے اندر اُتار لیا۔

پھر چند روز ایسے ہی پُرسکون گزرے لیکن دھیرے دھیرے یہ خاموشی مجھے اندر ہی اندر کاٹ کھانے لگی۔ کہیں کوئی آواز، کوئی شور نہیں۔ صرف پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں آتیں۔ سبھی لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند تھے۔ بازار بند تھے۔ لوگ بے روزگار ہو رہے تھے۔ آخر بھوک نے لوگوں کو گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ مدد مانگنے والوں کی قطاریں لگنے لگیں۔ کئی مددگار ہاتھ آگے آنے لگے۔ گلی میں آوازیں سنائی دینے لگیں۔ لیکن اسکول کالج ابھی تک بند تھے۔ انہیں آفس بھی جانا نہیں تھا۔ صبح کو رکشے والے اور ٹیمپو والے کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ میں آرام سے دیر تک سوئی پڑی رہتی۔

ایک روز میری کالونی میں ایک دل دہلا دینے والا حادثہ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ ہمارے پڑوسی جو دہلی کے کسی ہسپتال میں زیر علاج تھے، وہ انتقال کر گئے۔ یہاں ان کا گھر تھا۔ سارے رشتہ دار یہاں تھے۔ اس لیے ان کے گھر والے انہیں ایمبولنس سے لے کر یہاں آ گئے۔ اب کیا تھا، کالونی والوں کو خبر لگ گئی۔ کسی نے افواہ اڑا دی کہ انہیں تو کرونا ہو گیا تھا۔ اس وقت دلی میں یہ مرض بہت زیادہ پھیلا ہوا تھا۔ پوری کالونی میں ہلچل مچ گئی۔ لوگ ایمبولنس کو کالونی کے اندر داخل نہیں ہونے دے رہے تھے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ لاک

ڈاؤن کی وجہ سے پہلے ہی سے بہت ساری پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر کہیں خدانخواستہ پوری کالونی سیل کر دی گئی تو نہ جانے اور کیا ہوگا۔ لیکن پھر کچھ سنجیدہ لوگ سامنے آئے۔ انہوں نے سبھوں کو سمجھایا کہ اگر یہ کرونا کا کیس ہوتا تو ہسپتال والے لاش افراد خانہ کو سپرد ہی نہیں کرتے بلکہ اوپر ہی اوپر آخری رسومات ادا کر دی جاتیں۔ خیر ایمبولنس کالونی کے اندر آئی اور میرے ہی گھر کے سامنے رکی۔ پوری کالونی میں سناٹا پسر گیا۔ بہت سارے لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند ہو گئے۔ میں نے بھی اپنے گھر کی ساری کھڑکیوں اور دروازوں کو بند کر دیا۔ ڈر کے مارے میرا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ دہشت کے مارے میری روح کانپ رہی تھی۔ ہر شخص کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔

اب دھیرے دھیرے حالات معمول پر آ رہے ہیں۔ بازار اور آفس کھلنے لگے ہیں۔ سڑکوں پر لوگوں کی آمدورفت شروع ہو گئی ہے۔ لیکن وہ پہلے جیسی چہل پہل نہیں ہے۔ بچوں کے اسکول ابھی تک بند ہیں۔ صبح سات آٹھ بجے تک گلی میں سناٹا ہی چھایا رہتا ہے۔ کبھی کبھی یہ سناٹا بہت کھلنے لگتا ہے۔ میری نیند پوری ہو یا نہ ہو، بچوں کا شور پھر سے سنائی دے۔

Shah Colony,Shah Zubair Road,Munger-811201
Mob:+91 82104 89478

اقبال حسن آزاد
کا
تیسرا
افسانوی مجموعہ
پورٹریٹ
(۲۰۱۷ء)

● **ناول کا ایک باب**

● **اقبال حسن خان**

راج سنگھ لاہوریا

(گزشتہ سے پیوستہ)

اُنہی دنوں ایک واقعہ اور پیش آ گیا۔شوکی ایک قابل اعتراض تقریر کرنے کے الزام میں پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔وہ دن بھی عجیب تھے۔آزادی سے قبل مسلمانوں سے بڑے بڑے وعدے کرنے والی حکومتیں اُن کے ساتھ انگریزوں کے زمانے سے کچھ مختلف سلوک نہیں کر رہی تھیں۔لیاقت علی خان کے زمانے تک ملک کے انتظامی معاملات لشتم پشتم چلائے جاتے رہے،اس کے بعد سیاسی تماشے شروع ہوئے۔جلدی میں پاکستان بنا تو لیا گیا تھا لیکن اُسے چلانا کیسے تھا،یہ کسی کو پتہ نہیں تھا اور بادی النظر میں لگتا بھی ایسا تھا کہ کسی کو اس ملک کے چلانے میں کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔انگریزوں کے زمانے سے ہی ملکی انتظامیہ کی ریڑھ کی ہڈی بیوروکریسی یا نوکر شاہی تھی۔یہ لوگ اتنے بڑے ملک کو ایک مضبوط انتظامی ڈھانچے میں نہ صرف باندھے ہوئے تھے بلکہ اُس انتظام کو جاری و مضبوط رکھنے کے امین بھی تھے۔پاکستان کے حصے میں چند ایک کو چھوڑ کر، بہت بڑی تعداد میں بیوروکریسی کے وہ اراکین آئے تھے جو متحدہ ہندوستان میں نالائقوں میں شمار ہوتے تھے اور جنہیں اپنی نوکریاں حکومت ہندوستان کے سپرد کرنے میں بدستور گھاٹا دکھائی دیتا تھا،چنانچہ اُنہوں نے پاکستان کے لئے ''آپٹ'' کیا اور ہندو نوکر شاہی کے یہاں سے چلے جانے کے بعد اُن مقامات پر تعینات کیے گئے جو اُن کی اہلیت اور قابلیت سے لگا نہیں کھاتے تھے چنانچہ اُنہوں نے انتظامی معاملات کا ستیاناس کر کے رکھ دیا۔کرپشن کو فروغ دیا اور اپنی ترقی کے لئے ہر وہ راستہ اختیار کیا جس کا تصور انگریزوں کے دَور کی بیوروکریسی میں کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔بیوروکریٹس دھڑوں میں بٹ گئے۔پہلے ''مہاجر بیوروکریٹس'' پھر اپنے اپنے علاقوں کے بیوروکریٹس۔بنگالی اور بہاری (باہر والے) کی تفریق تو پہلے ہی دن سے دکھائی دے رہی تھی،اب پنجابی ٹولہ جیسی اصطلاحات نظر آنے لگیں۔متروکہ املاک کی بندر بانٹ میں پاکستانی بیوروکریسی کا کردار انتہائی مکروہ اور غلیظ رہا۔یہ مکروہ کردار صرف اردو یا کوئی اور زبان بولنے والوں تک محدود نہیں تھا،متحدہ ہندوستان کے اکثر نالائق بیوروکریٹس ان میں شامل تھے۔یہی لوگ جب ایک قدم آگے بڑھے تو حکومتوں کی ناک کا بال قرار پائے۔ایوب خانی مارشل لا بھی ایک بیوروکریٹ کے مشورہ پر لگایا گیا تھا۔

یہ بیوروکریسی انگریزوں کے زمانے کی طرح خود کو عوام سے بالا کوئی ہستی سمجھتی تھی۔کہنے کو ملک ''اسلام'' کے نام پر بنا تھا لیکن اُونچے درجے میں شراب،کباب اور رقص و موسیقی کی مخلوط محفلیں عام بات تھیں۔اکثر سربراہ مملکت بھی کم از کم شراب کے رسیا تو تھے ہی۔آج پاکستان میں بہت سے سیاسی رہنماؤں کو پیغمبروں کا درجہ دے دیا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ رحمت اللہ علیہ صاحبان اقتدار بھی دختر رز کے عاشق تھے۔

لوگ ایک بڑے تجربے سے گزر رہے تھے۔اُن کی عزتیں،مال،جانیں پاکستان کے تجربے کی نذر ہوئی تھیں۔وہ صدیوں کے ہنستے بستے گھر اُجڑتے دیکھ کر پاکستان پہنچے تھے۔مسلم لیگ کی دوسری درجے کی وہ قیادت جو لوگوں کو اللہ رسول کے نام پر جمع کر کے اُن سے تکبیری نعرے لگوایا کرتی تھی،کہیں غائب ہو چکی تھی۔تحریک پاکستان کے بنگالی لیڈروں نے تو بہاری مہاجروں سے صاف کہہ دیا تھا کہ اُنہیں پاکستان نہیں آنا چاہئے تھا اور یہ کہ اُنہیں واپس چلے جانا چاہئے۔افراتفری کے اس ماحول میں نالائق نوکر شاہی نے شروع ہی سے عوام کے ذرا سے بھی احتجاج سے اُنہی طریقوں سے نمٹنا شروع کر دیا جو انگریزوں کا وتیرہ تھا۔چنانچہ شوکی شٹو ڈنٹ جیسے لوگ جب بھی زبان کھولتے،پکڑ کر حوالات میں ٹھونس دیئے جاتے۔شوکی انگریزوں کے زمانے سے جیل آیا جایا کرتا تھا۔اُس کا خیال تھا کہ اب جبکہ ''اپنے'' لوگوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی،اُس کی زبان بندی سے پہرے بھی ہٹ چکے ہیں،لیکن ایسا نہ ہو سکا۔اُس نے کسی جگہ کھڑے ہو کر حکومتی کرپشن اور بدعنوان افسروں کے خلاف تقریر کر دی اور اُسی رات گرفتار کر لیا گیا۔

راج سنگھ اپنے مقدمے کی سماعت کے انتظار میں جیل میں تھا۔میں،ضامن بھائی اور حنیفا اُس سے ملنے دو مرتبہ ہی جیل گئے۔حنیفا پہلوان اُس بکواس سے واقف تھا جو راج سنگھ کی بیوی لاڈو اور اُس کے تعلق سے محلے میں کی جا رہی تھی لیکن اُس نے راج سنگھ کو اس بارے میں ایک لفظ نہیں بتایا۔میں دیکھا وہ اندر سے پریشان ضرور تھا۔وہ راج سنگھ کی بیوی کو اپنی بہن اور اُس کی اولادوں کو سگے رشتوں کی جگہ دیتا تھا۔

یہ بات درست تھی کہ اُس نے کبھی شادی نہیں کی تھی لیکن اُس کی ذات کم از کم اُس کی جنسی زندگی کے حوالے سے بے عیب تھی۔مجھے اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ اُس کے اور لاڈو کے ناجائز تعلقات کی کہانی پر محلے کے کسی شخص نے یہ بات پھیلانے والے کو کوئی سخت جواب نہیں دیا۔بہت بعد میں میں نے سوچا تو میری سمجھ میں آیا کہ برصغیر کے لوگ جنس کی کمیابی کی وجہ سے ایک مخصوص ترسی ہوئی ذہنیت کے حامل ہیں جنہیں لذت کے حصول کے اسی ذریعے میں اپنی محرومی کا کچھ نہ کچھ ازالہ دکھائی دیتا ہے۔وہ نہ صرف ایسی باتیں بخوشی سن لیتے ہیں بلکہ جب انہیں آگے بڑھاتے ہیں تو اپنی کچلی ہوئی خواہشات کے تھوک میں لتھڑے ہوئے بلبلے بھی آگے چھوڑتے جاتے ہیں۔حنیفا پہلوان بہت پریشان تھا۔ایک رات جبکہ میں

ضامن بھائی کی بیٹھک میں بیٹھا ہوا تھا، ہمارے پاس آیا اور بولا۔

''یار ضامن۔اب کیا ہوگا؟ راج سنگھ جب جیل سے آکر یہ شٹوریاں سنے گا تو اُس کے دل پر کیا گزرے گی؟'' سوال بجا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ جب سے یہ کہانی عام ہوئی تھی، حنیفا پہلوان سارا دن گھر سے غائب رہتا تھا اور رات اپنے گھر کے دروازے کے عین سامنے، گلی میں سو کر گزارتا تھا۔ اُس نے اس مقصد کے لیے کھرے بان کی ایک چارپائی پہلے ہی پیپل کے درخت سے باندھ کر رکھی چھوڑی تھی۔ باندھی اس لیے تھی کہ کوئی اُچکا اُسے نہ اُٹھا لے جائے۔ اُس بیچارے کے اس کام کو بھی اہل محلّہ اور بطور خاص مخالف پارٹی نے ایک چال سمجھا اور ایک دن جانی نائی نے مجھے بتایا۔

''یہ جو حنیفا پہلوان گھر سے باہر رہنے کا ڈرامہ کر رہا ہے۔ یہ سب جانتے ہیں۔ فیکا چوکیدار بتا رہا تھا کہ جیسے ہی رات گہری ہوتی ہے، حنیفا چارپائی سے غائب ہو جاتا ہے۔ اب یہ بات تو بچہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ وہ اُس ٹیم پر کدھر ہوتا ہوگا؟'' میں نے سختی سے جانی نائی سے کہا تھا کہ وہ اس بکواس کو اپنے تک محدود رکھے اور گو مجھے اس کا یقین تو نہیں تھا لیکن اُس نے بہر حال وعدہ ایسا کرنے کا ہی کیا تھا۔

حنیفا آج زیادہ پریشان یوں تھا کہ اب اُس کا نام محض لاڈو تک ہی محدود نہیں رہا تھا بلکہ اس میں پریتو بھی شامل ہوگئی تھی۔ ضامن بھائی نے پان کی پیک گلی میں تھوکی، منہ کرتے کی آستین سے پونچھا اور بیٹھ کر بولے۔

''تُو اپنا جی مفت میں کیوں جلا رہا ہے سالے؟ ہم جانتے ہیں تُو کِتا اچھا آدمی ہے؟''

لیکن محض ضامن بھائی کے جاننے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ لوگ اس بات کو کسی اور طرح سے بھی لے رہے تھے۔ ابھی چند روز پہلے میں نے جانی نائی کی دکان پر اخبار پڑھتے ہوئے محلے کے دو آدمیوں کی باتیں سنی تھیں جو حنیفے پہلوان کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ اُس نے جو کیا اچھا کیا، ان سکھوں نے فسادات کے دوران مسلمان عورتوں سے جو سلوک کیا تھا، حنیفا اب اس کا حساب چکا رہا تھا۔ یہ سوچ بڑی خوفناک تھی۔ حنیفے نے جو راج سنگھ اور اُس کے خاندان کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی تھی تو اس کے پیچھے خلوص کے سوا اور کوئی جذبہ نہیں تھا۔ مجھے اس بات کی فکر تھی کہ اگر راج سنگھ لوگوں کی باتوں میں آ گیا تو کیا ہوگا؟ حنیفے نے دکھ سے کہا۔ ''یار میں راجو کی بیوی کو اپنی بھین اور اُس کی بیٹی کو اپنی بیٹی سمجھتا ہوں تو یہ دلے میرے ''برخلاف'' کیوں ایسی باتیں کر رہے ہیں؟'' سب جانتے تھے کہ راج سنگھ کی حنیفے پہلوان سے دوستی کچھ لوگوں کو کیوں بری لگ رہی تھی۔ حنیفا پہلوان تھا، اب بھی اپنے اکھاڑے میں خود اور شاگردوں کو زور کراتا تھا، اُس کی شہر میں عزت تھی اور اُس کے ایک اشارے پر اُس کے شاگرد اُس کے مخالفین کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتے تھے لیکن وہ نرا پہلوان ہی نہیں تھا۔ اُس میں اتنی فہم بھی تھی کہ ایک سکھ کے معاملے کو اُچھالنے کا مقصد شہر میں کسی قسم کے فساد

کو جنم دینے کے مترادف بھی ہو سکتا تھا کیونکہ مشرقی پنجاب کے خونین فسادات کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور اُن سے متاثرہ لوگوں کی کثیر تعداد نہ صرف اس گلی بلکہ شہر میں بھی رہتی تھی۔ ضامن بھائی نے سگریٹ کی ڈبیہ نکالی تو خلاف توقع حنیفے پہلوان نے سگریٹ مانگا۔

''ایک مجھے بھی دے یار۔'' یہ بات میرے اور ضامن بھائی دونوں کے لئے باعث حیرت تھی کیونکہ حنیفا پہلوان سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ تھا کہ وہ چائے تک نہیں پیتا تھا۔ ضامن بھائی نے حسب عادت سگریٹ توڑا اور آدھا حصہ حنیفے کو دیتے ہوئے بولے۔

''تم کب سے وِس منحوس شے سے دل لگانے لگے پہلوان؟'' وہ حنیفے کا سگریٹ سلگا چکے تو حنیفے نے ایک گہرا کش لیا اور بولا۔

''جب دماغ پر 'ٹیمشن' چڑھ جاتی ہے تو پی لیتا ہوں۔'' اُس کے پہلوانی کشوں نے سگریٹ کا ٹکڑا آناً فاناً ختم کر دیا جسے اُس نے گلی میں پھینکا اور بولا۔

''یار راجو کا جیل سے باہر آنا بہت ضروری ہے ورنہ یہ ماں یاوے محلے والے مجھے طعنے دے دے کر مار دیں گے۔ لاڈو بھابی کو یہ ساری حرام توپی پتہ ہے جو یہ ججی وغیرہ کر رہے ہیں مگر وہ اس پر ہنستی ہے اور مجھ سے کہتی ہے کہ جب تیرا اور میرا رب جانتا ہے کہ ہمارا کیا رشتہ ہے تو اتنی ٹیمشن لینے کی کیا ضرورت ہے؟''

یہ بات مجھے اچھی لگی۔ حنیفے نے تب ہمیں بتایا کہ لاڈو چاہتی تھی کہ اُس کی بیٹی پریتو کا داخلہ کسی سکول میں ہو جاتا کیونکہ وہ اُسے ہر صورت میٹرک پاس کروانا چاہتی تھی۔ یہ خواہش راج سنگھ کی بھی تھی اور وہ اس کا اظہار ہمارے سامنے متعدد بار کر چکا تھا۔ ضامن بھائی مسکرائے اور بولے۔

''دیکھو بھیا۔ اسکول وسکول کا تو ہمیں پتہ نئیں مگر ہمارا اور تمہارا یار راج سنگھ جیل سے باہر بھی دکھائی دے گا اور وِس کو اپنا گھر بھی مل جائے گا چاہے وہ تاری بدمعاش اور ججی گڈیوں والا کِتا ہی زور مار لیں۔'' میں نے حیرت سے اُنہیں دیکھا تو بولے۔

''بس تم دیکھتے رہو کان لپیٹ کے۔'' یہ بات کہہ کر اُنہوں نے سگریٹ کا بقیہ ٹکڑا سلگایا اور مجھے آنکھ مار کر مزے سے کش لگانے لگے۔

راج سنگھ اپنی بیٹی کی تعلیم ہر صورت مکمل کروانا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ اُسے میٹرک میں داخلہ مل جاتا لیکن اب تک ہر طرف سے انکار ہی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اُس کی اس سلسلے میں صرف ایک ہی شخص مدد کر سکتا تھا اور وہ شوکی شٹو ڈنٹ تھا مگر وہ ان دنوں جیل میں تھا۔ حکومت نے اُسے ملک کے خلاف تقریر کرنے کے الزام میں اُس کے دو چار ساتھیوں سمیت گرفتار کر رکھا تھا۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ شوکی

انگریز کے دَور میں بھی جیل جا چکا تھا، وہ اُس دَور میں انگریز کی حکومت کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا۔

انگریز کے خلاف تقریریں کرنا تو سمجھ میں آتا تھا لیکن اپنی حکومت کے خلاف تقریر کر کے جیل جانا میری سمجھ سے باہر تھا۔ اُس روز میں شوکی کے گھر کی بیٹھک کے قریب سے گزر رہا تھا۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ شوکی جیل سے واپس آ چکا تھا۔ اُس نے مجھے آواز دی اور میں اُس کی بیٹھک میں چلا گیا۔ شوکی وہاں اکیلا نہیں تھا۔ اُس کے ساتھ اُسی جیسے لمبے بالوں اور قدرے بڑھی ہوئی داڑھی والا ایک اور جوان آدمی بھی بیٹھا تھا۔

''ارے آپ کب آئے شوکی بھائی؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ شوکی مسکرایا اور بولا۔

''ہمارا آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہے۔ تم سناؤ اس منحوس محلے میں کیا ہوتا رہا میری غیر موجودگی میں؟'' وہ غالباً حنیفے پہلوان اور راج سنگھ کی بیوی کے حوالے سے پھیلی افواہوں کی تصدیق کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے احسن کی وجہ سے یہ بات تو سرسری لیکن اُس کی بیٹی کا کسی سکول میں داخلہ ذرا مفصل بیان کیا۔ شوکی کو یہ سن کر بہت غصہ آیا اور وہ تنک کر بولا۔

''اسی لیے ہر وہ آدمی جس نے مذہب کی عینک سے چیزوں کو نہیں دیکھا تھا، تمہارے اس پاکستان کے خلاف تھا۔ ان مسلمانوں نے کون سے اسلام کا نفاذ کرنے کو یہ پاکستان بنایا تھا؟ شیعوں کا، سنیوں کا، بریلویوں کا یا دیوبندیوں کا؟ تم یہاں کوئی ایک اسلام نافذ کر دو۔ باقی فرقوں والے اس ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔''

میرا اُس زمانے میں اسلام کا مطالعہ تھا اور نہ ہی مجھے اس کے علاوہ اور کچھ پتہ تھا کہ یہ ملک پاکستان اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے بنایا گیا تھا۔ میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اگر واقعی ہمیں اسلامی نظام قائم کرنا ہی پڑ جاتا تو ہم کون سا نظام نافذ کرتے کیونکہ بنیادی اسلامی احکامات اور تعلیمات پر عمل درامد تک کے سلسلے میں مسلمان حضرات ایک دوسرے سے بعد المشرقین کا فاصلہ رکھتے ہیں۔ مجھے یہ بات بری لگی تو شوکی نے میرے چہرے کے تاثرات پڑھ کر کہا۔

''دیکھو میں کسی مذہب میں یقین نہیں رکھتا اور اس کا ڈنکے کی چوٹ اظہار بھی کرتا ہوں۔ تمہیں پتہ ہے ابھی تک میری شادی کیوں نہیں ہوئی حالانکہ میری ماں کی یہ شدید خواہش ہے؟ مجھے شہر بھر میں کوئی لڑکی دینے کو تیار نہیں ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں اس طرح چند اور کافر دنیا میں آ جائیں گے۔ کیوں احسن بھائی؟''

ایسے مجھے پتہ چلا کہ شوکی کے ساتھی کا نام احسن تھا اور یہ بھی کہ وہ حیدر آباد دکن سے پاکستان آیا تھا۔ اُسے ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ ایک انتہائی متمول گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور اُس کے گھر والے اُسے اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ بھجوانا چاہتے تھے مگر احسن کے دماغ میں شوکی کی طرح، انسانوں کی 'خدمت' کا خناس بھرا ہوا تھا چنانچہ وہ پاکستان آ گیا تھا اور کسی ایسی سیاسی جماعت میں شامل ہو گیا تھا جس

میں اُس جیسے چند سر پھرے اور تھے۔ احسن دھیمے لہجے میں بات کرتا تھا اور اُسے شوکی کی طرح بات بات پہ غصہ نہیں آتا تھا۔ اُس نے کہا۔

''تم اس بات کی فکر مت کرو۔ اُس کی بچی کا داخلہ ہم کروا دیں گے کسی اچھے سکول میں۔''

میرے لیے یہ ایک اچھی خبر تھی۔ میں نے شکریہ ادا کیا تو احسن نے مسکرا کر کہا۔

''اس میں شکریئے والی کونسی بات ہے؟ میں ایک کرسچین سکول کے پرنسپل کے نام رقعہ دے دیتا ہوں۔'' رقعے والی بات مجھے عجیب لگی۔ اگر احسن واقعی میری مدد کرنا چاہتا تھا تو اُسے خود چل کر پرنسپل کے پاس جانا چاہئے تھا۔ وہ بلا کا قیافہ شناس تھا۔ اُس نے میرا سوال میری آنکھوں میں پڑھ لیا تھا، چنانچہ وہ مسکرایا اور بولا۔

''میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہے ہو؟ مگر یار بات دراصل یہ ہے کہ میں اُن سوروں کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا۔ تم جانتے ہو نا میں کن کی بات کر رہا ہوں؟''

میں جانتا تھا۔

میں نے ساری بات ضامن بھائی کو اُسی شام بتا دی۔ ہم دلاور کے ہوٹل میں عین نالی کے اُوپر پڑی ایک بنچ پر بیٹھے چائے پی رہے تھے اور ضامن بھائی نے ابھی ابھی سگریٹ نوشی کے میری صحت پر ممکنہ نقصانات پر قدرے طویل لیکچر دے کر کپتان کا سگریٹ سلگایا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا، ضامن بھائی جیسے جیسے سستے سے مہنگے سگریٹوں پر آ رہے تھے، اُن کے تمباکو نوشی کے حوالے سے لیکچروں میں شدت اور طوالت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ ویسے تو ضامن بھائی شوکی کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن یہ بات اُنہیں اچھی لگی اور وہ ایک پہلا طویل کش لے کر بولے۔

''میرے خیال میں یہ لمڈا اتنا برا بھی نہیں ہے۔ بات سولہ آنے کرتا ہے۔ ارے ہوگا سالا کچھ بھی۔ راج سنگھ کی لمڈیا کا داخلہ ہو جائے کسی طرح۔'' وہ سگریٹ پیتے ہوئے کچھ دیر سوچتے رہے پھر مسکرا کر بولے۔

''اپنے گھر والا مقدمہ بھی وہ جیت جائے گا مگر یار جج اپنی ماں کا خصم ہے۔ تمہیں پتہ وہ سامنے والی پالٹی سے مال کھانے کی بات کر رہا ہے؟''

یہ میرے لیے اطلاع تھی۔ میں نے حیرت سے کہا۔

''جج رشوت کھا رہا ہے؟ کیا بات کر رہے ہیں ضامن بھائی؟'' آزادی سے پہلے رشوت کی حد زیادہ سے زیادہ تھانیدار پر آ کر ختم ہو جاتی تھی، لیکن جج؟ یہ بات تو میرے تصور میں بھی نہیں تھی۔ ضامن بھائی مسکرائے اور بولے۔

''اماں اتے بھولے مت بنو۔ آج تمہاری شادی کر دیں تو سال بھر میں ہم تایا کہلائیں۔ تمہیں

نہیں پتہ یہاں کیا کیا ہو رہا ہے تمہارے وِس پاکستان کے اندر؟ گنگا بہہ رئی ہے پیارے۔ جو چاہتا ہے جی بھر کے ہاتھ دھوتا ہے۔ ہاں جج نے دو ہزار مانگے ہیں رشوت کے وِس جالندھر والے سے۔''

دو ہزار اُس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی کیونکہ آٹا روپے کا سات سیر ملتا تھا اور اصلی گھی ڈیڑھ روپے کا۔ میرے ماموں نے نئی ہرکولیس سائیکل ابھی پچھلے مہینے فقط ستر روپے میں خریدی تھی۔ میں نے کہا۔

''مگر دو ہزار تو بہت بڑی رقم ہے۔ کیا وہ لوگ دے دیں گے؟ وہ بیچارہ تو سائیکل پنکچر مرمت کا کام کرتا ہے۔ دس بارہ لوگ گھر کے کھانے والے ہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' ضامن بھائی نے باقی ماندہ سگریٹ سلگایا اور اس مرتبہ مجھے تمباکو نوشی کے نقصانات پر لیکچر دینے کی ضرورت محسوس کیے بغیر بولے۔

''سچی بات کہوں تو مجھے اُس سے ہمدردی ہے مگر وِس سے بھی سچی بات یہ ہے کہ وہ گھر راج سنگھ کا ہی ہے۔'' میں اب دوراہے پہ کھڑا تھا۔ یہ سچ تھا کہ وہ گھر راج سنگھ کا تھا اور یہ بھی سچ تھا کہ اُس میں مشرقی پنجاب کے جو لٹے پٹے لوگ رہتے تھے، وہ راج سنگھ کے مقدمہ جیتنے کی صورت میں بے گھر ہو جاتے اور مجھے یہ قطعاً گوارا نہیں تھا۔ میں نے کہا۔

''تو پھر اس مسئلے کا کیا حل ہوسکتا ہے؟'' ضامن بھائی مسکرائے اور بولے۔

''ٹھیکیدار فتح خان کے گھر سے جو تیسرا گھر ہے۔ ابے وئی جس کو پھونک دیا تھا سالوں نے۔ وِس میں تالہ پڑا وا ہے۔ صرف دو کمرے جلے ہیں نیچے کے۔ باقی سلامت ہے۔ جالندھر والوں کو وہ الاٹ ہوسکتا ہے۔ وِن کے سِر پہ بھی چھت رہ جائے گی اور سالا راج سنگھ بھی اپنی جوزہ محترمہ کے ساتھ بھاگ بھاگ کے آنکھ مچولی کھیلے گا اپنے پرانے گھر میں۔'' آنکھ مچولی پہ اُنہوں نے آنکھ ماری اور ہنس کے بولے۔

''مگر وِس میں ایک ٹنٹا ہے ابھی۔'' میں جانتا تھا کیا ٹنٹا تھا۔ وہ گھر مولوی شاکر اللہ اپنے کسی ایسے رشتے دار کو الاٹ کروانے کی کوشش کر رہے تھے جسے ملتان میں پہلے ہی سے ایک گھر الاٹ ہو چکا تھا اور وہ شہر تبدیل کرنا چاہ رہا تھا۔ مولوی صاحب ہر جمعے کی نماز سے پہلے کی تقریر میں یتیموں کے حقوق پر طویل تقریر کر کے اپنے اس رشتے دار کے حق میں زمین ہموار کیا کرتے تھے۔ یہ بات درست تھی کہ وہ شخص یتیم تھا لیکن میں پوری ایمانداری سے سمجھتا تھا کہ پینتالیس پچاس برس کی عمر کو پہنچنے والے اکثر حضرات یتیم ہو جاتے ہیں اور اُن کو اس ذیل میں رکھ کر اُن سے ہمدردی کرنا کسی طور روا نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے کہا۔

''لیکن پہلے یہ معاملہ تو طے ہو جائے کہ راج سنگھ کو اُس کا گھر واپس بھی ملے گا؟''

ضامن بھائی نے اِدھر اُدھر دیکھا حالانکہ اس کی کوئی ضرورت اس لئے بھی نہیں تھی کہ ہوٹل کے گراموفون پر پوری آواز میں مورے پیا گئے رنگون والا گیت چل رہا تھا۔ پھر وہ قدرے آگے جھکے اور بولے۔

''دیکھو صِرف تم سے کے رہا ہوں۔ اگر یہ بات کسی اور کے سامنے کری تو روز قیامت والے دن کالے منہ سے اُٹھو گے۔ وِس بات کو یاد رکھنا۔'' میں فکرمند ہو گیا کہ نجانے ضامن بھائی مجھ سے کیا بات کرنے والے تھے کہ وہ کسی وعدہ خلافی کی صورت میں مجھے یوم حشر میرے انجام سے آگاہ کر رہے تھے۔ میں نے کہا۔

''تم فکر مت کرو۔ کسی نے نہیں کہوں گا۔'' وہ مسکرا کر بولے۔

''وہ جج سالا فیصلہ کرنے کے دو مانگ رہا ہے نا؟ میں ڈھائی لیے پھر رہا ہوں جیب میں۔ رات کو میری وِس حرام خور سے ملاقات طے ہے۔ میں نے آج وِس کے منشی سے ملاقات کری تھی۔ تم سمجھو گھر راج سنگھ کو مل گیا۔ مگر دیکھو کہے دے رہا ہوں۔ اگر یہ بات میں نے کسی اور سے سنی تو پھر میں نے بتا دیا ہے تمہیں تمہارا انجام۔ اور دنیا میں بھی تمہیں بھیک نہ نصیب ہو۔'' پھر اُنہوں نے اپنے ایک دہلوی رشتے دار کا قصہ سنایا جو اسی صورتحال سے گزر رہا تھا جس سے اس وقت مجھے ضامن بھائی گزار رہے تھے اور جو ایفائے عہد نہ کر سکا، نخچتاً دلی کی گلیوں میں اندھا ہو کے بھیک مانگتا مر گیا تھا۔ ضامن بھائی یہ قصہ نہ بھی سناتے تو بھی میں کسی سے اس بات کا ذکر نہ کرتا۔ جب ضامن بھائی نے مسکرا کے اپنی جیب تھپتھپائی اور مسکرائے تو میرا جی چاہا اُن کا منہ اُن کی مضحکہ خیز مونچھوں کی پروا کیے بغیر چوم لوں۔

اس بات پر ابھی چند برس ہی گزرے تھے جب مغربی پنجاب سے دلی پہنچنے والے سکھوں کے جتھوں میں سے ایک نے ضامن بھائی کے آدھے خاندان کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ اُسی قبیلے کے ایک فرد کی اتنی خاموشی سے مدد کر کے اُسے اُس کا حق دلوانا چاہ رہے تھے کہ یہ راز کسی سے کہنے کی صورت میں مجھے آخرت میں پیش آنے والے واقعات سے قبل از وقت آگاہ بھی کر رہے تھے۔ میں سوچا کاش تقسیم سے پہلے مہا سبھا جیسی ہندو تنظیمیں پیدا نہ ہوئی ہوتیں اور اپنے رام راجیہ کے ناممکن منصوبوں سے مسلمانوں کو خوفزدہ نہ کرتیں تو دونوں طرف کے لاکھوں لوگ اُجڑتے اور نہ ہی بے گھر ہوتے لیکن اب یہ سب سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کانگریس میں اِکا دُکا لوگ تھے جو تقسیم کے بعد کے حالات کو دیکھ سکتے تھے لیکن مسلم لیگ کے پاس صرف وہ نعرے تھے جن پر اعتبار کرنے والے آج تک رو رہے ہیں۔ قوموں کی زندگیاں محض مذہب ہی سے جڑی ہوئی نہیں ہوتیں، اس کے علاوہ بھی بہت سے عوامل ہوتے ہیں لیکن اُنہیں کسی نے نہ سوچا اور صدیوں کا جما جمایا کلچر ٹوٹا تو وہ روایات بھی ٹوٹ گئیں جن سے کوئی معاشرہ خوبصورت ہوتا ہے۔ یہ روایات پاکستان کے نعرے کے ساتھ ہی ٹوٹیں اور کبھی انگریزوں کے خلاف شانہ بشانہ جدوجہد کرنے والوں نے یکدم ہی دانت نکوسے، خنجر نکالے اور اپنے ہی لوگوں پر ٹوٹ پڑے۔ میں تقسیم سے پہلے متحدہ ہندوستان میں جن حالات سے گزرا تھا وہ ایک روز میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔ دونوں طرف کے احمق اس کے لیے برسوں سے زمین ہموار کر

رہے تھے۔سوال پاکستان کے قیام کا نہیں تھا،سوال اُس تہذیب کے شاندار ستونوں کے انہدام کا تھا جس نے اپنے ساتھ اور چیزوں کے ساتھ ساتھ مذہبی اقدار کو بھی ملیا میٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ پاکستان کے قیام سے سب سے زیادہ جنہیں نقصان ہوا وہ مسلمان تھے۔وہ لٹے، اُجڑے، برباد ہوئے اور تقسیم بھی۔وہ تین ملکوں میں رہتے ہیں۔دو میں اُن کی حکومتیں ہیں لیکن پاکستان بننے کی صورت میں اسلامی نشاۃ ثانیہ والے ڈھکوسلے کی حقیقت سب کے سامنے آ چکی ہے۔ ہندوستان کا مسلمان پاکستان بننے کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔ پاکستان کا مسلمان تلواروں کی چھاؤں میں نمازیں پڑھتا ہے اور بنگلہ دیشی مسلمان کشتیوں میں سمندروں میں بھٹک رہا ہے کہ کسی جگہ اور کچھ نہ سہی، ایک مٹھی چاول سے پیٹ بھرنے کا سہارا ہی ہو جائے۔دو ملک ایٹمی اسلحہ بغلوں میں دبائے ایک دوسرے کی سرحدوں پر بیٹھے ایک دوسرے کو گھور رہے ہیں۔منٹو نے کتنی سچی بات کی تھی کہ ہندو چاہیں بھی تو مسلمانوں کو ختم نہیں کر سکتے اور ایسا ہی مسلمانوں کی خواہش کے باوجود نہیں ہو سکتا۔آزادی مل گئی، ہندوستان آزاد ہو گیا، پاکستان بنتے ہی آزاد ہو گیا تھا لیکن دونوں طرف کا انسان غلام ہو گیا۔

تیسرے دن راج عدالت نے راج سنگھ کے حق میں فیصلہ دے دیا اور فیصلے میں یہ بھی لکھ دیا کہ اگر مخالف پارٹی ایک ہفتے کے اندر گھر نہ خالی کرے تو عدالت کو مطلع کیا جائے تا کہ ان احکامات پر سرکاری طور پر عملدرامد کروایا جا سکے۔ محلے میں اس فیصلے پر ملا جلا ردعمل تھا۔ جالندھری مہاجرین سے ہر کسی کو ہمدردی تھی۔ فیصلے کی نقل ملنے کے بعد وہ بے حد پریشان تھے۔ چنانچہ شوکی کی بیٹھک میں اُن کے سربراہ خاندان کو بلوا کر اُسے اُس گھر میں رہنے کو تیار کر لیا گیا جو ضامن بھائی نے تجویز کیا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس تجویز پر وہ شخص کِھل اُٹھا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس گھر کی بیٹھک کا دروازہ بڑی سڑک پر کھلتا تھا اور وہ اپنی سائیکلوں والی دکان اُس بیٹھک میں بنا سکتا تھا اور دس روپے مہینے کی وہ بچت کر سکتا تھا جو اُسے اس وقت کرائے کی مد میں ادا کرنا پڑ رہے تھے۔مگر مولوی شاکر اللہ سد راہ بنے ہوئے تھے۔ یہ خبر مجھے ضامن بھائی نے دی کہ مولوی شاکر اللہ نے عدالت کا یہ فیصلہ ٹھنڈے پیٹوں قبول نہیں کیا تھا۔ میں اُس روز محلے میں نہیں تھا جس جمعے مولوی صاحب نے مسجد میں تقریر کی تھی۔ اُنہوں نے بات بہت گھما پھرا کر کی تھی لیکن سمجھنے والے سمجھ گئے تھے کہ وہ کیا کہنا چاہ رہے تھے۔مولوی صاحب نے کہا تھا کہ ایمان والو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تمہاری پاک سرزمین کے پاک لوگوں کے پاک محلے میں ایک پلید کافر ڈنکے کی چوٹ ناپاکی پھیلانے کو پھر سے آ گیا ہے اور تمہاری ایمانی غیرت وحمیت سوئی پڑی ہے؟ ضامن بھائی نے کہا۔

''مجھے لگ ریا ہے کہ مولوی صاب کوئی بہت بڑا طوفان کھڑا کرنے والے ہیں راج سنگھ کے خلاف اور میں کہے دے ریا ہوں کہ اگر اِس دفعے اُنہوں نے ایسا کچھ کرا تو میں خاموش نئیں رہنے کا۔''

مولوی صاحب ایک مرتبہ پہلے بھی محلے میں بریلوی دیوبندی جھگڑا کروانے میں کامیاب رہے تھے اور ضامن بھائی کا اشارہ اُسی واقعے کی طرف تھا۔مولوی صاحب خود بریلوی تھے اور غالباً بریلی سے ہی آ کر اس محلے میں آباد ہوئے تھے۔تین گلیاں چھوڑ کر دیوبندیوں کی ایک مسجد تھی۔لوگوں میں پاکستان بننے کی وجہ سے نیا نیا اسلامی جوش ایک بار پھر لہریں لینے لگا تھا تو بریلویوں کی مسجد میں ٹھیکیدار فتح خان نے لاؤڈ سپیکر لگوا دیا تھا۔اُس زمانے میں خال خال مسجدوں میں لاؤڈ سپیکر ہوا کرتے تھے۔مولانا نے بقول ضامن بھائی کے اس لاؤڈ سپیکر کا استعمال ''چھنال جوروں'' کے منہ کی طرح کرنا شروع کر دیا تھا اور اذان کے علاوہ بھی اس پہ محلے کے لونڈے چڑھے فلمی طرزوں پر نعتیں پڑھنے لگے تھے۔ یہ وقت دیوبندیوں کی مسجد میں درس وتدریس کا ہوتا تھا اور بریلویوں کی مسجد سے اُٹھتا شور اس میں خلل ڈالتا تھا چنانچہ ایک دو مرتبہ منہ زبانی سمجھانے کا اثر نہ ہونے پر دیوبندی ایک دن لاٹھیاں لیے آ گئے اور محلے میں خاصی بدمزگی پیدا ہوئی۔سوال اپنے اپنے عقیدے کا تھا چنانچہ دونوں طرف کے اصحاب ایک دوسرے کے سر کھولنے پر مصر تھے۔ پھر کچھ لوگوں نے بیچ میں پڑ کر یہ فیصلہ کروایا کہ لاؤڈ سپیکر ضرور استعمال ہو گا لیکن بے محابا نہیں۔ میں نے ضامن بھائی سے پوچھا۔

''مان لیا مولوی صاحب لوگوں کے دلوں میں راج سنگھ کے خلاف نفرت پیدا کرنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو کیا وہ یہ گھر خالی کر دے گا؟ جھگڑا ہی سارا اس گھر کا ہے؟'' ضامن بھائی ہنس کے بولے۔

''یہ جو تمہارے پنجاب میں سالے فسادات ہوئے تھے۔ان کی حقیقت تو اب کھلی ہے لوگوں پہ۔ یہ سب زمین جائیداد کا جھگڑا تھا۔ جیسے ہی سالوں کو پتہ چلا کہ اب ہندوستان کے دو ٹکڑے ہونے والے ہیں۔ وِنہوں نے ہندوؤں سکھوں کو مارنا کاٹنا شروع کر دیا اور وہ بھاگنے لگے تو وِن کی زمینوں جائیدادوں پر قبضے شروع کر دیئے۔ پاکستان بن جاتا اور ہندو سکھ یہاں رہ بھی جاتے تو وِن سالوں کا اسلام کون سے خطرے میں تھا؟ بھیا سچی بات تو یہ ہے یہ سالے مسلمان بھی کسی سے پیچھے نئیں تھے۔ ہندو سکھ اُدھر یہی کام کرر ہے تھے اور مسلمان اِدھر۔تبھی تو میں کہتا ہوں کہ حرامی ہونے کے لئے مذہب کی قید نئیں ہوتی۔''

میں جانتا تھا کہ ایسا ہی تھا۔ایسا نہ ہوتا تو میری محبوبہ کے والدین کو قتل کر کے اُس کے گھر کو پھونکنے کا اور کیا مقصد ہو سکتا تھا؟ کلثوم کے خاوند اور بچوں کو دلی میں قتل کرنے اور سرہ راہ اُس کی عصمت کے پرخچے اُڑانے کے پیچھے اور کون سے عوامل کارفرما ہو سکتے تھے۔اور ایسے میں اگر جوان خوبصورت عورتیں اور لڑکیاں مفت میں ہاتھ آ رہی ہوں تو مذہب تو دُور کی بات ہے، لوگ خدا تک کو بھول جاتے ہیں۔ میں خیالات سے چونکا تو ضامن بھائی کہہ رہے تھے۔

''اماں تم ان مولویوں پنڈتوں کو نئیں جانتے؟ ان سالوں کے ہاتھ میں سب سے لمبی اور مضبوط لٹھیا

ہوتی ہے۔ مذہب کی لٹھیا۔ اور بھائی یہ ایسا ہتھیار ہے کہ پڑنے پہ آدمی روسکتا ہے اور نہ ہی شور مچا سکتا ہے۔ سمجھے؟''

میں اُس وقت کچھ بھی نہیں سمجھا۔

اُنہی دنوں ایک مرتبہ جب کہ میں اتوار کی چھٹی کی وجہ سے گھر پر تھا اور گھر کی بیٹھک میں بنائی گئی اپنی چھوٹی سی لائبریری کی جھاڑ پونچھ کر رہا تھا، ضامن بھائی نے گلی میں کھڑے ہو کر مجھے زور سے آواز دی۔ میں باہر نکلا تو اُنہوں نے مجھے گلے لگایا اور اُسی حالت میں بیٹھک کے اندر پہنچ کر بولے۔

''اماں تمہیں کتوں کے بارے میں کچھ معلومات ہیں؟ ہروخت یہ سالی موٹی موٹی کتابیں پڑھتے رہتے ہو۔'' میں کچھ بھی نہیں سمجھا تو وہ چڑ کر بولے۔

''یہ ٹُکر ٹُکر میری صورت کیا تک رئے ہو؟'' میں نے اعتراف کیا کہ میری کتوں کے بارے معلومات تقریباً صفر تھیں۔ مجھے صرف اتنا ہی پتہ تھا کہ کتا اگر کاٹ لے تو پیٹ میں چودہ انجکشن لگوانا پڑتے ہیں اور یہی بات میں نے ضامن بھائی کے گوش گزار بھی کر دی۔ اس پر وہ ایک گہرے طنز کے ساتھ بولے۔

''اماں کسے بتا رئے ہو؟ یہاں دو دفعے خود ایسی جگہ کٹوائے بیٹھے ہیں کہ اگر شرع میں کیسی شرم والی بات کے مخالف نہ ہوتے تو ابھی دکھا دیتے۔'' اس پر میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ کتے اپنے قد سے لمبی ہر چیز کے قریب پہنچ کر ایک ٹانگ اُٹھا کر کچھ ضرور کرتے ہیں اور ہاں کتے کھاتے وقت منہ سے چپڑ چپڑ کی آوازیں بھی نکالتے ہیں۔ یہاں کتوں کے بارے میں میرا دریاؤ علم ختم ہو جاتا تھا۔ ضامن بھائی پھر اُسی تلخ مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

''یہ بھی کوئی نئی بات نئیں کری تم نے۔ سب کو پتہ ہے کہ سالے کتے یہ کام کرتے ہیں اور بہت سے آدمی بھی کرتے ہیں۔ تم نے دیکھا نئیں وہ سالا ٹھیکیدار فتح خان کمر بند کھولے نالی کے کنارے ہی موتتا ہے حالانکہ اُس کے گھر میں تین چار جگہیں وِس کام کے لئے موجود ہیں۔''

میں نے جلدی جلدی سوچا تو سوائے پطرسؔ بخاری والے مضمون کے اور کچھ یاد نہ آیا۔ اگر فیضؔ نے اُس زمانے میں کتوں والی نظم لکھی ہوتی تو شاید میں اُس کا حوالہ بھی دے دیتا۔ اور سوچا تو چند بزرگوں کے اقوال یاد آئے۔ ایک میں ایک بزرگ فقیروں سے مخاطب ہوئے تھے اور اُنہیں نوید دی تھی کہ کتوں کے بھونکنے پر قطعاً مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ اس طرح رزق میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی اور دوسرا کسی شہر کے لوگوں سے گِلے کے حوالے سے تھا کہ کتوں کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں اور پتھروں کو باندھ کر رکھتے ہیں۔ پھر جب میں اُنہیں اماں کے ہاتھ کا بنا ہوا شربت تخم بالنگا پلوا چکا اور وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوئے تو میں نے پوچھا۔

''ضامن بھائی۔ تمہیں اچانک کتوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟'' وہ مسکرائے اور سگریٹ کی ڈبیہ نکال کر اُنہوں نے احتیاط سے سگریٹ توڑ کر اُس کے دو ٹکڑے کئے اور ایک ٹکڑا ڈبیہ میں داشتہ بہ کار آید کے طور پر رکھا اور سگریٹ سلگا کر ایک گہرا کش لیا اور بولے۔

''کل سالا ایک سیٹھ میرے کارخانے پہ کرانچی سے آیا تھا۔ کچھ مال لینا چاہ ریا تھا ہم سے۔ وہ سگریٹ کے چار ٹکڑے کر کے پی ریا تھا۔ تم دو پہ ہی مجھے گھور کے دیکھ رئے ہو؟'' میں نے کہا۔

''میں تو دو ٹکڑے کر کے پینے کے ہی خلاف ہوں۔ لوگ ایسے آدمی کو کنجوس کہتے ہیں۔ ویسے ضامن بھائی جو آدمی سگریٹ کے چار ٹکڑے کر کے پیتا ہے، اُسے دلی میں کیا کہتے ہیں؟'' اس سوال پر اُنہوں نے مجھے چونک کر دیکھا اور ایک کش لگا کر بولے۔

''خبیث کہتے ہیں ایسے جنے کو۔ ابے مجھے کتوں کے بارے میں معلومات چاہئیں۔ بہت ضروری ہیں۔ ایک کام پھنس گیا ہے۔'' جب میں نے تفصیل جاننا چاہی تو بولے۔

''تمہیں بتایا تھا نا اپنے ماموں کے بارے میں؟ وئی جو محلّہ سلطانی میں رہتے ہیں؟ ابے وئی جن کالمڈا اپڑوسن کے اغوا کے کیس میں پکڑا گیا تھا سن پینتالیس میں؟ حالانکہ وہ سسری خود نکل لی تھی وِس کے ساتھ۔ راضی برضا۔ وِس سالی کا یہ دوسرا کیس تھا وِس قسم کا۔''

میں یہ قصہ بھی سن چکا تھا اور اُن کے ماموں سے بھی ایک مرتبہ مل چکا تھا۔ اُس وقت ساٹھ سے اُوپر کے رہے ہوں گے اور اُن کی صحت پر اس لیے بھی رشک کیا جا سکتا تھا کہ اُن کے پاس دوسری جنگ عظیم سے بھی پہلے کی ایک موٹر سائیکل تھی اور سنا تھا کہ اُنہوں نے اسی موٹر سائیکل پر دلی سے لاہور ہجرت کی تھی۔ موٹر سائیکل کا ''سیلف'' کام نہیں کرتا اور نہ ہی وہ ''کک'' سے سٹارٹ ہوتی تھی، چنانچہ ضامن بھائی کے ماموں کوئی پندرہ بیس فٹ تک اُس کی کوئی کل دبا کے اُس کے ساتھ دوڑا کرتے تھے اور پھر جیسے ہی سٹارٹ ہوتی تھی، اُچھل کے اُس پہ بیٹھ جایا کرتے تھے۔ پھر کسی ترکیب سے گھما کر اُسے ضامن بھائی کی ممانی کے قریب روکا کرتے تھے اور اس دوران مسلسل ہدایات دیتے رہتے تھے تاکہ موٹر سائیکل کے چلنے سے پہلے ممانی اُس کی سائیڈ کار میں بیٹھ جائیں۔ ایک دفعہ سٹارٹ ہو جانے پر موٹر سائیکل زیادہ دیر تک ایک جگہ کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ سننے میں یہ بھی آیا تھا کہ ایک دفعہ ممانی مطلوبہ پھرتی کا مظاہرہ نہ کرنے کی وجہ سے سڑک پہ کھڑی رہ گئی تھیں اور ماموں فقط اُن کا برقعہ لیے ہوا ہو گئے تھے۔

''یہ قصہ تم کئی بار سنا چکے ہو۔ وہ کتوں والی کیا بات ہے؟'' ضامن بھائی نے مسکرا کر سگریٹ کا ایک اور کش لیا اور بولے۔

''لمبی بات ہے۔ تمہیں میں نے بتایا تھا نا کہ وہ...... وہ جو راولپنڈی میں رہتی ہیں۔ موٹر سائیکل کا قصہ اُنہی سے جا کر جڑتا ہے۔'' میں خاک بھی نہیں سمجھا تو میں نے کہا۔

''مگر ہم کتوں کی بات کر رہے تھے!'' ضامن بھائی جھنجلا کے بولے۔

''یار پوری بات تو سن لیا کرو۔ وہ ممانی کی دُور کی رشتہ دار ہیں۔ ممانی کا وہاں آنا جانا ہے۔ ممانی چاہتی ہیں کہ میری اُن سے شادی ہو جائے۔ اُن کا وہ بھائی جو اپنی...... بہر حال۔ میں گالی نئیں دوں گا تم خود سمجھ لو کہ میں نے سالے کو دل ہی دل میں کیا کہا ہوگا؟'' لیکن میں اب بھی یہ قصہ باوجود اپنی کوشش کے نہیں سمجھ سکا تھا، چنانچہ میں نے کہا۔

''تم مجھے پاگل کر دو گے ضامن بھائی۔ کتا، موٹر سائیکل اور تمہاری محبوبہ اور پھر ممانی بھی۔ میں حلفیہ کہتا ہوں میں خاک بھی نہیں سمجھا۔'' اس پہ وہ مسکرائے اور ڈبیہ سے سگریٹ نکال کر آدھا توڑا، کچھ سوچا اور آدھا مجھے مرحمت فرما کر بولے۔

''آج عیش کر لو مگر اسے عادت مت بنائیو کہ اِدھر میں نے ڈبیہ نکالی اُدھر تم ٹُکر ٹُکر دیکھنے لگے۔ وِس وخت صِرف اس لیے تمہیں سگریٹ پلوا رہا ہوں کہ وِس سے سونچنے میں مدد ملتی ہے۔ خیر قصہ یوں ہے کہ ممانی چاہتی ہیں کہ وِس موٹر سائیکل کو کسی طرح دریا میں پھینک دیا جائے کیونکہ وِس کی وجہ سے محلے والوں کی نیندیں تو برباد ہوتی ہی ہیں، ماموں محلے بھر میں سرکس والے مشہور ہو رئے ہیں حالانکہ وہ بجلی کے محکمے سے لے ٹِیر ہوئے ہیں اور تفصیل وِس کی کچھ یوں ہے کہ پچھلے ہفتے کوئی اُس موٹر سائیکل کی گدی چرا کے لے گیا اور ماموں بغیر گدی کے اُس پہ شہر بھر میں اُڑے اُڑے پھر رئے ہیں۔'' میں نے اُلجھ کر کہا۔

''لیکن تم کسی کتے کا ذکر کر رہے تھے!'' ہنس کر بولے۔

''ابے ہمارے ماموں کے گھر کے عین سامنے محلے کا ایک کتا بیٹھا کرتا ہے۔ سالا دن بھر تو بھولے رام بنا رہتا ہے مگر سورج غروب ہوتے ہی ہر آنے جانے والے کی ٹانگ لیتا ہے۔ بہت خطرناک صورت ہے وِس کی۔ بالکل جن سنگھی لگتا ہے۔ بہر حال میں نے وہ موٹر سائیکل اُڑانے کا ارادہ جی میں باندھ لیا ہے۔ لیکن اُس کے لیے ضروری ہے کہ اُس کتے کا کوئی بندوبست کرا جائے۔''

''اُڑانے کا یا چرانے کا؟'' اس پہ ضامن بھائی بپھر گئے اور بولے۔

''میاں ہم کوئی رذیل ذلیل نئیں ہیں جو چوریاں کرتے پھریں۔ کسی روز سمجھاؤں گا تمہیں کہ اُڑانے اور چرانے میں کیا فرق ہوتا ہے۔ تمہیں وِس سلسلے میں میری مدد کرنی ہے۔'' میں کانپ گیا کیونکہ میں کتوں سے ہمیشہ سے ڈرتا آیا ہوں۔ میں نے کہا۔

''میں بھلا کیا مدد کر سکتا ہوں ضامن بھائی؟ اور قسم خدا کی مجھے ایسے کاموں کا کوئی تجربہ بھی نہیں ہے۔'' اس پہ ضامن بھائی نے لپک کے میرے ہاتھ سے سگریٹ کا ٹکڑا واپس لے کر غصے میں کش لگا کے آدھا کیا اور تلخی سے بولے۔

''تم پہلے آدمی ہو جس کا منہ میں نے صبح اُٹھ کے دیکھا ہے وِسی لیے سبھی کام اُلٹے پڑ رئے ہیں۔ میاں تمہیں کوئی تجربہ نئیں تو کیا ہمیں ہے؟ کیا ہمارے آبا و اجداد دلی میں ایسے ویسے کام کرتے تھے؟ وِس کتے کا کوئی بندوبست کر دو۔ باقی کام میں خود کر لوں گا۔ ہاں بھئی بیاہ ہمیں کرنا ہے تمہیں نئیں۔ تمہیں کیا ضرورت پڑی ہے؟'' مجھے اُن پہ ترس آ گیا۔ میں نے کہا۔

''اچھا بتاؤ اُس بد بخت کا کرنا کیا ہے؟'' ضامن بھائی کا موڈ یکدم بحال ہو گیا۔ مسکرا کے بولے۔

''یار سونچا یہ ہے کہ سالے کو بے ہوشی کی دوا دے دیں گے۔ ممانی دروازہ کھلا چھوڑ دیں گی۔ میں موٹر سائیکل کو دھکیل کے باہر لے آؤں گا۔ تم یوں سمجھ لو کہ ایک دفعے اُس کتے سے کسی طرح بچ گئے تو باقی کا کام ''مِلٹوں'' میں ہو جائے گا۔'' میں نے کہا۔

''مگر اس سلسلے میں میں کیا کر سکتا ہوں؟'' مسکرا کر بولے۔

''وہ جو لمبے بالوں والا لمڈا تم سے ملنے آتا ہے۔ کیا نام ہے وِس کا؟ ہاں طاہر، اُس کے باپ کی صدر میں دواؤں کی دکان ہے۔ اُس سے کسی ترکیب سے نیند کی دس گولیوں والی شیشی پار کر والو۔ میں گیا تھا دو دفعے۔ مگر اُس کے باپ نے کہا کہ پہلے ڈاکٹر کا 'نخسا' لاؤ۔ پھر میں بھیس بدل کے گیا تو وہ ڈنڈا لے کے میرے پیچھے بھاگا۔ ایک اور دکان پہ کوشش کری تو دکان دار بولا۔ میاں مرنے کا ارادہ ہے تو ریل کی 'پٹلی' پہ لیٹ جاؤ۔ غرض تمہاری شفارش کی ضرورت ہے۔''

میں تھوڑی ہی دیر میں نیند کی دوا کی شیشی لے آیا۔ ہم ضامن بھائی کی بیٹھک میں بیٹھے تھے اور ضامن بھائی دوا کی شیشی کو ہاتھ میں لیے یوں گھما پھرا رہے تھے گویا الٰہ دین کو کھو جانے کے بعد اپنا چراغ پھر سے مل گیا ہو۔ پھر وہ یکدم سنجیدہ ہوئے اور بولے۔

''مگر اب سوال یہ پیدا ہو رہا ہے کہ سالے کو یہ گولییں ٹھنسائیں گے کیسے؟'' میں نے کہا۔

''اس میں کونسی پریشانی والی بات ہے۔ ان گولیوں کو پیس کر ان کا سفوف بنا لیں گے اور کسی کھانے کی چیز میں مِلا کے دے دیں گے۔'' ضامن بھائی اب پہلے سے زیادہ فکرمند دِکھ رہے تھے، بولے۔

''یار ایک بات اور بتاؤ۔ یہ سالے کتے آدمی کی پنڈلی کیوں سونگھتے ہیں؟ ویسے ہی پُوچھ رہا ہوں اپنی معلومات کے لیے۔'' میں نے جل کر کہا۔

''پنڈلی کے اندر موجود ہڈی کا اندازہ کرتے ہوں گے۔ضامن بھائی اب اس قصے کو ختم بھی کرو۔'' ضامن بھائی نے نفی میں سر ہلایا۔

''بھیا تم اسے معمولی کام سمجھ رئے ہو؟ بے ہوش کتے کے اُوپر سے اُلانگھ کے ماموں کے دروازے تک پہنچنا کوئی مزاخ ہے؟ کئی باتیں فرض کرنے کو جی چاہ ریا ہے۔ مان لو وہ سالا بے ہوش نئیں ہوتا اور حرافہ عورتوں کی طرح 'بن' کے چپکا پڑا رہتا ہے؟ مان لو اِتی دیر کو بے ہوش نئیں ہوتا جتی دیر میں، میں موٹر سائیکل کو گھر سے 'لِکال' کے گلی میں آتا ہوں؟ کتی باتیں ہیں سوچنے کو۔'' میں نے جل کر کہا۔

''یہ ایک گولی آدمی کو دس بارہ گھنٹے کو سلا دیتی ہے۔ہم تو دس گولیاں پیس کر دے رہے ہیں اکٹھی۔ قیامت تک نہیں اُٹھے گا۔'' تبھی ضامن بھائی کی انسانی اور ایمانی رگیں بیک وقت پھڑکیں اور وہ زبان باہر نکال کر اور اپنے دونوں کان ایک ساتھ پکڑ کر بولے۔

''ابے تو کیا مر جائے گا؟ نہ بھائی میں خون ناحق کے خلاف ہوں۔بس ایک گولی کافی رئے گی۔سالا قیامت کے روز اگر اللہ میاں کے سامنے میرا گریبان پکڑ کے اینٹھ گیا کہ وِس مونچھوں والے کو دوزخ میں بھیجو کیونکہ وِسی نے مجھے دھوکے سے زہر دیا تھا تو میں کیا کرلوں گا؟ تم تو یہ گے کے صاف چُھٹ جاؤ گے کہ میرا وِس ٹنٹے سے کوئی واسطہ نئیں تھا۔خیر۔تو کیا پسوالوں اماں سے؟''

دس بجنے میں دس منٹ تھے جب میں اور ضامن بھائی اُن کے ماموں کے محلے کی طرف روانہ ہوئے۔کتا واقعی بے حد موٹا تازہ تھا اور جب ضامن بھائی نے مجھے اشارے سے دکھایا تو بظاہر گہری نیند سویا ہوا تھا۔میں نے کہا۔

''یہ تو ویسے ہی سو رہا ہے ضامن بھائی۔اس کے قریب سے گزر جاؤ چپکے سے۔گولی کھلانے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔''

تب ضامن بھائی نے مجھے کتوں کے حرامی پن کے حوالے سے ایک مختصر سا واقعہ سنایا جس میں اُن کے کسی دوست کی محبوبہ، ملاقات، رات، دوست، کتے اور ایک ایسی پتلون کا تذکرہ تھا جس کا کچھ حصہ کتے کے منہ میں رہ گیا تھا اور تھوڑی سی کھال بھی۔اور تہدیدی انداز میں بولے۔

''اگر کتا وِس جگہ کاٹ لے تو شراٹے بہہ جاتے ہیں اور بھاگتے وے آدمی کے وِسی جگہ کاٹتے ہیں کتے۔پھر چودہ ٹیکے الگ سے لگتے ہیں پیٹ میں۔میں جگہ کا نام نئیں لے ریا۔کس واسطے کہ اب اِتی عقل تو تم میں ہوگی ہی۔یہاں لگتے ہیں ٹیکے یہاں۔'' اُنہوں نے میرا پیٹ پکڑنے کی کوشش کی تو میری ہنسی نکل گئی۔گو ہم کتے سے کافی فاصلے پر کھڑے تھے، پھر بھی چونکا اور اُس نے سر اُٹھا کر ہوا میں کچھ سونگا اور پھر

ٹانگوں پر سر رکھ کے سو گیا۔ضامن بھائی غصے سے بولے۔

''ہر وخت ٹھی ٹھی ٹھی۔تم سمجھ ہی نئیں رئے ہو کہ ہم لوگ اس وخت کس عالم سے گزر رئے ہیں؟ اماں وہ روٹی کاں ہے جس میں وہ دوا ملائی تھی تم نے؟''

کپڑے کے ایک تھیلے میں سالن میں ملی دو روٹیاں میرے ہاتھ میں تھیں۔اصل میں ہم گیارہ بجے سے بہت پہلے آ گئے تھے۔ممانی نے کہا تھا کہ ماموں گیارہ بجے تک سو جاتے ہیں اور وہی وقت مناسب تھا مگر ضامن بھائی نے حسب عادت جلدی مچائی اور اس کے نتیجے میں ہم دونوں اس وقت گلی کے نکڑ پہ کھڑے دروازہ کھلنے کے اشارے یعنی دروازے کے باہر لگے بلب کے دو دفعہ جلنے بجھنے کا انتظار کر رہے تھے۔ممانی نے ضامن بھائی سے یہی اشارہ طے کر رکھا تھا۔ہم دونوں گلی کے نکڑ پہ کھڑے کچھ مشکوک دکھائی دے رہے تھے، اسی لیے دو چار گزرتے آدمیوں نے ہمیں گھور کے بھی دیکھا تھا لیکن ضامن بھائی کی مونچھوں کو دیکھ کر شاید ہم سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں کر پائے۔کتا ابھی تک بظاہر تو سویا ہی ہوا تھا۔پھر ضامن بھائی نے کچھ سوچا۔

''اماں یار وِس سالے کو وخت سے پہلے ہی یہ روٹی نہ کھلا دیں؟ جیسا وِس کا تن وتوش دِکھ ریا ہے تو بے ہوش ہونے میں بھی وخت تو لے گا ہی۔کیا صلاح ہے تمہاری؟''

میں چاہتا تھا کہ یہ قصہ اب جتنی جلدی ہو نبڑ جائے چنانچہ میں نے کہا۔

''کوئی ہرج نئیں۔یہ لو روٹی اور ڈال دو اُس کے سامنے۔'' اس بات پر ضامن بھائی اُچھل پڑے اور مجھے گھور کے بولے۔

''میں؟ میں ڈالوں یہ روٹی اُس کے سامنے؟ اماں تم پھول والوں کی سیر کے میلے پہ آئے ہوئے ہو کیا؟ میں تمہیں دسراہٹ کے لیے کس واسطے لایا ہوں کہ تم وِس کھمبے کے نیچے کھڑے ہو کے تماشا دیکھو؟ بڑے افسوس کی بات ہے یار؟ سچ ہے بھیا مصیبت کے وخت سایا سالا بھی انسان کا پیچھا چھوڑ دیتا ہے۔'' غصے سے شروع کی گئی بات کو اُنہوں نے بتدریج ایسا رنگ دیا کہ آخر میں مظلومیت کی تصویر بنے اور ایسے بنے کہ کتوں سے اپنے تمام تر خوف کے باوجود مجھے اُن پہ ترس آ گیا اور میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں۔لیکن ایک بات غور سے سن لو۔میرا کام اس کے بعد ختم ہو جائے گا۔اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں موٹر سائیکل چرانے تمہارے ساتھ گھر کے اندر تک جاؤں گا تو اسے بھول جاؤ۔'' ضامن بھائی تڑخ کر بولے۔

''ابے پھروئی چوری؟ کون سالا کر ریا ہے چوری؟ ایک نیک کام کر رئے ہیں محلے والوں کی فلاح و بہبود کے واسطے۔شرع میں بھی اس کا حکم موجود ہے۔اب لِکل لو کتے کی طرف۔حوصلہ بلند رکھیو اور ایسی کوئی

حرکت مت کریو کہ میری بھی ہمت جواب دے جائے۔ وفا کرنے والے کے لئے بہت عمدہ بشارتیں دی گئی ہیں۔ صبح دکھادوں گا بہشتی زیور میں۔'' اپنی گفتگو میں شرعی حوالے شامل کر کے وہ آدھا سگریٹ سلگانے لگے تو شعلے کی روشنی میں مجھے اُن کے چہرے پر ایک طرح کی خباثت بھری مسکراہٹ بھی دکھائی دی۔ میں نے کتے کی طرف چلنا شروع کیا۔ قریب پہنچنے پر میں لرز گیا۔ اب میں کتے کو بہت صاف دیکھ سکتا تھا۔ اُس کی دم کٹی ہوئی تھی اور منہ اتنا بڑا تھا کہ میری جیسی دو پنڈلیاں بیک وقت وہ منہ میں داب سکتا تھا۔ ٹھنڈے پسینے اور خوف کی لہر بیک وقت میرے بدن میں چلی۔ پسینہ تو پتہ نہیں کہاں گیا لیکن خوف کی لہر نے مجھے جکڑ لیا۔ میں نے گھوم کے دیکھا۔ ضامن بھائی کھمبے سے ٹکے اطمینان سے سگریٹ کے کش لگا رہے تھے اور اشاروں میں میرا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ اب میں کتے کے بالکل قریب تھا۔ وہ ہاتھ جس میں مَیں نے نشہ آور روٹیاں اُٹھا رکھی تھیں، واضح طور پر کانپ رہا تھا۔ میں کتے کے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر روٹیاں اُس کے سامنے نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اس صورت میں وہ یکدم بیدار ہو کر پتہ نہیں کیا سمجھتا اور مجھے پہ حملہ کر دیتا۔ چنانچہ میں ہمت کر کے اُس کے سامنے چلا گیا۔ شومئی قسمت ضامن بھائی کے ماموں کے گھر کے عین سامنے شیشم کا ایک بڑا سا پرانا پیڑ کھڑا تھا جس کی شاخیں کافی حد تک یوں نیچے جھکی ہوئی تھیں کہ غالباً اُن سے لٹک کر محلے کے بچے دن میں کھیلا کرتے ہوں گے۔ میں نے اپنے جی میں پختہ ارادہ باندھ لیا تھا کہ اگر کتا کسی قسم کی جارحیت پر اُترتا ہے تو میں بھاگ کر اس درخت کی کسی شاخ سے لٹک کر درخت پہ چڑھ جاؤں گا۔ یہ جائے فرار یا پناہ پا کر مجھے ایک گونہ راحت ہوئی۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ ضامن بھائی اب ساکت وصامت کھڑے تھے۔ غالباً دم بھی روکے ہوئے ہوں گے۔ یہی حال میرا اپنا تھا۔

اب میں کتے سے کوئی چھے فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ میری دائیں پنڈلی زور زور سے پھڑک رہی تھی۔ کتا اب بھی بظاہر گہری نیند میں لگتا تھا۔ میں نے دم مزید سادھا، ضامن بھائی اور اپنی متوقع کمیں گاہ کو دیکھا اور روٹیاں کتے کے سامنے پھینک دیں۔ رات گہری تھی اور ہر سُو سناٹا۔ روٹیاں تھپ کی آواز سے کتے کے سامنے گریں مگر کتا ٹس سے مس ہوا اور نہ ہی اُس نے آنکھیں کھولیں۔ میں نے سن رکھا تھا کہ کتوں کی سونگھنے کی قوت بہت تیز ہوتی ہے۔ ممکن ہے اُس کے کان کام نہ کرتے ہوں لیکن ناک کو کیا ہو گیا تھا۔ میں اُس کی چمکتی ناک صاف دیکھ سکتا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ وہ فقط چمکتی ہی تھی یا کچھ کام بھی کرتی تھی؟ دو میں سے ایک روٹی تو بالکل اُس کی ناک کے قریب گری تھی۔ پھر کتے نے آنکھیں کھولیں۔ میں نے غور سے دیکھا، وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا بلکہ اُس روٹی کو گھور رہا تھا جو عین اُس کی ناک کے قریب پڑی تھی۔ پھر اُس نے اپنی ناک سکیڑ کر روٹی کی خوشبو کا اندازہ کیا اور قدرے سنبھل کر بیٹھا۔ بظاہر وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہاں سے فوراً روانہ ہو جاؤں لیکن میرے پیر جیسے زمین میں گڑ گئے تھے۔

کتا اب روٹی کو پنجے سے قریب گھسیٹ کر اُسے سونگھ رہا تھا۔ پھر اُس نے ایک ہی دفعہ میں روٹی تقریباً پوری اپنے منہ میں لے لی اور چبانے لگا۔ جلد ہی اُسے دوسری روٹی کی موجودگی کا اندازہ بھی ہو گیا اور چونکہ وہ روٹی اُس سے قدرے فاصلے پر تھی اور پنجے کی دسترس سے باہر بھی، وہ کھڑا ہوا اور تب مجھے اُس کے قد کا اندازہ ہوا۔ بلا شبہ وہ منحوس کتا قد میں کسی دنبے سے کم نہ تھا۔ زیادہ ہی رہا ہوگا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ ضامن بھائی اپنی جگہ موجود نہ تھے۔ غالباً وہ کتے کا قد کاٹھ دیکھ کر وہاں سے فرار ہو چکے تھے اور اب میں اس کتے کے رحم وکرم پر اکیلا ہی تھا۔ دوسری روٹی منہ میں لے کر کتا پھر اپنی جگہ جا بیٹھا۔ اس بار اُس نے یہ روٹی کھائی نہیں بلکہ اُس کا معائنہ کرنے لگا۔ میں چاہتا تھا کہ وہاں سے کسی بھی طرح بھاگ لوں لیکن تبھی کتے نے روٹی ایک طرف رکھ کر پہلی مرتبہ میری طرف غور سے دیکھا۔ میں قطعی اندازہ نہ کر سکا کہ وہ مجھے دیکھ کر کیا سوچ رہا تھا۔ شاید وہ کسی اور طرف دیکھ رہا ہو لیکن مجھے نجانے کیوں لگا کہ اُس کی نظریں میری پنڈلی پر مرکوز تھیں۔ پھر کسی نے میرے شانے پہ ہاتھ رکھا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ ضامن بھائی کھڑے گھگھیا رہے تھے۔ پھر وہ سرگوشی کے انداز میں بولے۔

''ابے یہ تمہیں دیکھ رہا ہے کہ مجھے؟'' ضامن بھائی کچھ پڑھ رہے تھے مگر اُن کی آواز اس قدر لرز رہی تھی کہ میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ پھر کتا ہماری طرف بڑھا۔ جی چاہا کہ بھاگ کے شیشم کی شاخ سے لٹک کے درخت پہ چڑھ جاؤں مگر ضامن بھائی سدراہ بنے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا اور سنا تھا کہ کتے بھاگنے والی چیز کے پیچھے یکدم بھاگنے لگتے ہیں اور بھاگتے وقت اُن کا ذہن اس معاملے میں قطعی صاف ہوتا ہے کہ اُنہیں کیا کرنا ہے؟ کتا ہم سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہو کر خلا میں دیکھنے لگا۔ لگتا تھا جیسے اب وہ ہماری طرف سے بالکل ہی بے خبر تھا۔ ضامن بھائی اپنا منہ میرے کان سے اتنا قریب لا کر بولے کہ مجھے اُن کی مونچھیں اپنے کان کے اندر تک چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

''ابے یہ کدھر کو دیکھ رہا ہے؟ ہماری طرف تو نہیں دیکھ رہا؟'' پھر مونچھیں میرے کان میں مزید سرسرائیں اور وہ پہلے جیسی سرگوشی کے ساتھ بولے۔

''ارے اُف! ابے یہ ہمی کو تاڑ رہا ہے۔ بھینگا ہے سالا۔ لکھ لو اِدھر کو ہی دیکھ رہا ہے۔'' مجھے کتوں کے بارے جیسے کچھ زیادہ پتہ نہیں تھا، ویسے ہی یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ کتے بھی بھینگے ہوتے ہیں۔ لیکن میں نے اس وقت اس نکتے پر غور نہیں کیا اور اُسی طرح سرگوشی میں کہا۔

''ضامن بھائی۔ بھینگا ہے یا نہیں ہے۔ یہ سوچو یہ بے ہوش کیوں نہیں ہو رہا؟'' کتے کو روٹی کھائے دس منٹ سے زیادہ ہو گئے تھے اور اُصولاً اُسے ابھی تک بے ہوش ہو جانا چاہئے تھا مگر وہ باہوش و حواس ہمارے سامنے ڈٹا ہوا تھا۔ کتا مسلسل خلا میں دیکھ رہا تھا۔ ضامن بھائی میری کمر پکڑے اپنی مونچھیں

آدھی سے زیادہ میرے کان میں گھسیڑے ہوئے پھر بولے۔

''میں نے اسی وخت خواجہ کی چدر مان لی ہے۔'' پھر خلا میں دیکھ کر کسی نادیدہ قوت سے مخاطب ہوئے۔

''یہ بلا ٹل جائے خواجہ۔ یہ بڑی چدر چڑھاؤں گا ایمان سے۔''

اب پتہ نہیں یہ ضامن بھائی کے نالے کا فوری جواب تھا یا کیا تھا کہ کتا ہمارے سامنے دھم سے گرا اور اٹا غفیل ہو گیا۔ ضامن بھائی میری کمر سے چمٹ گئے اور اس بار بولے تو اُن کی آواز خوشی سے تھرتھرا رہی تھی۔ آواز میں وہی پرانا کرارا پن اور طنز آ گیا تھا۔ اُنہوں مجھ سے جدا ہو کے اور میرے سامنے سے آ کر کہا۔

''میں نئیں سمجھ ریا تھا کہ تم اِتے ڈرپونک لکلو گے؟ آئیں؟ اماں کتا ہے سالا کوئی شیر تو نئیں ہے۔ اور.....'' غالباً وہ اُس وقت ماموں کے گھر کی طرف ہی دیکھ رہے تھے اور بلب جلنے بجھنے کا اشارہ ہو چکا تھا۔ وہ یکدم مزید چست ہوئے اور بولے۔

''میں جا ریا ہوں اندر.....اور سنو۔ اسی جگہ کھڑے رہیو۔ موٹر سائیکل اشٹارٹ نئیں ہوگی ہم سے۔ ماموں وِس کے ساتھ جو چالبازی کرتے ہیں، وہ ہم سے نئیں ہو پائے گی۔ ویسے وہ کر سکتے ہیں، کس واسطے کہ ہمارے نانا ایک انگریزن کے چکر میں دو چار سال ایک سرکس میں کام کر چکے تھے ماموں کے پیدا ہونے سے پہلے۔ یہ بکواس کسی سے سامنے مت کریو ورنہ روز قیامت کے دن اللہ میاں کے سامنے دھرلوں گا۔ سسری کو دھکیل کے دریا تک لے جانا پڑے گا اور مجھ میں اِتا دم نئیں ہے۔'' اُنہوں نے اس کی وجہ مدتوں سے اپنی سگریٹ نوشی اور ملاوٹ شدہ خوراک کو قرار دیا۔ میں نے کتے کی طرف دیکھا۔ وہ بے ہوش پڑا تھا۔ گلی سنسان تھی اور رات مزید گہری ہو گئی تھی۔ ضامن بھائی پھرتی سے گیٹ سے اندر گئے اور میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اُسی لمحے ٹہلتے ہوئے دو پولیس والے گلی میں داخل ہوئے ایک قدرے لمبے قد کا اور مونچھوں والا تھا۔ اُس زمانہ میں رات گئے اکیلے دکیلے آدمی کو دیکھ کر پولیس والے ضرور سوال جواب کیا کرتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ اُن کے قریب آنے سے پہلے ضامن بھائی موٹر سائیکل لیے گھر میں سے نکلیں گے اور اُنہیں بھی سوال جواب کی سان پہ دھر لیا جائے گا۔ پولیس والے قریب آئے اور عین میری توقع کے مطابق مونچھوں والے نے ڈانٹ کر کہا۔

''اس وقت کیوں کھڑے ہو اِدھر؟'' میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور اگر آیا تو یہ کہ میں کتے کے حوالے سے جھوٹ بولوں، چنانچہ میں نے کہا۔

''کتے کو ٹہلا رہا ہوں۔'' میں نے ثبوت کی طرف اشارہ کیا جو بدستور بے ہوش تھا۔ پولیس والے نے کتے کو غور سے دیکھا اور کہا۔

''مگر یہ تو سو رہا ہے؟'' میں نے ماموں کے دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے چند ہی لمحوں

میں ضامن بھائی مال مسروقہ کے ساتھ برامد ہونے والے تھے۔

''ارے! سو گیا؟ مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔'' پولیس والا مجھے شک آلود نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔

''نام کیا ہے؟''

''جی.....نام کس کا نام پوچھ رہے ہیں؟'' پولیس والا قدرے سختی سے بولا۔

''کتے کا نام کیا ہے؟'' میں نے سوچا شکسپیئر کی طرح افلاطونی سے کام لینا چاہئے۔ چنانچہ میں نے کہا۔

''نام میں کیا رکھا ہے۔ کتے کو کسی بھی نام سے پکارو۔ وہ کتا ہی رہتا ہے۔'' پولیس والے کو یہ جواب اچھا نہیں لگا۔ اُس نے اپنی چھڑی سے میرا کندھا چھوا اور بولا۔

''زیادہ ہشیاری مت دکھا۔ یہ کسی سالے انگریز نے گلاب کے پھول لیے کہا تھا۔ نام یاد نہیں آ رہا اس وقت۔ کیا نام ہے اس کتے کا؟'' میں نے یونہی کہا۔

''موتی۔''

بس پھر وہ ہوا جو میرے گمان میں نہیں تھا۔ کتا یکدم نیند سے جاگا، اُس نے لمحہ بھر کو بھی نہیں سوچا اور پولیس والوں پر حملہ آور ہو گیا۔ حیران و پریشان اور شاید ششدر پولیس والوں نے پہلے تو اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے بیدوں سے مقابلہ کرنے کی ٹھانی اور پھر اپنی ٹانگوں کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے پسپا ہو گئے۔ میں نے یہ پسپائی گلی کے نکڑ تک دیکھی پھر وہ کتے سمیت نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اُسی لمحے دروازہ کھلا اور ضامن بھائی نے مسروقہ موٹر سائیکل کا اگلا پہیہ باہر نکالا۔ میں نے گلی میں لگے بلب کی روشنی میں پہلی مرتبہ موٹر سائیکل کو غور سے دیکھا اور پہلی نگاہ میں اسے موٹر سائیکل تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ہم نے جو موٹر سائیکل بشیر کباڑیئے سے خریدی تھی وہ تو اس کے مقابلے میں مرسیڈیز کار تھی۔ سب سے اہم بات تو یہ تھی کہ اس موٹر سائیکل کی گدی نہیں تھی۔ میں نے ضامن بھائی کا چہرہ دیکھا جو کامیابی کی خوشی میں یقیناً دمک رہا ہوگا مگر اس دمک کو اُن کی پھڑپھڑاتی مونچھوں نے چھپا رکھا تھا۔ جب ہم اُس موٹر سائیکل کو دھکیلتے گلی سے دُور اُس ویران سڑک پر پہنچ گئے جہاں سے دریا کو رستہ کٹتا تھا تو ضامن بھائی نے موٹر سائیکل کو ایک درخت کے ساتھ ٹکایا اور ایک سگریٹ سالم پینے لگے۔ میرا جی بھی سگریٹ پینے کو چاہ رہا تھا لیکن مانگنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ ضامن بھائی نے نیم تاریکی میں بھی میری خواہش غالباً میرے چہرے پر دیکھ لی تھی اسی لئے تو اُنہوں نے خود پہ جبر کر کے کہا۔

''تین چار دم چھوڑ دوں گا تمہارے لیے وِس سالے میں سے۔''

مگر جب اُنہوں نے سگریٹ مجھے دیا تو فقط ایک ہی کش لگانے سے وہ ختم ہو گیا۔ میں نے شکوہ کیا تو وہ قدرے تلخی سے بولے۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ زہر زیادہ 'اُلیچنا' تمہاری صحت کے لیے اچھا نہیں ہے اور دوسری یہ کہ مجھے اندھیرے میں پتہ ہی نئیں چلا کہ میں کِتا کھینچ گیا سالے کو اور پھر بھیا ہم نے تو سیدھا سا حساب رکھا ہے وِس مردود کام کا۔ جب مونچھیں جلنے لگتی ہیں اور بو آتی ہے سالے کو پھینک دیتے ہیں۔ اور وِس وخت بھی یہی کرا تھا۔''

مجھے یہ سن کر بہت غصہ آیا کہ ضامن بھائی نے اُس وقت سگریٹ مجھے دیا تھا جب وہ پھینک دینے کے قابل ہو گیا تھا۔ پھر وہ بولے۔

''اماں یار میں سونچ ریا ہوں ممانی ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ بنا گدی کی موٹر سائیکل کوئی سالا کیسے چلا سکتا ہے؟ کہیں تو بیٹھتے ہی ہوں گے؟ مگر کہاں؟ مجھے تو کوئی ایسی چیز نئیں دِکھرئی۔ اماں ذرا سونچیو تو۔'' مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ ضامن بھائی کے ماموں بنا گدی کی موٹر سائیکل پر کہاں بیٹھتے ہوں گے۔ مجھے نیند آ رہی تھی اور میں تھکا ہوا بھی تھا چنانچہ میں نے بیزاری سے کہا۔

''ضامن بھائی اب اس کا جو کرنا ہے جلدی سے کر لو۔ مجھے صبح دفتر بھی جانا ہے۔'' ضامن بھائی نے فوراً میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''کرنا کیا ہے سالی کا۔ دریا میں پھینکنے کو کہا ہے ممانی نے۔ وئی کرنا ہے۔ ہمت کرو۔ بس دریا تھوڑی دور ہے۔ دیکھو اِتی دور میں نے دھکیلا ہے وِسے۔ اب کچھ ہاتھ پیر تم بھی ہلاؤ۔ ویسے بھی کوئی سر پہ اُٹھانے کی چیز تو ہے نئیں۔ ذرا سا دھکا لگے تو خود بخود رواں ہو جاتی ہے۔'' بخدا ہم ماموں کے گھر سے کوئی میل بھر یا اُس سے بھی کم دور کھڑے تھے اور جہاں تک میری معلومات کا تعلق تھا تو دریا ابھی کم از کم پانچ چھے میل کے فاصلے پر تھا۔ بہر حال میں موٹر سائیکل کو اکیلا ہی دھکیلنے لگا۔ موٹر سائیکل دھکیلنا شاید اتنا مشکل کام نہیں تھا جتنا ضامن بھائی کی مسلسل ہدایات کو برداشت کرنا۔ وہ بلا تکان بول رہے تھے۔

''اماں ذرا بچا کے۔ پتھر نئیں دِکھا تمہیں؟ ہائیں ہائیں کیا کر رئے ہو؟ ابھی تمہارے اُوپر لوٹ جاتی سسری؟ ہاں بس ایسے مزے مزے میں چلتے رہو۔'' ہم دریا کے پل پہ پہنچے تو غالباً دو بج چکے تھے۔ آخری تاریخوں کا چاند نکل آیا تھا اور پانی میں چاندی گھلی دکھائی دے رہی تھی۔ پانی سے چھو کر آنے والی ہوا اتنی نیند آور تھی کہ میرا جی چاہ رہا تھا کہ یہیں سو جاؤں۔ پل کی منڈیر کوئی چار فٹ اُونچی تھی۔ ہمیں موٹر سائیکل کو اس بلندی سے اُٹھا کر دریا میں پھینکنا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ ضامن بھائی انگریزوں کو دو چار گالیاں دے کر بلند آواز میں مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''اماں میں پُوچھ ریا ہوں سالوں کو یہ دیوال اِتی اُونچی بنانے کی کیا پڑی تھی؟ کون کو دے جا ریا

تھا وِس کے اُوپر سے سالے دریا میں؟'' میں نے جل کر کہا۔

''تم خود ہی ہر وقت انگریزوں کی تعریفوں کے پُل باندھتے ہو۔ اس وقت کیوں گالیاں دے رہے ہو؟'' مجھے گھور کر بولے۔

''اچھا کام کریں گے تو تعریف سنیں گے ورنہ گالیں کھائیں گے۔ اور سنو مجھ سے اس وخت بحث مت کرنا۔ میرا دماغ پِن ناریا ہے۔ اُٹھاؤ سالی کو۔'' ہم دونوں نے کوشش کی۔ شروع میں مجھے لگا جیسے ضامن بھائی سارا وزن مجھی پہ ڈال رہے تھے مگر یہ اندازہ بعد میں غلط ثابت ہوا۔ موٹر سائیکل بہت وزنی تھی۔ ضامن بھائی نے اُسے نیچے رکھا اور ہانپتے ہوئے بولے۔

''میں دلی میں دو چار من وزن اُلٹے ہاتھ سے اُٹھا کے، کندھے پہ رکھ کے جامع مسجد کی ساری سیڑھیاں ایک ہی سانس میں چڑھ جایا کرتا تھا۔ (یہ نہیں بتایا کہ وہ وزن کس شے کا ہوتا تھا اور اُسے جامع مسجد کی ساری سیڑھیاں چڑھ کر کہاں پہنچایا کرتے تھے۔) پھر سگریٹ کو دو چار گالیاں دیں اور قسم کھا کر بولے۔

''تمہارے سامنے حلفیہ بیان دے ریا ہوں۔ ابھی، وِسی وخت سگریٹ سے توبہ کر ریا ہوں اور وِس ڈبیہ کو دریا برد کر ریا ہوں۔ یہ سب اسی منحوس کا شاخسانہ ہے کہ ضامن سے یہ اِتی سی موٹر سائیکل نئیں اُٹھ رئی۔'' پھر سگریٹ کی ڈبیہ جیب سے نکالی، پھینکتے پھینکتے نجانے جی میں کیا آئی۔ ڈبیہ کھول کے سگریٹ گنے اور دوبارہ جیب میں رکھتے ہوئے بولے۔

''فضول خرچی کرنے والوں کے لئے بڑا سخت حکم آیا ہے۔ شیطان کے بھائی کہا گیا ہے۔ ابھی وِس کے اندر سات سگریٹ باقی ہیں۔ اللہ کیا سونچے گا کہ خبیث کو ایک نعمت دی اور یہ وِسے دریا میں جھونکے دے ریا ہے؟ تمہاری مسکراہٹ کا جواب صبح دوں گا۔ ابے قسم کھالی ہے وِس وخت میں نے۔ جیسے ہی یہ ڈبیہ ختم ہو گی وِس،، ناخلق،، چیز سے جان چھڑا لوں گا۔ چلو اُٹھاؤ۔''

اس بار ہم دونوں کے پورا زور لگانے کے باوجود موٹر سائیکل کا محض اگلا پہیہ ہی پل کی منڈیر پر رکھا جا سکا۔ ضامن بھائی اُچک کے منڈیر پہ چڑھے اور بولے۔

''میں اُوپر سے کھینچ ریا ہوں وِس کو۔ تم نیچے سے زور لگاؤ۔ اور دیکھو تمہیں قسم ہے ایمانداری سے زور لگائیو۔'' مجھے قسم نہ بھی دیتے تو بھی میں ایمانداری سے ہی کام لیتا۔ میں نے پوری ایمانداری سے اپنے حصے کا کام کیا۔ اس دوران ضامن بھائی مسلسل ہدایات دیتے رہے اور نجانے کس کس کو برا بھلا کہتے رہے پھر اچانک اُن کی آواز آنا بند ہو گئی۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ موٹر سائیکل بدستور آدھی دیوار پہ لٹکی ہوئی تھی مگر ضامن بھائی غائب تھے۔ میں کانپ گیا۔ میں نے موٹر سائیکل کو فوراً چھوڑا جو ایک آواز کے ساتھ

میرے اُوپر گرتے گرتے رہ گئی۔ میں نے منڈیر سے نیچے جھانکا۔ وہ یقیناً ضامن بھائی ہی تھے اور پانی میں ڈبکیاں کھا رہے تھے۔ میں نے منڈیر پر کھڑے ہو کر دریا میں چھلانگ لگا دی۔ میں ضامن بھائی کے قریب ہی گرا۔ پانی زیادہ گہرا نہیں تھا مگر پھر بھی جس طرح ضامن بھائی ہاتھ پیر مار رہے تھے، وہ اُن کو ڈبونے کے لئے کافی تھا۔ میں نے اُنہیں سہارا دیا اور چند لمحوں بعد وہ دریا کے کنارے اُگی گھاس پہ پڑے ہانپ رہے تھے۔ رات گزر چکی تھی۔ صبح ہونے والی تھی اور روشنی کا ہلکا غبار پھیل رہا تھا۔ میں نے کہا۔

''یہ کیا کیا تم نے ضامن بھائی؟ دریا میں کیسے گر گئے؟ اگر مجھے تیرنا نہ آتا تو تمہاری لاش اس وقت پانی پہ تیر رہی ہوتی۔'' وہ اس وقت ادھموئے پڑے تھے مگر مجھے گھور کر بولے۔

''گرنے کی کیا معنی؟ ہم کوئی رذیل ذلیل ہیں جو گرتے ہیں؟'' مجھے واقعی غصہ آ گیا۔ میں نے کہا۔

''تو اسے اور کیا کہیں گے؟ تم گرے نہیں تھے تو پھر اور کیا ہوا تھا؟'' وہ مسکرائے اور سگریٹ کی ڈبیہ نکال کر اُس میں سے کوئی خشک سگریٹ ڈھونڈنے کی کوشش میں ناکام ہو کر بولے۔

''میں گرائیں تھا، پھسل گیا تھا سسری دیوال پہ سے۔'' اُن کے سگریٹوں کی لگدی بن چکی تھی۔ پھر وہ گھاس پر تھکے ہوئے انداز میں لیٹ کر بولے۔

''وہ سالی تو اُوپر ہی رہ گئی۔ اب دن لکلنے والا ہے۔ اب کے کوشش کری تو پکڑے جاں گے۔ میں تو کہتا ہوں کہ چپکے سے گھر کو لکل لو۔''

ہم دونوں نے کچھ دیر اپنے کپڑے سکھانے کی کوشش کی اور اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔ تیسرے دن ضامن بھائی نے مجھے بتایا کہ ماموں کی موٹر سائیکل بخیر و خوبی اُنہیں واپس مل گئی تھی۔ اُنہوں نے چوری کا پرچہ درج کروایا تھا اور موٹر سائیکل پولیس نے ڈھونڈ کے اُن کے سپرد کر دی تھی۔ اس کا ایک نقصان ہوا اور وہ یہ کہ اُن کی ممانی اُن سے روٹھ گئیں اور بظاہر ضامن بھائی کی شادی ٹل گئی۔

مولوی شاکر اللہ نے راج سنگھ کا گھر اپنے کسی رشتہ دار کو الاٹ نہ ہونے کا بہت زیادہ اثر لیا تھا۔ وہ اب پابندی سے ہر جمعے میں تقریر کر کے لوگوں کو بتایا کرتے تھے کہ پاک وطن میں پلید لوگوں کی موجودگی چہ معنی؟ وہ نام تو نہیں لیتے تھے لیکن سمجھنے والے سمجھ جایا کرتے تھے کہ روئے سخن کس کی جانب ہوا کرتا تھا۔ راج سنگھ کی بیٹی کو سکول میں داخلہ مل گیا تھا اور یہی نہیں راج سنگھ نے اپنا آبائی کام بھی شروع کر دیا تھا۔ اُس نے گھر کی بیٹھک میں ہی پتنگیں بنانے کی دکان کھول لی تھی۔ وہ کاریگر تھا۔ شہر کے لوگ پتنگ بازی کے شوقین تھے۔ چنانچہ اُس کا کام چل نکلا اور یہ مولوی شاکر اللہ کے لئے مزید تکلیف دہ بات تھی۔

مسلمانوں نے وطن کے نام پر ایک نیا خطہ حال ہی میں حاصل کیا تھا۔ سکھوں ہندوؤں کے

ستائے بہت سے لوگ محلے میں رہتے تھے۔ لوگوں کے زخم ابھی مندمل بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک سکھ دوبارہ اس محلے میں آباد ہو گیا تھا۔ گوراج سنگھ ایک نہایت ہی نفیس آدمی تھا۔ اُس کی بیوی جہلم کے قریب کسی گاؤں کی رہنے والی نیم خواندہ عورت تھی مگر وہ بہت ہی عمدہ سبھاؤ کی تھی اور چونکہ وہ برسوں پہلے شادی ہو کر یہاں آئی تھی اس واسطے اُسے اپنی پرانی محلے والیوں میں گھلتے ملتے کچھ دیر نہیں لگی۔ اُن کی بیٹی پریتی کو سکول میں داخلہ مل گیا تھا۔ راج سنگھ کا کاروبار چل نکلا تھا اور وہ تقریباً سکون سے رہنے لگے تھے۔ متھا ٹیکنے کی تکلیف البتہ تھی تو اُس کے لیے گھر کے ایک کونے میں بندوبست کر لیا گیا تھا۔

مولوی شاکر اللہ اور کچھ تھے یا نہ تھے، خطیب بہت زوردار تھے اور لوگوں کے دل ہاتھ میں لینے کے گر سے بھی خوف واقف۔ وہ تو ویسے بھی اسلام کی نشاۃ ثانیہ پر جب تقریر کیا کرتے تھے تو لوگوں کو وجد میں آ جانے پر مجبور کر دیا کرتے تھے۔ اب تو معاملہ ذاتی نوعیت کا بھی تھا۔ ایک سکھ اُس گھر میں عدالت سے ہوتا ہوا آن کر ڈٹ گیا تھا جس میں وہ اپنے کسی قریبی عزیز کو آباد کروانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ہر چڑھنے والے دن کے ساتھ اُن کی خطابت بھی برابر سے چڑھتی تھی۔ ہر روز ایک ہی بات دہرائی جائے تو لوگ کچھ کچھ یقین بھی کرنے لگتے ہیں۔ اپنے تمام زور کے باوجود لوگ فقط اتنا ہی سمجھ پاتے تھے کہ پاک دیس میں پلید لوگوں کا کوئی کام نہیں تھا اور انہیں یہاں سے نکال باہر کرنا چاہئے یا پھر اس کا ایک حل اور بھی تھا کہ راج سنگھ مع اپنے خاندان کے مسلمان ہو جاتا۔

یہ تجویز راج سنگھ تک پہنچا دی گئی۔ پہلے تو وہ سناٹے میں رہ گیا اور پھر یہ تجویز پہنچانے والے کو اُس نے اصلی سکھوں والی گالیاں دے کر وہاں سے چلتا کر دیا لیکن اُس کی بیوی لاڈو پریشان ضرور ہو گئی۔ راج سنگھ کا خاندان اس گلی میں کچھ نہیں تو کوئی دو سو برس سے تو آباد تھا ہی اور اتنی ہی پرانی یہ مسجد بھی تھی جس کے موجودہ مولوی نے اُسے دعوت اسلام دی تھی۔ راج سنگھ کو اچھی طرح یاد تھا کہ اُس کے بچپن میں یہاں جو مولوی صاحب ہوا کرتے تھے، وہ عشا کی نماز کے بعد لالٹین ہاتھ میں لئے گھر گھر جا کر بچوں کو جمع کرتے اور اُنہیں حکایات سعدی پڑھانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں محلے میں بجلی نہیں آئی تھی۔ سفید ریش اور سرخ و سفید مولوی صاحب کا سراپا راج سنگھ کو آج بھی یاد تھا۔ وہ دوسرے بچوں کے ساتھ مسجد کے اندر جاتا اور برامدے میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا۔ صبح اُسے خاک بھی یاد نہ رہتا کہ رات مولوی صاحب نے کیا پڑھایا تھا۔ ایک مرتبہ شہر کی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے بڈھے اراکین نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ کہیں مسلمانوں کا مولوی محلے کے سکھ ہندو بچوں کو مسلمان نہ کر دے۔ یہ بات مولوی صاحب نے سنی تو وہ بہت ہنسے تھے اور اُنہوں نے کہا تھا۔

''میاں کرامات، معجزے، قصے کہانیاں سنا کر کسی کو مسلمان کیا تو کیا کیا۔ ہمارے کردار سے متاثر ہو کر اگر کوئی ایسا کرنا چاہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔''۔ پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر یہ بھی کہا تھا۔

''اور ہم دوزخ نصیبوں کا ایسا ایمان اور کردار کہاں؟''

راج سنگھ نے آج تک کسی سے یہ بات نہیں کہی تھی۔ لاڈو تک سے نہیں کہ اُن دنوں اُس کا جی مسلمان ہونے کو بہت چاہتا تھا لیکن پھر وہ اپنے تایا کے پاس دلی چلا گیا تھا اور وہاں فوج میں بھرتی ہونے کی ناکام کوشش کے بعد پتنگ سازی سیکھنے لگا تھا اور بات آئی گئی ہو گئی تھی۔ مولوی شاکر اللہ کی طرف سے دعوت اسلام ملنے پر اُسے وہ پٹھان مولوی صاحب بہت یاد آئے جو تقریباً ہر رات کہا کرتے تھے۔

''بچو!.....سارے مذاہب اللہ نے بنائے ہیں اور اس لئے بنائے ہیں کہ انسان، انسانوں کے ساتھ وہ سلوک کریں جو ایک انسان کی شان اور حق ہے۔ یعنی پیار، محبت، عزت اور احترام۔ اس سے زیادہ کسی مذہب کا کوئی پیغام نہیں۔ تم جس بھی مذہب کو مانتے ہو، بس یہ نکتہ یاد رکھنا۔''

راج سنگھ کو مولوی شاکر اللہ اور اپنے مولوی صاحب میں زمین آسمان کا فرق نظر آیا۔ وہ پاکستان واپس آ چکا تھا، وہ پاکستانی تھا، ساتھ ہی وہ سکھ بھی تھا۔ وہ سکھ بھی رہنا چاہتا تھا اور پاکستانی بھی۔ اگلی رات یہ بات شوکی، احسن اور ضامن بھائی تک پہنچ گئی۔

ضامن بھائی کبھی کبھی میری سمجھ میں بالکل نہیں آتے تھے۔ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ راج سنگھ جو آج اپنے آبائی گھر میں بیٹھا تھا اُس کے پیچھے ضامن بھائی کی جیب سے نکلی ہوئی وہ رقم تھی جو جج کو رشوت کے طور پر دی گئی تھی اور جسے ضامن بھائی نے ہمیشہ راز میں رکھنے کو مجھے اندھا ہو کر ایک بھکاری کی موت مرنے کا ڈراوا بھی دیا تھا۔ اگلے دن اتوار کی چھٹی تھی۔ میں ضامن بھائی کو ڈھونڈتا شوکی کی بیٹھک میں پہنچ گیا۔ اُس وقت ضامن بھائی ہی بول رہے تھے۔

''بھیا۔ اب جو میں کہنے والا ہوں وِس کے بعد میری نماز وِن کے پیچھے روانیں رہنے کی۔ تو میں کے رَیا ہوں کہ مولوی صاحب نے جو کرا اچھا نیں کرا۔'' میں نے حیرت سے ضامن بھائی کو دیکھا۔ پتہ نہیں وہ کونسی نماز کی بات کر رہے تھے۔ میں نے اُنہیں کبھی جمعہ تک پڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ جب میں جمعے کی نماز کے لیے جا رہا تھا تو وہ مجھے نیا کرتا پاجامہ پہنے، کان میں چنبیلی کا پھول اُڑسے بہت تیزی سے سائیکل چلاتے رستے میں ملے تھے اور مجھے دیکھ کر رک گئے تھے۔ (جای)

◀◀ ● ▶▶

C/o Dr.Rehana Iqbal Hazara Road
Hasan Abdal Dist: Attock-47000(Pakistan)

''ثالث شمارہ نمبر ۱۵۔۱۶'' (عالمی خواتین نمبر) پر تبصرے

● سلیم انصاری

ثالث ۱۶۔۱۵ کا ضخیم شمارہ موصول ہو گیا ہے، جسے عالمی خواتین نمبر کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔ ثالث نے اس سے قبل بھی کئی تاریخی اور یادگار نمبر شائع کئے لیکن یہ شمارہ کئی معنوں میں اہم ہے۔ اس شمارے کی ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ کرونا وبا کے اس دور میں بھی بہت سارے ممالک کی جینوئن خواتین قلم کاروں کو جمع کر دیا گیا ہے، اس کے علاوہ اس میں شامل تخلیقات عالمی عصری ادب کے تقاضوں اور میزان پر پورا اترتی ہیں۔ اپنے اداریے میں ثالث کے مدیر ڈاکٹر اقبال حسن آزاد نے یہ واضح کر دیا ہے کہ اس شمارے میں شامل مضامین اور افسانوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہو گا کہ آج کے صارفی ماحول اور تیز رفتار سائبر عہد میں عورت کیا سوچتی ہے اور معاشرے سے اس کے توقعات اور مطالبات کیا ہیں۔

اپنے مہمان اداریے میں افشاں ملک نے خواتین قلم کاروں اور نسائی ادب کے حوالے سے کئی اہم نکات پیش کئے ہیں ان کے مطابق ابتدائی دور میں خواتین قلم کاروں کی تخلیقات ان کے اصل ناموں سے شائع نہیں ہوتی تھیں جس کے سبب ان کی اصل ذات اور قارئین کے درمیان کوئی شناخت قائم نہیں ہو پاتی تھی، اس کے علاوہ افشاں ملک نے یہ بات بھی بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کر دی ہے کہ اب خواتین قلم کار، تنقید، تحقیق، شاعری کی تمام اصناف کے علاوہ ادب کے ہر شعبے میں اپنے جوہر دکھا رہی ہیں، اور میرے نزدیک یہ بات سچ بھی ہے۔ لہٰذا میری رائے میں اب ضرورت اس بات کی ہے کہ جب ادب کے میدان میں بھی خواتین مردوں کے شانہ بہ شانہ کھڑی ہیں، ایسے میں نسائی ادب اور تانیثیت وغیرہ کی بحث کو ادب سے خارج کر دینا چاہئے، اور اس طرح کی پہل خود خواتین کو ہی کرنا چاہئے۔

زیرِ نظر شمارے میں خواتین قلم کاروں کے بہت سارے مضامین، افسانے اور منظومات شامل ہے جس کے content سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب خواتین اپنی نسائیت اور ادھوری شخصیت کے خول سے باہر آ چکی ہیں۔ نورالعین ساحرہ نے اپنے بے حد تفصیلی اور اہم مضمون ''پاپولر فکشن کے حوالے سے'' میں اکیسویں صدی کے رجحانات اور تضادات اور ادب میں عہد بہ عہد بدلتے ہوئے رجحانات اور نظریات کی نشاندہی کی

ہے،انہوں نے یہ بات بھی کہی کہ عورت موجودہ عہد کے فکشن میں پوری دنیا کے ادب میں ایک اہم اور ووکل کریکٹر کے طور پر سامنے آتی ہے،اس حوالے سے کچھ ادیبوں نے اپنے ادراک اور شعور سے عورت کو ایک جیتی جاگتی ہستی کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی جو مزاحمتی بھی ہے،لیکن ساتھ ساتھ گھٹن اور روایات کے جبر کا شکار بھی ہے، یہی نسائی پیچیدگیاں اس عہد کے فکشن کو ممتاز کرتی ہیں۔تو کیا اب یہ سمجھ لیا جائے کہ فکشن کو ممتاز بنانے میں پیچیدہ نسائیت کا رول ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر ایک تفصیلی گفتگو درکار ہے۔

اپنے مضمون ''تانیثیت'' میں نسترن احسن فتیحی نے تانیثیت کی تحریک کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ تانیثیت کی تحریک کا بنیادی مقصد عورتوں کو مردوں کے مساوی سیاسی،سماجی،معاشیاور قانونی حقوق دلانا تھا اور ترقی کے میدان میں انہیں برابر کے مواقع فراہم کرانا تھا۔تانیثی تھریک کے مقاصد اپنی جگہ بجا مگر کیا ادب میں اس تحریک کا اطلاق موجودہ عہد میں ممکن ہے، جب کہ عورتوں کو مردوں کے مقابلے برابر کے حقوق حاصل ہیں، یہاں تک کہ ملازمت میں بھی ان کی حصہ داری کو مناسب طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے اور عورتیں اب ہوائی جہاز کیا فائٹر پلین تک اڑا رہی ہیں اس کے علاوہ ادب میں بھی انہیں مردوں کے مقابلے مساوی حقوق حاصل ہیں،ثبوت کے طوور پر ثالث کے عالمی خواتین نمبر کو ہی پیش کیا جاسکتا ہے۔مشتاق احمد نوری نے اپنے مضمون ''تانیثیت کیا ہے'' کو ادب تک محدود رکھا ہے اور مثال دی ہے کہ اگر ایک ہی گھر میں مرد اور اور دونوں افسانہ نگار یا شاعر ہوں،اور اتفاق سے عورت مرد سے بہتر تخلیق کرتی ہو تو مرد کو کوفت اور سبکی کا احساس ہوتا ہے۔ممکن ہے انفرادی طور پر ایسا ہوتا ہو مگر میں سمجھتا ہوں ان سب چیزوں کا تعلق تانیثیت کی تحریک سے کم نفسیات سے زیادہ ہے۔شموئل احمد نے ''عورت اور معاشرہ'' میں عورت اور مرد کے درمیان جنسی نفسیات کے حوالے سے لکیر کھینچنے کی کوشش کی ہے،ان کے مطابق اردو کا سارا تانیثی ادب ناقص ہے،انہیں لگتا ہے کہ پاکستان میں عورت کی آواز لاؤڈ loud ہے مگر چونکہ مرد ہی سماج میں سارے اخلاقی ضابطے ترتیب دیتا ہے لہٰذا اس کی نظر میں عورت ہمیشہ داغدار رہتی ہے۔یہ سب کچھ کسی معاشرے میں ناقص تعلیم وتربیت کے سبب ممکن ہوسکتا ہے مگر موجودہ عہد کے تانیثی ادب میں مجموعی طور پر اس مفروضے کا اطلاق کرنا ٹھیک نہیں بلکہ نامناسب بھی ہے۔

ثالث کے عالمی خواتین نمبر میں کئی خاتون قلم کاروں کی کتابوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے اس سلسلے میں قرۃالعین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' پر ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کا تجزیہ توجہ طلب ہے،ان کے مطابق قرۃ العین حیدر کے یہاں عصری مسائل سے ہی آگاہی کا احساس نہیں ہوتا بلکہ انہیں اپنی ہزار سالہ تہذیبی اور ثقافتی تاریخ سے بھی خصوصی دلچسپی ہے ان کے ناول ''آگ کا دریا'' کے سارے کردار مختلف تہذیبوں کی آویزش

سے تعمیر ہوتے ہیں، چمپا کا نام ہر دور میں بدل جاتا ہے،ڈھائی ہزار سال پہلے وہ ''چمپک'' تھی پھر اسلامی دور میں چمپاوتی ہوگئی اودھ میں جب اس کا تیسرا دور آیا تو وہ چمپا جان ہوگئی اور آخری دور میں چمپا احمد ہوگئی۔اتنے ناموں اور کرداروں کو پہن کر بھی چمپا عورت ہی رہی،اپنے پورے وجود کے ساتھ۔ڈاکٹر محمد جعفر احراری نے اپنے مضمون ''شبلی اور عطیہ'' کے درمیان معاشقے کی وجوہات کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ڈاکٹر صالحہ صدیقی کا مضمون طنز ومزاح کی تاریخ میں خواتین قلم کاروں کا حصہ،اپنے موضوع کے اعتبار سے خاصی تفصیل سے لکھا گیا مضمون ہے اور معلومات میں اضافے کا سبب ہے۔ڈاکٹر عرشی کاشمیری نے خدیجہ مستور کے افسانے ''محاذ سے دور'' کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ انہوں نے (یعنی خدیجہ مستور نے'' اپنے قلم کو تانیثی ادب کے لئے وقف کیا ہے ان کے بے شمار افسانے معاشرتی حقائق اور سماجی موضوعات پر قلم بند ہیں۔انہوں نے عورت اور سماج کے مابین مسائل کو بنیاد بنا کر بے شمار کہانیاں لکھی ہیں،ان کے خاص موضوعات بھوک، افلاس، ناانصافی اور جنسی استحصال اور ظلم وجبر ہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ ان سارے موضوعات کو محض تانیثی ادب سے منسلک کرنا مناسب نہیں کہ یہ سارے مسائل عورتوں کے ہی نہیں مردوں کے بھی ہوسکتے ہیں ہیں۔ڈاکٹر مہناز کوثر نے بانو قدسیہ اور معاصر خواتین افسانہ نگار کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس میں یہ بات واضح کی ہے کہ بانو قدسیہ کے افسانوں کی عورت اپنے بچوں سے بہت والہانہ محبت کرتی ہے۔وہ ممتا کے خالص جذبے سے معمور ہے،میرے خیال سے عورت میں محبت اور ممتا کی یہ صفت اللہ کی طرف سے ودیعت کی ہوئی ہے۔مجھے ڈاکٹر ارشد جمیل کے مضمون میں یہ بات بہت پسند آئی کہ اردو میں گھر آنگن کی شاعری بہت کم رہی ہے عجیب بات ہے کہ شاعر اپنی محبوبہ کو جنگل جنگل صحرا صحرا تلاش تو کرتا رہا مگر کبھی وہ تلاش کرنے وہاں نہیں گیا جہاں وہ پائی جاتی ہے۔یہ سب تسلیم مگر گھر آنگن کی جتنی بھی شاعری ہوئی ہے وہ ہندوستان میں ہی ہوئی ،امریکہ ودیگر مغرب ممالک میں تو اس حوالے سے کی گئی شاعری کی مقدار بہت کم ہے یا ہے ہی نہیں۔

زاہدہ زیدی کی شاعری پر ڈاکٹر نکہت پروین،حمیرا رحمان کی شاعری پر عدیم اللہ ہاشمی،ادا جعفری کی شاعری پر شبیر احمد ڈار پروین شیر کی نسائی آواز پر حارث حمزہ لون،شکیلہ اختر کی افسانہ نگاری پر ڈاکٹر قسیم اختر اور ڈاکٹر افشاں ملک کے افسانے پر ڈاکٹر ریاض توحیدی کے مضامین کا جواز ثالث کے عالمی خواتین نمبر میں بہر حال موجود ہے۔اس مخصوص شمارے میں محمد ریحان کا ایک اہم مضمون پروین شاکر کی مشاعری پر مشتمل ہے جو کئی اعتبار سے توجہ طلب اور قابلِ مطالعہ ہے۔پروین شاکر برِصغیر کی اولین شاعرات میں ہیں جن کے یہاں نسوانی جذبات اور احساسات کا اظہار نہایت فطری اور تخلیقی انداز میں ہوا ہے۔میں محمد ریحان کی اس رائے سے متفق ہوں کہ پروین شاکر کے یہاں ایک الہڑ نوجوان لڑکی سے لے کر شادی شدہ سنجیدہ

عورت کے جذبات واحساسات کی عکاسی نظر آتی ہے۔

ثالث کے اس عالمی خواتین نمبر میں اپنے زمانے کی مشہور مصورہ امرتا شیر گل کے فنِ مصوری پر بھی ایک مضمون شامل ہے جس کا کریڈٹ یقینی طور پر مدیر رسالہ ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کو جاتا ہے کیونکہ اس طرح کے مضامین کی شمولیت ادبی رسائل کی روایات کے منافی ہے۔سکوت سے گویائی تک میں اسماء شکیل نے مہ لقابائی، امتیاز سے لے کر ادا جعفری، کشور ناہید اور پروین شاکر تک کا تذکرہ مختصر انداز میں کیا ہے۔اس کے علاوہ جو مضامین دلچسپ ہیں ان میں بیدی کے افسانوں میں عورت کی نفسیات، ترنم ریاض ایک حقیقت پسند افسانہ نگار، قمر جمالی کا ناول آتش دان۔ایک مطالعہ، ذکیہ مشہدی کی افسانوی جہات، عصمت چغتائی کی فلمی دنیا اور ممتاز شیریں کی افسانوی کائنا تو غیرہ ثالث کے ادبی وقار میں اضافہ کرتے ہیں۔

مجھے خوشی ہے کہ ثالث کے اس تاریخی اور یادگار عالمی خواتین نمبر میں جہاں بہت سارے مضامین شامل ہیں وہیں ۳۰ کے قریب افسانے بھی شامل ہیں، اور ان میں بہت سی نئی افسانہ نگار خواتین شامل ہیں جن کے یہاں تخلیقی امکانات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔اس کے علاوہ جن خواتین نے افسانے کے حوالے سے اپنی مظبوط شناخت حاصل کر لی ہے ان میں نیلم احمد بشیر، نسترن احمد فتیحی، ڈاکٹر صادقہ نواب سحر، رینو بہل، قمر جمالی، ثمینہ سید، سلمہ جیلانی، سبین علی اور فارحہ ارشد وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

نیلم بشیر احمد کا افسانہ خلا'' امریکہ میں رہائش پزیر ایک ایسے امیر خاندان کے ارد گرد گھومتا ہے جو مغرب میں ہوتے ہوئے بھی مشرقی تہذیب وتمدن اور اسلامی اقدار کے مطابق زندگی گزارتا ہے اور بہت دیندار بھی ہے، مگر ان کا اکلوتا لڑکا امریکی معاشرے میں رچا بسا ہوا ہے، اور ایک دن سیاہ نیگرو لڑکی کو گھر لے کر آجاتا ہے، پہلے تو عمران کے والدین بہت اپ سیٹ ہوتے ہیں پھر بعد میں اس نیگرو لڑکی مینڈی کو اپنی بہو بنانے پر راضی ہوجاتے ہیں یہ سوچ کر کہ اسے اسلامی اقدار سے روشناس کر کے اپنی فیملی کا حصہ بنائیں گے، مینڈی کا نام منزہ رکھ کر اسے اپنے معاشرے میں شامل تو کر لیتے ہیں اور اس سے پیدا ہونے والے بچے کا نام رحمان بھی سوچ لیتے ہیں مگر منزہ ایک بیٹی کو جنم دیتی ہے، اور جب اس کی چادر اٹھا کر فضیلہ اس کی صورت دیکھتی ہے تو ایک طرح کا کرنٹ لگتا ہے انہیں اور ایسا لگتا ہے جیسے انہوں نے اتنی بدصورت لڑکی کبھی نہیں دیکھی۔اس افسانے میں مشرق اور مغرب کے تہذیبی تصادم کو ہی نہیں بلکہ دونوں تہذیبوں کے درمیان نفسیاتی فرق کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

نسترن احسن فتیحی کی کہانی ''عجیب عورتیں'' دراصل ان عورتوں کی کہانی ہے جن کے اندر ناموافق اور نامساعد حالات کے باوجود مزحمت کا حوصلہ ہے، ن کی کہانی خواب سے شروع ہو کر حقیقی صورتِ

حال تک کا سفر ہے اور احتجاج کے نئے موسموں تک پھیلا ہوا ہے انہیں احساس ہے کہ حقیقت اور خواب جب آپس میں خلط ملط ہو جائیں تو جینا مشکل ہو جاتا ہے اور خواب سے حقیقت تک ایک بے یقین دھند بھر جاتی ہے۔مگر صفورہ زرگر سے ان کا سروکار نئی امید کا استعارہ ہے۔

صادقہ نواب سحر کی کہانی ''بوڑھی پڑوسن کا موبائل'' اپنے کرافٹ، بیانیہ اور اختتام کے سبب متاثر کرتی ہے۔ترقی یافتہ اور خوش حال بیٹوں کے ذریعہ اپنے والدین بلکہ اس کہانی میں والدہ سے برتی جانے والی بے اعتنائی، اور جنریشن گیپ کی بدترین صورت اس کہانی میں نظر آتی ہے۔مجھے لگتا ہے کہ ہم موجودہ عہد میں اپنی سماجی قدروں اور تہذیبی وراثتوں سے کٹ کر اندھیری دھند میں گم ہوتے چلے جارہے ہیں۔صادقہ نواب سحر کی یہ کہانی اپنے قاری سے فوری رابطہ قائم کر لیتی ہے اور سنجیدہ مطالعے کی خواہش مند ہے۔اس کے علاوہ رینو بہل (دو نیناں)، انجم قدوائی (گنگا بہتی کیوں ہو)، قمر جمالی (فاتحِ عالم)، ثمینہ سید (محبوبہ)، فریدہ انصاری (بے بی اماں) وغیرہ افسانے بھی ہماری موجودہ سماجی اور تہذیبی پس منظر میں لکھے گئے ہیں اور اپنے بیانیہ اور کرافٹ کے سبب قابلِ مطالعہ ٹھہرتے ہیں۔مجموعی اعتبار سے دیکھیں تو ثالث کا یہ شمارہ جو عالمی خواتین کی تخلیقی اور ادبی کاوشات پر مشتمل ہے، نسائی ادب پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔اسی ضخیم نمبر میں نئی اور نو وارد خواتین افسانہ نگاروں کے افسانے بھی شامل ہیں جو دلچسپی سے پڑھے جانے لائق ہیں، طوالت کے سبب ان پر فرداً فرداً اظہارِ خیال سے گریز کیا گیا ہے، امید ہے ثالث کے قارئین ان کی حوصلہ افزائی کریں گے۔

منظوم حصہ میں جن خواتین تخلیق کاروں کی نگارشات شامل ہیں ان میں دیا جیم، حیا غزل، رضیہ حیدر خان اور فرحین چودھری وغیرہ کی غزلیں اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں، حسبِ معمول ثالث میں شامل شاعری کا تناسب کم ہے، اور اس مخصوص نمبر کی ضخامت کے مقابلے بہت قلیل ہے۔موجودہ عہد میں اردو ادب کے گم ہوتے ہوئے قارئین کے بحران کے باوجود اس تاریخی اور یادگار عالمی خواتین نمبر کے لئے میں ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کو مبارک بعد پیش کرتا ہوں اس امید کے ساتھ کہ وہ آئندہ بھی خصوصی نمبروں کی اشاعت میں دلچسپی لیتے رہیں گے۔نیک خواہشات کے ساتھ!

HIG-3 Anand Nagar. Adhartal Jabalpur (M.P) 482004
Mob 7070135643

◀◀ ● ▶▶

● ڈاکٹر منصور خوشتر

مونگیر کی سرزمین سے شائع ہونے والا رسالہ ''ثالث'' شمارہ ۱۶۔۱۵ر کے مدیر ثالث آفاق صالح اور مدیر اعزازی ڈاکٹر اقبال حسن آزاد ہیں۔ یہ رسالہ عالمی خواتین نمبر ہے جو زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان ہے۔ ۴۹۶ر صفحات پر محیط یہ رسالہ اپنے اندر اتنے مواد سموئے ہوئے ہے کہ دستاویزی حیثیت کا حامل ہو گیا ہے۔ اداریہ اقبال حسن آزاد نے تحریر کیا ہے جس میں انہوں نے کئی اہم باتیں پیش کرنے کی کوشش کی ہیں۔ ڈاکٹر افشاں ملک نے اردو کا نسائی ادب پر ایک جائزہ پیش کیا ہے۔ حمد اور نعت سے اس رسالہ کو شمسہ نجم اور فوزیہ اختر ردا نے سجایا ہے۔ اسرار الحق مجاز نے نوجوان خواتین کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے۔ غزلیں، نظمیں، منی نظمیں، انٹرویو اور تانیثیت کے عنوان سے اس رسالہ کی اہمیت میں چار چاند لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔

رسالہ ''ثالث'' کئی اہم مضامین سے مزین ہے۔ ان میں چند اہم مضامین ''بولیں امام محمد علی کی (شکور پٹھان)، قرۃ العین حیدر اور آگ کا دریا (ڈاکٹر اقبال حسن آزاد)، قرۃ العین حیدر تہذیب و تاریخ کی داستان (ڈاکٹر سید احمد قادری)، شبلی اور عطیہ فیضی (ڈاکٹر محمد جعفر احراری) خدیجہ مستور کا افسانہ ''محاذ سے دور'' ایک جائزہ (ڈاکٹر عرش کاشمیری)، بانو قدسیہ اور معاصر خواتین افسانہ نگار (ڈاکٹر مہناز کوثر)، ظفر کمالی کے تحقیقی تبصرے (ڈاکٹر افشاں بانو)، شکیلہ اختر کی افسانہ نگاری (ڈاکٹر قسیم اختر)، چوتھی کا جوڑا اور غریب طبقے کی عکاسی (ڈاکٹر توصیف مجیدلون)، ادا جعفری کی ابتدائی دس غزلوں کا عروضی جائزہ (شبیر احمد ڈار)، پروین شیر.....ایک نئی نسائی آواز (حارث حمزہ لون)، پروین شاکر کی غزلیہ شاعری (محمد ریحان)، بیدی کے افسانوں میں عورتوں کی نفسیات (فرزانہ)، ذکیہ مشہدی کی افسانوی جہت (ریحانہ بشیر)، عصمت چغتائی کی فلمی دنیا (شبیر احمد لون)، ممتاز شیریں کی افسانوی کائنات (عروسہ فاروق) وغیرہ ہیں۔

رسالہ میں افسانوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ تمام افسانے انسانیت کو پیغام دینے والے ہیں۔ نیلم احمد بشیر، نسترن احسن فتیحی، ڈاکٹر صادقہ نواب سحر، رینو بہل، انجم قدوائی، قمر جمالی، ثمینہ سید، فریدہ انصاری، سلمیٰ جیلانی، سبین علی، شاہین کاظمی، فارحہ ارشد، مونا شہزاد گل ارباب، فرحین جمال، صائمہ نفیس، نوشابہ خاتون، سرفراز جہاں، صفیہ شاہد، روبینہ فیصل، نشاط پروین، فرحین خالد، ناہید طاہر، صوفیہ کاشف، صبیحہ تزئین، فرزانہ روحی اسلم، ابصار فاطمہ، فاطمہ عثمان زاہد اور نشاط پروین کے افسانے رسالہ کی معنویت میں چار چاند لگاتے ہیں۔

رسالہ کے آخر میں چند اہم کتابوں مثلاً جنگل کی آواز نجمہ (محمود)، روح دیکھی ہے کبھی (ہما فلک)، رعنائیاں درد کی (عثمانہ اختر جال) پر خوبصورت اور جامع تبصرے سلمیٰ حجاب، اقبال حسن آزاد،

اور ڈاکٹر ایم اے جوہر نے تحریر کیا ہے۔

خطوط کا ایک طویل سلسلہ جس میں چند نامور ہستیوں کے خطوط شامل ہیں۔ ان ہستیوں میں رینو بہل، ڈاکٹر ریاض توحیدی، عشرت ظہیر عزہ معین، سلیم انصاری، وسیم احمد فدا اور سریش کمار کے خطوط لائق توجہ ہیں۔

اس طرح یہ رسالہ واقعی دستاویزی حیثیت کا حامل نظر آتا ہے۔ اس کی اشاعت پر ڈاکٹر اقبال حسن آزاد مبارک باد کے مستحق ہیں۔

Editor Darbhanga Times, Darbhanga
Mob : 9234772764

◄◄ ● ►►

● ڈاکٹر شاھد جمیل

''ثالث'' (جنوری تا دسمبر، 2020) کا دستاویزی ''عالمی خواتین نمبر'' رجسٹرڈ ڈاک سے موصول ہوا، جس کی رسید بروقت مع مبارکباد موبائل پر دے چکا ہوں۔

طائرانہ نگاہ ڈال کر تاثرات پیش کرنا مجھے پسند نہیں، تاخیر کا یہی سبب ہے۔ دوسری بات یہ کہ ضخیم نمبر کو مکمل پڑھ کر اظہارِ خیال کرنا بھی ایسا ہوگا کہ بچے کی پیدائش کی مبارکباد، اس کی رسم بسم اللہ پر دی جائے۔ لہٰذا چند تخلیقات پڑھ کر اپنے تاثرات احباب کی نذر کر رہا ہوں کہ اس مثالی نمبر پر اظہارِ خیال نہ کرنا بھی ادبی بد دیانتی ہوگی۔ پہلا طویل تاثرات پوسٹ کرتے وقت موبائل ہینگ کر گیا تھا اور تاثرات کرونا مریض کی طرح راہی عدم ہو گیا۔ گردابِ صدمہ سے نکلنے میں دس دن لگ گئے۔ کبھی کبھی نقشِ اوّل ہمیشہ اوّل ہی رہتا ہے، جس کی جدائی کا ملال کسک پیدا کرتا رہتا ہے۔

صاحبِ اُسلوب افسانہ نگار، منفرد شاعر اور مثالی مدیر، ڈاکٹر اقبال حسن آزاد مع جملہ معاونین اور تخلیق کاروں کو سب سے پہلے تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اظہارِ تاسف بھی کہ میں بہتی گنگا میں ڈبکی نہیں لگا سکا۔ بہ الفاظِ دیگر اِس نمبر میں جگہ نہیں لے سکا۔

خصوصی گوشہ نکالنے کی ''ثالث'' کی روشن اور قابلِ تقلید روایت رہی ہے۔ اِسی سبب ''ثالث'' کی پذیرائی عالمی سطح پر ہوتی ہے اور اس کے تخلیق کاروں اور قارئین کی تعداد بھی قابلِ رشک ہے۔

عالمی مہلک وبا کرونا نے زندگی کے تمام تر پہلوؤں کو اپنے خوفناک خونی حصار میں لے رکھا ہے۔ لاک ڈاؤن، تعطیل و تعطل اور اموات کی سونامی کے عہد میں بھی شمعِ زبان و ادب اردو کو جلائے رکھنا کارِ سہل نہیں، بلکہ یہ عمل برہنہ پا ہمالیہ کی چوٹی پر علمِ فتح لہرانے جیسا ہے۔ ہمارے لئے یہ قابلِ فخر ہے کہ ہندوستان کے صوبہ بہار کے ضلع مونگیر کا ایک 'مردِ آہنگ و آزاد' یعنی اقبال حسن آزاد نے ایک تاریخی و

دستاویزی نمبر شائع کر کے کتابی سلسلہ کی روایت میں ایک تاریخ رقم کر دیا ہے۔ بہترین تخلیقات سے مزّین و لبریز 496 صفحات پر محیط دیدہ زیب سرورق کے ''عالمی خواتین نمبر'' کی عالمی سطح پر خوب خوب پذیرائی ہو رہی ہے اور ہونی بھی چاہئے۔ ایک مدیر کے لیے یہی زادِ راہ ہے۔

احباب کے لیے میں نے اس نمبر کی فہرست، قلمکاروں کی تصاویر اور پہلا صفحہ شامل کر دیا ہے۔

اب میں محدود مطالعے کی روشنی میں مختصر ترین تاثرات پیش کرتا ہوں۔

''اداریہ'' مختصر اور جامع ہے، جس میں عورت کی صفاتِ عالیہ کا بہترین اعتراف ہے۔ ملاحظہ کیجئے ''عورت کیا ہے؟ عورت وہ ہے جس کے ساتھ رب اپنی محبت کو ملا رہا ہے..... اُس ذات نے خود کی محبت کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ انسان سے کتنی محبت کرتا ہے تو اس نے ماں کا نام لیا کہ وہ ستّر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ جب کہ ماں ایک عورت ہے۔ بیٹی کو اللہ نے اپنی رحمت قرار دیا جب کہ بیٹی بھی ایک عورت ہے۔ عورت ہی وہ ہستی ہے جس کے قدموں تلے جنت رکھ دی گئی بس اسی بات سے ہی تو عورت کی شان کا اندازہ لگا لیں..... ہمارے گھروں کا وجود عورتوں سے ہے۔ گھر مرد نہیں بساتے پُتر، عورتیں بساتی ہیں۔ گھر کی رونقیں عورتوں کے توسط سے ہوتی ہے بیٹا..... عورت بہت پیاری چیز ہے۔ عورت بیٹی ہے تو رب کی رحمت ہے۔ ماں ہے تو قدموں تلے جنّت لیے پھرتی ہے۔''

یہ نمبر انھی عظمتوں کا عملی اعتراف اور بہترین خراجِ عقیدت ہے۔ نیز موصوف نے ''عالمی خواتین نمبر'' کی اشاعت کا جواز بھی پیش کیا ہے۔

اس نمبر کی ایک بڑی اور قابلِ داد خصوصیت یہ بھی ہے کہ اردو ادب کی معروف و معتبر افسانہ نگار، ناقد و محقق، ڈاکٹر افشاں ملک کو مہمان مدیر کا اعزاز بخشا گیا ہے۔ افشاں ملک، خواتین قلمکاروں میں ایک معتبر و فعال تخلیق کار اور محبوب و پسندیدہ ادبی شخصیت بھی ہیں۔ موصوفہ کا 'مہمان اداریہ' بعنوان 'اردو کا نسائی ادب : ایک جائزہ' ایک مختصر اور جامع تحقیقی و تنقیدی مقالہ ہے، جس میں 'اداریہ' کا فلیور نہیں۔ بہتر یہ ہوتا کہ وہ ایک دو صفحے کا اداریہ رقم کرتیں اور مدیر اس مقالے کو مضمون کے کالم میں شامل کر لیتے۔ قارئین بھی اِس بات سے متفق ہوں گے کہ یہ مقالہ قابلِ مطالعہ اور داد و تحسین کا حقدار ہے۔ موصوفہ نے جہاں تک ممکن ہو سکا، ہم عصر تخلیق کاروں کو اِس میں جگہ دی ہے اور اردو شاعری، نعت نگاری، ناول نگاری، افسانہ نگاری، ڈراما نگاری، تحقیق و تنقید نگاری، سفر نامہ نویسی اور خود نوشت نگاری میں شامل تقریباً قابلِ ذکر خواتین تخلیق کاروں کو احاطۂ تحریر میں لیا ہے۔ اس مقالے کا تمہیدی حصہ بطور خاص مجھے پسند آیا۔ یہ مقالہ ریسرچ اسکالروں کے لیے مفید ہے۔

مرد اور عورت یکجا ہوں تو مقصدِ تخلیقِ کائناتِ الٰہی کی تکمیل ہوتی ہے، اِس کے باوجود نہ جانے کیوں میرے دل کی یہ صدا ہے کہ اگر اِس نمبر میں صرف خواتین قلمکاروں کی تخلیقات شامل ہوتیں، فرمائشی مضامین یکجا کیے جاتے اور کم سے کم سرورق پر جلوہ افروز افسانہ نگاروں کہ ایک ایک لازوال افسانے شامل کر لئے جاتے۔ تب اس نمبر کی افادیت بہت بڑھ جاتی اور اِس میں مزید چار چاند لگ جاتے۔

مضامین میں نسترن احمد فتیحی، مشتاق احمد نوری، شموئل احمد، ڈاکٹر سید احمد قادری، ڈاکٹر اقبال حسن آزاد، ڈاکٹر منظر اعجاز، ڈاکٹر قسیم اختر، صدف اقبال اور ڈاکٹر صالحہ صدیقی کے مضامین کو پڑھ پایا، جو داد طلب ہیں۔ فیس بک پوسٹ تفصیلی گفتگو کا متحمل نہیں۔ ظاہر ہے، تجزئے میں اِس تشنگی کو دور کیا جا سکتا ہے، جس کے لیے لازم ہے کہ سبھی کا مطالعہ کیا جائے۔

افسانوں میں نیلم احمد بشیر کا افسانہ 'خلا' نسترن احمد فتیحی کا ''یہ عجیب عورتیں''، ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کا ''بوڑھی پڑوسن کا موبائل''، رینو بہل کا ''دو نیناں'' اور انجم قدوائی کا افسانہ ''گنگا بہتی کیوں نہیں؟'' پڑھ سکا۔ سبھی افسانوں کا شمار بہترین افسانوں میں کیا جائے گا۔ اِن میں نیلم احمد بشیر کا افسانہ چھوٹے کینواس پر بڑی کہانی ہے، جو نمبرون کی مستحق ہے۔

فکشن کے سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ زمانے کے ساتھ ساتھ ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے اپنے عہد کی بھرپور آئینہ دار بھی ہو۔ کردار شناسا اور اُن کے مکالمے سیرت ساز ہوں۔ پلاٹ سازی کی ہنر مندی سرخوشی بخشے اور اُسلوب مغل گارڈن سا جاذبِ توجہ ہو اور اختتام ایسا کہ دعوتِ غور و فکر کے ساتھ خواہش کی مٹّھی میں یہ احساس تھما جائے کہ کاش! افسانہ نگار کی تخلیق کردہ اِس دنیا کی سیر کچھ دیر اور کرتے۔ ایک اہم بات اور، وہ یہ کہ افسانے کا بین السطور نئی نئی دریافت کی بازیافت کے حظ و سرور سے سرشار کر دے۔

مذکورہ سبھی افسانے ان خوبیوں سے متصف ہیں۔ لہٰذا یہ کہنے میں مجھے کوئی جھجک نہیں کہ عہدِ حاضر کی بیشتر فکشن نگار اردو فکشن کے قابلِ فخر ذخیرے میں قابلِ داد اضافہ کر رہی ہیں۔

جن تخلیقات کو پڑھ نہیں سکا، اُن کے تخلیق کار سے معذرت خواہ ہوں۔ لیکن مجھے مدیر کے حسنِ انتخاب پر مکمل بھروسہ ہے۔

یہ نمبر نہ صرف قابلِ مطالعہ اور ریسرچ سکالروں کے لیے مفید و راہنما ہے بلکہ اِسے پڑھ کر محفوظ رکھنے کی شدید خواہش بھی ہوگی کہ یہ مانند شراب ہے، جو گزرتے وقت کے ساتھ اپنی قدر و قیمت میں خود اضافہ کرتا رہے گا۔

اِس خصوصی نمبر کی قیمت پانچ سو روپئے اور عام شمارہ کی قیمت دو سو روپئے مع ڈاک خرچ ہے۔

''عالمی خواتین نمبر'' کے سبھی تخلیق کاروں، مدیران اور جاذبِ نظر سرورق ساز، محمد نعیم یاد، پاکستان کو ایک بار اور بہت بہت مبارکباد!

Mohiuddin Enclave, First Floor, Flat No.789
Near Masjid , New Patliputra Colony
Patna.800013
Mob. No. 94305 59161

◀◀ ● ▶▶

● پروفیسر محمد ظفرالدین

''ثالث'' مونگیر، بہار سے شائع ہونے والا ایک کتابی سلسلہ ہے جسے بجا طور پر ''زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان'' قرار دیا جا سکتا ہے۔ اِس کا مشترکہ شمارہ نمبر 16-15 پیشِ نظر ہے جو 'عالمی خواتین نمبر' کی حیثیت سے منظرِ عام پر آیا ہے۔ 496 صفحات پر مشتمل یہ ضخیم نمبر معاصر خواتین ادب کی بہترین نمائندگی کرتا ہے۔ ثالث کے مدیر اعزازی جناب اقبال حسن آزاد اِس خصوصی نمبر کی اشاعت کا پس منظر بیان کرتے ہوئے اداریے میں لکھتے ہیں:

''جب رسالے کا اعلان ہوا تو بڑی تعداد میں خواتین قلم کاروں کی تخلیقات موصول ہونے لگیں۔ یہ دیکھ کر خیال آیا کہ کیوں نہ اس دفعہ خواتین پر ہی گوشہ نکال دیا جائے لیکن جب رسالے کی ترتیب شروع کی گئی تو اندازہ ہوا کہ خواتین کا پلڑا کچھ زیادہ ہی بھاری ہو گیا ہے۔ لہٰذا پہلے 'خواتین نمبر' ہوا پھر 'عالمی خواتین نمبر' میں تبدیل ہو گیا۔ اس شمارے کو پڑھ کر قارئین کو اندازہ ہوگا کہ آج کل خواتین عالمی پیمانے پر کس طرح اُردو زبان و ادب کی خدمات انجام دے رہی ہیں۔''

یہ حقیقت ہے کہ زیرِ نظر شمارہ دیکھنے کے بعد سمجھ میں آتا ہے کہ خواتین قلم کار کس حد تک سرگرم اور فعال طریقے سے لکھنے میں مصروف ہیں۔ ڈاکٹر افشاں ملک نے 'اُردو کا نسائی ادب' کے عنوان سے مہمان اداریہ تحریر کیا جس میں اُنہوں نے بہت سلیقے سے ثابت کیا ہے کہ:

''رفتہ رفتہ جب علم و تعلم کے دروازے عورتوں پر وا ہوئے اور ان کا رشتہ کاغذ قلم سے استوار ہوا، انہیں تخلیقی اظہار کا سلیقہ بھی آ گیا۔ خواتین کی اس ابتدائی دور کی تخلیقات میں گھر آنگن کے معاملات اور ذاتی دکھ سکھ کے ساتھ ہی ہندوستانی تہذیب و تمدن کے رنگ بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ 'نسائی ادب' کی صدیوں پر محیط ایک مکمل تاریخ ہے اور اس کی سماجی، لسانی، ادبی، تاریخی اور تہذیبی حیثیت مسلم ہے۔''

اعزازی اور مہمان مدیران کے بیان کی توثیق خواتین نمبر کے مشمولات سے ہوتی ہے۔ اس میں

تانیثیت اور خواتین قلم کاروں کی خدمات پر چالیس سے زائد تحریریں ہیں۔ گرچہ لکھنے والوں میں مشتاق احمد نوری، شموئل احمد، ریاض احمد، شکور پٹھان، ڈاکٹر منظر اعجاز، ڈاکٹر اقبال حسن آزاد، ڈاکٹر سید احمد قادری وغیرہ بھی شامل ہیں لیکن بیشتر نمائندگی خواتین ناقدین کی ہے۔ مشمولات کی ترتیب ایک مکمل کتاب کے انداز میں ہے مثلاً حمد، نعت کے بعد مجاز کی نظم ''نوجوان خاتون سے'' شامل کی گئی ہے۔ اس کے بعد غزلیں، ایک ہندی نظم کا ترجمہ، انٹرویو اور پھر مضامین کا سلسلۂ دراز۔ اس کے بعد 32 افسانے شامل کیے گئے ہیں جو صرف خواتین کے نوکِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ افسانہ نگاروں میں چند نام یہ ہیں: نجمہ محمود، نیلم احمد بشیر، نسترن احسن فتیحی، ڈاکٹر صادقہ نواب سحر، رینو بہل، انجم قدوائی، قمر جمالی، ثمینہ سید، فریدہ انصاری اور سلمیٰ جیلانی وغیرہ۔ جناب اقبال حسن آزاد ثالث اس یادگار نمبر کی اشاعت پر مبارکباد کا مستحق ہیں۔ اس رسالے کی قیمت 500 روپے رکھی گئی ہے جبکہ ثالث کے شمارے www.salismagazine.in پر پڑھے اور ڈاؤن لوڈ کیے جا سکتے ہیں۔

Editor,Adab - o -Saqafat,Gachi Bowli,Hyderabad(Telengana)
93476 90095

◀◀ ● ▶▶

● ڈاکٹر احسان عالم

اردو جرنل ''ثالث'' کا عالمی خواتین نمبر مجھے 18 ستمبر 2020 کو دستیاب ہوا۔

''ثالث'' شمارہ ۱۶-۱۵، جنوری تا دسمبر عالمی خواتین نمبر ہے۔ اس کے مدیر ثالث آفاق صالح اور مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد ہیں۔ یہ یو جی سی ایپروڈ جرنل (UGC Approved Journal) ہے۔ ۴۹۶ صفحات پر محیط یہ رسالہ عالمی خواتین نمبر کی حیثیت سے کافی اہم ہے۔ اقبال حسن آزاد نے ''عالمی خواتین نمبر'' پر اپنا اداریہ قلم بند کیا ہے۔ اس میں انہوں اردو ادب میں خواتین کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ موضوع تانیثیت کے تحت ''تانیثیت۔ ایک نظریہ، تانیثیت کیا ہے؟ عورت اور معاشرہ، اردو ادب میں تانیثیت'' عنوان سے نسترن احسن فتیحی، مشتاق احمد نوری، شموئل احمد اور ریاض احمد نے اچھے مضامین تحریر کئے ہیں۔

مضامین کی طویل فہرست ہے جس میں ''نوشابہ خاتون کی افسانہ نگاری، قرۃ العین حیدر اور آگ کا دریا، شبلی اور عطیہ فیضی، خدیجہ مستور کا افسانہ ''محاذ سے دور'' ایک جائزہ، بانو قدسیہ اور معاصر خواتین افسانہ نگار، ظفر کمالی کے تحقیقی تبصرے، شکیلہ اختر کی افسانہ نگاری، ڈاکٹر افشاں ملک کا افسانہ ''سمندر جہاز اور میں، پروین شیر: ایک نئی نسائی آواز، پروین شاکر کی غزلیہ شاعری، ترنم ریاض کی تخلیاتی تکثیریت، ذکیہ مشہدی کی افسانوی جہت، عصمت چغتائی کی فلمی دنیا، ممتاز شیریں کی افسانوی کائنات'' پر مدلل روشنی ڈالی ہے۔ مضمون

نگاروں نے اپنے اپنے منفرد انداز میں ان خواتین قلمکاروں کے فن کا جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

خواتین افسانہ نگاروں کی بھی کمی نہیں رہی ہے۔اس جرنل میں کئی اہم خواتین افسانہ نگاروں کے افسانے درج ہیں جن میں ''یہ عجیب عورتیں (نسترن احسن فتیحی)، خلا (نیلم احمد بشیر)، بوڑھی پروسن کا موبائل (ڈاکٹر صادقہ نواب سحر)، دو نیناں (رینو بہل)، گنگا بہتی کیوں ہو؟ (انجم قدوائی)، فاتح عالم (قمر جمالی)، محبوبہ (ثمینہ سید)، بے بی اماں (فریدہ انصاری)، رشتوں کی دیمک (سلمیٰ جیلانی)، سلیمون فش (شبین علی)، آدھی خودکشی (فارحہ ارشد)، طوائف کہانی (مونا شہزاد)، ادھوری عورت (گل ارباب)، اعتراف (قرۃ العین حیدر راٹھور)، انجام (فرحین جمال)، پانچویں بوتل (صائمہ نفیس)، بکھیرو (نوشابہ خاتون)، آشواسن (سرفراز جہاں)، نیلا پردہ گلابی کناری (صفیہ شاہد)، خصوصی اجازت نامہ (روبینہ فیصل)، واپسی (نشاط پروین)، شکستہ خواب (فرحین خالد)، گڑیا میلی ہوجائے گی (صبیحہ تزئین)، زخمی پرندہ (شوبی زہرا نقوی) بہترین افسانے ہیں۔

ان مشمولات کے علاوہ کتابوں پر تبصرے اور مکتوبات ہیں۔ یہاں چند اہم مضامین کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ملاحظہ کریں:

ڈاکٹر منظر اعجاز نے ''نوشابہ خاتون کی افسانہ نگاری ''خلیج'' کی روشنی میں'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔نوشابہ خاتون خواتین افسانہ نگاروں میں ایک نمایاں نام ہے۔اس کے افسانے ہندوستان کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کی شروعات منفرد انداز میں کرتی ہیں۔ان کے طویل اور مختصر دونوں افسانوں میں بیانیہ سادہ اور سلیس ہوا کرتا ہے۔کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی جو زیادہ تر افسانہ نگاروں کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

جرنل کے مدیر اعزازی ڈاکٹر اقبال حسن آزاد نے ''قرۃ العین حیدر اور ''آگ کا دریا'' کے عنوان سے ایک جامع مضمون تحریر کیا ہے۔اپنے مضمون میں وہ قرۃ العین حیدر کی شخصیت سے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''قرۃ العین حیدر بچپن ہی سے نہایت زیرک اور حساس تھیں۔ان کی ذہانت و فطانت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ جس عمر میں لڑکیاں گڈے گڑیا کا بیاہ رچاتی ہیں، انہوں نے کہانیوں سے کھیلنا شروع کردیا تھا۔اس وقت ان کی عمر گیارہ سال تھی اور پھر محض انیس سال کی عمر میں ایک کامیاب ناول ''میرے بھی صنم خانے'' پیش کردیا۔اس کے بعد انہوں نے قلم کو ہی اپنا رفیق حیات بنالیا۔ زندگی بھی کنواری رہنے والی اس ادیبہ نے اردو ادب کو ایسے ایسے لعل و گہر سے نوازا ہے جن کی چمک چمک سے آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں۔''

''خدیجہ مستور کا افسانہ 'محاذ سے دور'۔ایک جائزہ'' کے عنوان سے ڈاکٹر عرش کاشمیری نے ایک پُرمغز مضمون لکھا ہے۔خدیجہ مستور بھی اردو ادب کی ایک فعال مصنفہ کا نام ہے۔انہوں نے بے شمار بہترین افسانے لکھے۔وہ افسانہ نگاروں کی ایسی ٹولی میں شامل ہیں جنہوں نے اپنے قلم کو تانیثی ادب کے لئے وقف کیا ہے۔ان کے بے شمار افسانے معاشرتی حقائق اور سماجی موضوعات پر قلم بند ہیں۔افسانہ ''محاذ سے دور'' خدیجہ مستور کی ایک اہم تخلیق ہے۔اس افسانے میں انہوں نے عورت کے سماجی مسائل کو بیان کیا ہے۔ افسانے میں کئی نسوانی کردار موجود ہیں جو اپنی منفرد نفسیات کے ساتھ کہانے میں ابھرتے ہیں۔

''بانو قدسیہ اور معاصر خواتین افسانہ نگار'' کے عنوان سے ڈاکٹر مہناز کوثر کا ایک مضمون اس رسالہ میں شامل ہے۔ڈاکٹر مہناز کوثر لکھتی ہیں کہ بانو قدسیہ کی معاصر افسانہ نگار خواتین میں نیلم احمد بشیر، نیلوفر اقبال اور زاہدہ حنا وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔نیلم احمد بشیر کے یہاں ہمیں جس عورت کا خاکہ ملتا ہے وہ امریکہ پلٹ یا امریکی معاشرہ کے تقلید میں پروان چڑھنے والی عورت کا ہے۔ بانو قدسیہ کے تمام افسانے مشرق کی دھرتی سے پھوٹتے ہیں یعنی بانو اپنے افسانوں کا خمیر مشرق میں ہی تیار کرتی ہیں۔

ڈاکٹر نکہت پروین کا ایک مضمون ''زاہدہ زیدی کی شاعری کے چند امتیازی پہلو'' کے عنوان سے ہے۔اس میں وہ زاہدہ زیدی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتی ہیں:

''زاہدہ زیدی اردو شاعرات کی اس نسل سے تعلق رکھتی ہیں جس نے ترقی پسند تحریک کے آغاز سے پہلے آنکھیں کھولیں اور ان کی حقیقی تربیت جدید ادب کے فنکاروں کے ساتھ ہوئی۔ شفیق فاطمہ شعریٰ اور ادا جعفری سے نکل کر اردو کی نئی خاتون شاعرات جن نئے کوچوں میں پہنچی، ان میں زیدی بہنوں کی اولیت سب کو معلوم ہے۔ساجدہ زیدی اور زاہدہ زیدی نے اردو شاعرات کی موضوعاتی، علمی اور فکری تربیت نہ کی ہوتی تو شاید ہی یہ ممکن ہوتا کہ ان کے ٹھیک بعد کی نسل میں فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، زہرہ نگاہ، پروین شاکر، شبنم عابدی وغیرہ کی نسل سامنے آتی۔اس اعتبار سے زاہدہ زیدی کو اردو شاعرات کی نئی نسل کی تربیت کرنے والی فنکارہ کی حیثیت سے پہچانا جانا چاہئے۔''

''شکیلہ اختر کی افسانہ نگاری'' ڈاکٹر قسیم اختر کے قلم کی اپج ہے۔ یہ وہی شکیلہ اختر ہیں جن کے تخلیقی صلاحیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے احمد حسین آزاد نے لکھا ہے:

''ان کے بیشتر افسانے عورتوں کی نفسیات کے آئینہ دار ہیں۔ان کے افسانوں میں بہار کے متوسط مسلم گھرانوں کی ایسی تصویریں ملتی ہیں جن کے چہروں پر مسرت کے مٹے مٹے آثار نظر آتے ہیں۔قصہ پن کی دلچسپی کے ساتھ، ان کی کہانیوں کے پلاٹ سیدھے سادے، کردار جانے پہچانے اور مکالمے سلیس ہوتے ہیں۔''

حارث حمزہ لون ''پروین شیر۔ایک نئی نسائی آواز'' کے عنوان سے تحریر کرتی ہیں کہ پروین شیر ان معدودے چند فنکاروں میں ہیں جن کے فنی و تخلیقی امتیازات کا دائرہ بیک وقت شاعری، مصوری اور موسیقی تک پھیلا ہوا ہے۔ پروین شیر دراصل انسانیت کی علمبردار ہیں۔ وہ انسانی زندگی کی فلاح و بہبود کے خواہاں ہیں۔ان کے سینے میں ایک دردمند دل دھڑکتا ہے۔ان کی شاعری کا کینوس اس وقت اور خوبصورت نظر آتا ہے جب وہ بے زبان مظلوم و نادر انسانوں کے احوال کے لئے پیلے اور زرد رنگوں کو اظہار کا ذریعہ بناتی ہیں اور الفاظ کے انتخاب میں ذہانت سے کام لیتی ہیں۔

''پروین شاکر کی غزلیہ شاعری: ایک مختصر جائزہ'' کے عنوان سے محمد ریحان نے قلم فرسائی کی ہے۔ پروین شاکر غزلیہ شاعری کا ایک بڑا نام ہے۔محمد ریحان ان کی شاعری پر لکھتے ہیں:

''پروین شاکر نے اردو شاعری کو ایک منفرد لب ولہجہ اور احساس عطا کیا۔ان کی شاعری اپنے عہد کی خوبصورت آئینہ اور ماضی کی روایت کا تسلسل ہے۔ پروین شاکر کی شاعری کا سب سے اہم حوالہ محبت اور نسوانی جذبات واحساسات کی عکاسی ہے۔وہ اپنی شاعری میں ایک مکمل نسائی حیثیت کی تشکیل کرتی نظر آتی ہیں۔''

معروف ادیبہ صدف اقبال نے ''مولانا آزاد اور مسلمان عورت'' کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیا ہے۔مولانا آزاد کے تعلق سے وہ لکھتی ہیں کہ مولانا آزاد نے چونکہ عورتوں کے تعلق سے براہ راست کوئی نظریہ پیش نہیں کیا اور ایک کتاب کے ترجمہ سے اپنے خیالات کی ترجمانی کی ہے اس لیے ہم حق بجانب ہیں کہ مولانا کی فکر کے اس پہلو کو جس کا تعلق عورتوں کے سماجی، سیاسی اور اخلاقی پہلو سے ہے اس کتاب کی روشنی میں دیکھیں۔اس کتاب میں کئی اہم سوالات پیش کئے گئے ہیں۔عورت کیا ہے؟ عورت کے قدرتی فرائض کیا ہیں؟ کیا مرد اور عورت جسمانی طاقت میں مساوی ہیں؟ کیا عورتیں عملی دنیا میں مردوں کے ساتھ شریک ہوسکتی ہیں؟ کیا عورت کو مردوں سے پردہ کرنا چاہئے؟ کیا پردہ عورتوں کے لئے غلامی کی علامت اور آزادی کی منافی ہے؟ کیا پردہ عورتوں کی ترقی اور کمال میں مانع ہے؟ کیا پردہ کا عالمی اثر زائل ہوسکتا ہے؟ کیا موجودہ مادی مدنیت کی عورتیں کامل عورتیں ہیں؟ مسلمان عورت کی تعلیم کا احسن طریقہ کیا ہے؟

ساری کتاب محض عورت کے روایتی تصور کے اردگرد گھومتی ہو ایسا بھی نہیں ہے۔لیکن ساری کتاب اوپر پیش کردہ سوالات کے اردگرد گھومتی نظر آتی ہے۔اس طرح یہ مضمون مختصر لیکن معلوم افزا ہے۔

عروسہ فاروقی نے ''ممتاز شیریں کی افسانوی کائنات'' سے بحث کی ہے۔ وہ اپنے مضمون میں لکھتی ہیں کہ ممتاز شیریں اردو ادب کے افق پر ایک ایسا درخشندہ ستارہ ہے جو نہ صرف ایک بہترین افسانہ نگار ہے بلکہ ایک معتبر نقاد، کامیاب مترجم اور قابل تحسین مدیر کی حیثیت سے بھی جانی جاتی ہیں۔انہوں نے

مغربی ادب کا گہرائی سے مطالعہ کر کے جدید تکنیک کا استعمال کیا، شعور کی رو، آزاد تلازمہ خیال ان کے افسانوں میں جابجا نظر آتا ہے۔

اس جرنل میں شامل مضامین، افسانوں، تبصروں اور مکتوبات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عالمی خواتین نمبر پر مبنی یہ شمارہ دستاویزی حیثیت کا حامل ہوگیا ہے۔ایک ساتھ اتنی ساری معلومات کا فراہم ہونا بہت کم ہو پاتا ہے۔لہٰذا یہ رسالہ معلومات کا ایک خزانہ کہا جاسکتا ہے۔

Pricipal,Al - Hira Public School,Darbhanga(Bihar)
9431414808

◀◀ ● ▶▶

● سلمان عبد الصمد

رسالوں کی دنیا میں ''ثالث'' کا ثانی بہ مشکل تمام ہی ملتا ہے۔کیوں کہ اس کے کئی امتیازات ہیں:

اول: تسلسل کے ساتھ اس کی اشاعت ہوتی رہتی ہے۔ دوم: مواد کے انتخاب میں ادارتی ہنرمندی بہت واضح نظر آتی ہے۔سوم: ہر عمر کے لکھنے والوں کی شمولیت ہوتی ہے۔ چہارم: کسی بھی تحریک، فرد یا ادارے کو ''پروموٹ'' کرنے کی مہم سے یہ رسالہ ''پاک'' ہے۔پنجم: لفظی غلطیوں کو بھی دور کرنے پر خاصی توجہ دی جاتی ہے۔ششم: اداریوں میں عموماً ادبی سوالات کھڑے کیے جاتے ہیں۔ہفتم: غیر مطبوعہ مواد کی اشاعت پر توجہ دی جاتی ہے۔ہشتم: ہر شمارے میں کسی نہ کسی فرد پر گوشے کا التزام کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے ان خصوصیات کی بنیاد پر رسالے کی انفرادیت قائم ہوسکتی ہے۔''ثالث'' نے ہمیشہ مثبت ادب اور صالح فکر کی قدردانی کی ہے۔ اس میں سوالات سے لبریز تیکھے مضامین کو ترجیحی طور پر شامل کیا جاسکتا ہے۔موجودہ دور میں شائع ہونے والے بہت سے رسائل کے اداریے، مشمولات کے تبصروں پر مبنی ہوتے ہیں۔حالاں کہ، کم ازم کم، میرا مفروضہ یہ ہے کہ اداریہ کا قطعاً یہ مقام نہیں ہے۔اداریوں میں معاصر ادبی رجحانات اور رویوں کا عمومی تجزیہ کیا جانا چاہیے۔فکری بے راہ روی، زبان و بیان، ادبی موضوعات و مسائل، امکانات و تناظرات اور نظریات و عملیات کو موضوع بحث بنانا چاہیے۔''ثالث'' کا اداریہ عموماً مختصر ہوتا ہے اور سلگتے ادبی سوالات کا علمبردار بھی۔رسالے کے مشمولات پر رائے قائم کرنا تو قارئین و مبصرین کا فریضہ ہے، نہ کہ کسی مدیر کا۔

پیش نظر ''عالمی خواتین نمبر'' سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مدیر نے حصولِ مواد/انتخاب مواد میں اپنی مدیرانہ بصیریوں کا ثبوت دیا ہے۔ کیوں کہ بہت سے نمبرات میں انفرادی اور شخصی مضامین کی کثرت ہوتی ہے۔ جب کہ اس شمارے میں موضوعاتی، فکری اور شخصی تمام طرح کے مضامین شامل اشاعت ہیں۔

آج بھی یہ کہا جاتا ہے کہ خواتین قلم کاروں کی طرف التفات نہیں کیا جاتا ہے۔ان کا کوئی مقام

متعین کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی ہے۔اس ضمن میں یہاں دو باتیں عرض کرنا ضروری ہے:

اول: ایسا بہت کم دیکھا گیا کہ عورتوں کی تخلیقات پر عورتوں نے یکسوئی سے تنقید لکھنے کی کوشش کی ہو۔ راقم کا خیال ہے کہ اگر خواتین بھی، خواتین کی تخلیقات پر رائے دینے کی حکمت بنالیں تو خواتین کی تخلیقات کو پرکھنے کا رجحان عام ہوگا۔اس کا راست فائدہ یہ ہوگا کہ ادب میں خواتین ناقدوں کی کثرت ہوگی۔نفسیاتی تناظر میں ایک عورت ناقد خاتون تخلیق کار کا بہتر تجزیہ بھی کرسکیں گی اور مردوں کے برخلاف بہتر رائے بھی قائم کرنے میں حق بہ جانب بھی ہوں۔

دوم: کم از کم مجھے یہ بات تسلیم نہیں کہ مرد ناقدین عورتوں کی تخلیقات اور ادب پاروں پر کم توجہ دیتے ہیں۔میری اس رائے پر سوال یہ ہوگا کہ اگر عورتوں پر لکھا جاتا ہے تو ان کا مقام کیوں متعین ہو پاتا ہے؟ اس کا بہت ہی واضح جواب یہ ہے کہ مرد ناقدین عورتوں کے ادب پاروں کا انصاف پسند محاکمہ نہیں کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ لڑکوں سے لکھنے والی نئی لڑکیوں کو دو چار قدم آگے بڑھا کر پیش کر دیا جاتا ہے۔اس کا نقصان کچھ یوں ہوتا ہے کہ اِدھر معتبر مرد ناقدوں نے لڑکوں سے آگے بڑھانے کے لیے ہر ایک خاتون/لڑکی پر دل کھول کر لکھ دیا، اُدھر خواتین باہم معتبریت کی دعوے دار ہوگئیں۔ظاہر ہے ہمارے اس رویے سے نہ صرف ادب کا نقصان ہوا بلکہ بذات خود خواتین کا بھی۔ایسے میں کیسے خواتین لکھنے والوں کا واضح مقام قائم ہوسکتا ہے؟ ایک بات یہ بھی ہے کہ عورتوں پر لکھنے والے، نووارد خواتین قلم کار اور تجربہ یافتہ خواتین میں کوئی تفریق نہیں کرتے ہیں۔عموماً دونوں پر لکھے گئے تنقیدی مضامین کا لب ولہجہ یکساں ہوتا ہے۔انسیت اور ہمدردانہ اسلوب ہوتا ہے۔لکھنے والوں کے ذہن میں ادب پارہ نہیں بلکہ 'صنف نازک' کا خیال ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ خواتین لکھنے والوں کی تربیت ہو پاتی ہے اور نہ ہی ان کا کوئی واضح مقام متعین ہو پاتا ہے۔اس لیے مذکورہ سطور میں کہا گیا کہ اگر خواتین پر خواتین لکھنے لگ جائیں تو خوبیوں اور خامیوں کے اظہار کا امکان زیادہ رہے گا۔

پیش نظر شمارہ ''عالمی خواتین نمبر'' میں بہت سی خواتین نے خواتین کی تخلیقات پر بے باکی سے رائے دی ہے، یہ خوش آئند بات ہے۔اس شمارے کا یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ تنقیدی مضامین اور تخلیقات کی تعداد برابر ہے۔تقریباً ڈھائی درجن افسانوں کی اشاعت کی گئی ہے اور اتنے ہی مضامین کی بھی۔یہ اچھی بات ہے کہ تخلیق وتنقید کو ایک ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کی گئی ہے۔اگر افسانوی گوشے میں شامل افسانوں میں سے چند افسانوں کا فرداً فرداً تجزیہ بھی شائع کیا جاتا تو اور بھی اچھا ہوتا۔اسی طرح اس عالمی نمبر کی اہمیت اور بڑھ جاتی کہ عالمی/علاقائی زبانوں میں لکھنے والی خواتین کے چند افسانوں کے اردو تراجم بھی شامل کیے جاتے۔ ذیل میں ہم اداریے سے ایک اقتباس پیش کر رہے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ اس خواتین نمبر کا محرک کیا ہے

اور لکھنے والی خواتین کی تعداد کس حد تک اطمینان بخش ہیں:

''.....خیر جب رسالے کا اعلان ہوا تو بڑی تعداد میں قلم کاروں کی تخلیقات موصول ہونے لگیں۔ یہ دیکھ کر خیال آیا کہ کیوں نہ اس دفعہ خواتین پر گوشہ نکال دیا جائے لیکن جب رسالے کی ترتیب شروع کی گئی تو اندازہ ہوا کہ خواتین کا پلڑا کچھ زیادہ ہی بھاری ہوگیا ہے۔لہذا پہلے ''خواتین نمبر'' ہوا پھر'' عالمی خواتین نمبر'' میں تبدیل ہوگیا۔اس شمارے کو پڑھ کر قارئین کو اندازہ ہوگا کہ آجکل خواتین عالمی پیمانے پر کس طرح اردو زبان وادب کی خدمات انجام دے رہی ہیں۔اس شمارے میں اگر ایک طرف خواتین کے ذریعے لکھے گئے عالمانہ مضامین شامل ہیں تو دوسری جانب ان کے قلم سے نکلے ہوئے بہترین افسانے بھی ہیں۔'' (مدیر اعزازی: پروفیسر اقبال حسن آزاد)

اس میں شک نہیں کہ عالمی سطح پر بھی کسی نہ کسی طور اردو کا فروغ ہو رہا ہے۔ برصغیر ہندو پاک کے علاوہ اردو کی نئی بستیوں کے مرد وخواتین اردو کا دائرہ وسیع کر رہی ہیں۔بہترین افسانے اور غزلیں لکھ رہی ہیں۔ گلوبلائزیشن کے زمانے میں اردو خواتین کو بھی ترجمے کی طرف توجہ کرنی چاہیے، تاکہ ہم دوسری زبانوں کی ادبی سرگرمیوں اور رجحانات ومیلانات سے بھی بخوبی واقف ہوتے رہیں۔ کیوں کہ اردو میں تخلیق اور تنقید کے میدان میں خواتین طالع آزمائی تو کرتی ہیں تاہم صحافت اور ترجمے میں خواتین کی تعداد اطمینان بخش نہیں ہے۔

5/4 (4th floor) Near Nageena Store,Noor Nagar,
JamiaNagar ,New Delhi 110025 Mob: 9810318692

◀◀ ● ▶▶

● ڈاکٹر شاذیہ کمال

یہ بات قابل اطمینان ہے کہ موجودہ عہد میں خواتین ادبی شعبوں میں حاشیے پر نہیں ہیں اور یہ ان کے لیے خوش آئند بات ہے۔ادبی منظر نامے میں انھیں قبولیت بھی حاصل ہے اور مقبولیت بھی۔خواتین قلمکاروں وفنکاروں نے ادب کو زندگی سے قریب کر کے اسے معانی ومفاہیم عطا کیے ہیں یہی وجہ ہے کہ خواتین کو نظر انداز کرنا اب آسان نہیں ہے۔

زیر نظر رسالہ ''ثالث'' (عالمی خواتین نمبر، "شمارہ 15 و 16، جنوری تا دسمبر 2020ء) اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد اور مدیر ثالث آفاق صالح مبارکباد کے بیحد مستحق ہیں کہ انکی دلچسپی اور سعی سے خواتین کے ادب پر مبنی شمارہ کی اشاعت عمل میں آئی۔ 496 صفحات پر مشتمل یہ ایک کتابی سلسلہ ہے۔اس کا سرورق خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔اس میں شامل بیشتر قلمکار خواتین ہیں۔ چند مرد ادیبوں کی تحریروں کو بھی جگہ ملی ہے۔مگر ان تحریروں میں بھی صرف عورتوں سے متعلق ہی نگارشات شایع کی

گئی ہیں۔ یہ رسالہ حمد ونعت، نظم وغزل، مضامین، افسانوں، تبصروں اور مکتوبات سے مزین ہے۔

شمارے کا آغاز اقبال حسن آزاد کے اداریہ ''عالمی خواتین نمبر'' سے ہوا ہے۔ اپنے اداریہ میں موصوف نے اس سال آئی وبا کورونا سے انسانی معاشرے اور سماج پر مرتب ہونے والے اثرات پر روشنی ڈالی ہے اور اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا ہے کہ عالمی وبا پھیلنے کے باوجود کتب ورسائل کی اشاعت جاری رہی۔ آن لائن تعلیم کے ساتھ ہی آن لائن مذاکرے، سیمینار، مشاعرے سے ادبی فضا قائم رہی اور باذوق سامعین وناظرین کی علمی تشنگی بجھتی رہی۔ اداریے میں موصوف نے عورت کی اہمیت اور اسکے مقام ومرتبے پر بھی بڑے مدلل طریقے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

''مہمان اداریہ'' کے تحت ڈاکٹر افشاں ملک کا مضمون ''اردو کا نسائی ادب.....ایک مختصر جائزہ'' نے جگہ لی ہے۔ قریب دس صفحوں پر مشتمل عبارت میں محترمہ نے نثر ونظم میں خواتین کی خدمات کی جامع تلخیص پیش کی ہے۔ تقریباً تمام اصناف ادب میں خواتین کی حصہ داری اور انکے ادبی کارنامے کو بڑے معروضی طریقے سے قارئین سے روبرو کرایا ہے۔

شمارے کا باضابطہ آغاز شمسہ نجم کی ''حمد'' اور فوزیہ اختر ردا کی ''نعت'' سے ہوتا ہے۔ بعدازیں اسرارالحق مجاز کی ایک مخاطبانہ نظم ''نوجوان خاتون سے'' درج کی گئی ہے جس سے شمارے کی معنویت میں خاصا اضافہ ہوگیا ہے۔ حالانکہ یہ نظم جنگ آزادی کے دوران تخلیق کی گئی تھی مگر یہ ہر دور میں خواتین کی داخلی قوت کو متحرک کرنے والی نظم ہے۔ اسکے بعد غزل کا گوشہ ہے جس میں دیا جیم، حیا غزل، رضیہ حیدر خان، فرحین چودھری، انجم عثمان اور سلمیٰ حجاب کی غزلیں شامل ہیں۔ نظم کے گوشے میں نسیم سید، شاہین کاظمی، سدرہ سحر عمران اور سلمیٰ حجاب کو جگہ ملی ہے۔ بعدازاں رشمی بھاردواج کی ایک ہندی نظم کا ترجمہ ''ایک نظم شوہر کی محبوبہ کے نام'' ترجمہ نگار اسرار گاندھی) پیش کیا گیا ہے۔ اسکے بعد پاکستانی فنکارہ سدرہ سحر عمران سے لیا گیا انٹرویو (روما رضوی کے زریعہ) درج ہے۔ ''خصوصی مضمون'' میں نورالعین ساحرہ کا مضمون ''پاپولر فکشن کے حوالے سے اکیسویں صدی کے ادبی رجحانات وتضادات'' کو جگہ دی گئی ہے۔ ''تانیثیت'' کے زمرے میں مختلف قلمکاروں کی فکر ونظر داخل اشاعت ہے۔ اس میں الگ الگ عنوان سے نسترن احسن فتیحی، مشتاق احمد نوری، شموئل احمد اور ریاض احمد کے فکر وخیالات درج ہیں۔ مضامین کے گوشے میں مختلف تخلیقات وشخصیات پر مبنی تینتیس (33) مضامین شامل ہیں۔ ان میں ڈاکٹر منظر اعجاز، ڈاکٹر اقبال حسن آزاد، ڈاکٹر سید احمد قادری، شبیر احمد ڈار، ڈاکٹر محمد جعفر احراری جیسے اہم ادباء بھی شامل ہیں۔ ''منتخب افسانہ'' کے عنوان کے تحت پروفیسر نجمہ محمود کے افسانہ ''خالی جھولی'' کا انتخاب کیا گیا ہے۔ افسانے کے گوشے میں کل بتیس (32)

افسانے دیے گئے ہیں۔ ان میں نیلم احمد بشیر، نسترن احسن فتیحی، ڈاکٹر صادقہ نواب سحر، انجم قدوائی، نشاط پروین وغیرہ کے افسانے خصوصی توجہ کے طالب ہیں۔ ڈاکٹر فریحہ ظفر کا خط ''ایک خط.....علی گڑھ سے'' شامل رسالہ ہے۔ تبصرے کے زمرے میں ''جنگل کی آواز'' (پروفیسر نجمہ محمود کا افسانوی مجموعہ) پر سلمیٰ حجاب، ''روح دیکھی ہے کبھی؟'' (پاکستانی ادیبہ ہما فلک کا پہلا افسانوی مجموعہ) پر اقبال حسن آزاد، اور ''رعنائیاں درد کی'' (عثمانہ اختر جمال کا شعری مجموعہ) پر ڈاکٹر ایم۔ اے۔ او۔ جوہر کے تبصرے درج کیے گئے ہیں۔ مکتوبات میں رینو بہل (چنڈی گڑھ)، ڈاکٹر ریاض توحیدی (کشمیر)، عشرت ظہیر (گیا)، عزہ معین (ریسرچ اسکالر، دہلی یونیورسٹی)، سلیم انصاری (جبل پور)، وسیم احمد فدا (ہاپوڑ)، اور سریش کمار (علی گڑھ) کے خطوط شامل کیے گئے ہیں۔

الغرض ''ثالث'' کا یہ "عالمی خواتین نمبر'' حمد ونعت، نظم وغزل، مضامین، افسانے، تبصرے اور مکتوبات پر مشتمل ایک کتابی سلسلہ ہے۔ امید ہے اردو ادب کی ترویج وترقی میں یہ شمارہ معاون ثابت ہوگا۔

Guest Asst:Professor,B.B.A.University,Muzaffarpur
9386134522

◀◀ ● ▶▶

● هاشمی فاطمه

ادبی رسائل نے ہمیشہ ہی ادب میں رجحان سازی کے تئیں اہم کردار ادا کیا ہے۔ سر عبدالقادر کے 'مخزن'، نیاز فتح پوری کے 'نگار'، محمد طفیل کے 'نقوش'، ماہر القادری کے 'فاران'، محمود ایاز کے 'سوغات' قاضی عبدالودود کے 'معاصر' اور شمس الرحمٰن فاروقی کے 'شب خون' کی روشن مثالیں ہمارے سامنے ہے۔ جبکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نسائی ادب کے لیے ہمارے یہاں ہمیشہ ریلوے کی طرح الگ ڈبے مخصوص کیے جانے کی کوشش ہوتی رہی۔ اسے کبھی بھی مین اسٹریم ادب کا درجہ نہیں دیا گیا یا کم از کم اس کے لیے کوشش نہیں کی گئی۔ پہلی بار مونگیر (بہار، انڈیا) سے نکلنے والے بین الاقوامی جریدہ 'ثالث' نے کوشش کی ہے کہ خواتین کی تخلیقات کو بھی مرکزی دھارے کا حصہ سمجھا جائے۔ اس کے لیے 'ثالث' کے ایڈیٹر اقبال حسن آزاد نے ایک ضخیم شمارہ معنون کیا ہے اور خواتین کی خدمات کو مرکزی دھارے میں شامل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ پانچ سو صفحات پر مشتمل 'ثالث' کے زیر نظر شمارے (شمارہ نمبر ۱۵-۱۶) کو انھوں نے 'عالمی خواتین نمبر' (۲۰۲۰) کے نام سے شائع کیا ہے۔

'ثالث' اقبال حسن آزاد کی ادارت میں دس سالوں سے تواتر کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ گرچہ ہندوستان سے کثیر تعداد میں ادبی رسائل وجرائد شائع ہو رہے ہیں۔ مگر ان تمام رسالوں کے بیچ 'ثالث' ایک جداگانہ شناخت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ 'ثالث' کی شہرت کی بنیادی وجہ اس کے جمالیاتی مضامین کو سمجھا

جاتا رہا ہے۔لیکن اسی کے ساتھ اس شمارے کی اشاعت کے بعد ادب میں خواتین کے حقوق کے ترجمان کے طور پر بھی یاد رکھا جائے گا۔ اردو ادب کی خدمت کے حوالے سے صوبہ 'بہار' کی ایک منفرد پہچان رہی ہے۔اس شمارے کے توسط سے اس صوبے نے ایک اور امتیاز حاصل کر لیا ہے۔'ثالث' میں ہندوستان و پاکستان کے علاوے بنگلہ دیش، امریکہ، جاپان، کناڈا، بحرین، عمان، قطر، سعودی عرب کے ساتھ ساتھ دنیا کے دیگر ممالک سے تعلق رکھنے والے اصحاب قلم کے مضامین، افسانے، افسانچے، شاعری، تنقیدی مضامین اور خاکے وغیرہ متواتر شائع ہو رہے ہیں۔لیکن اس سال 'ثالث' نے وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے 'عالمی خواتین نمبر' کی اشاعت کا فیصلہ کیا جو واقعی قابل قدر ہے۔اس خصوصی نمبر میں بیشتر مضامین، افسانے، نظمیں اور دیگر تخلیقات خواتین کے ہی شامل کئے گئے ہیں۔اس طرح یہ شمارہ خواتین کی مکمل نمائندگی کر رہا ہے۔

'ثالث' کے اس خصوصی نمبر میں سب سے پہلے معروف صاحبِ قلم خواتین کے مضامین شامل ہیں۔ اداریہ کے بعد ابتدا میں شاعری کا حصہ ہے جس میں حمد، نعت، نظمیں، غزلیں، ہندی نظم وغیرہ شامل ہیں۔اس کے بعد محترمہ سدرہ سحر عمران / رومارضوی کا انٹرویو شائع ہوا ہے۔خصوصی مضمون کی حیثیت سے 'پاپولر فکشن کے حوالے سے اکیسویں صدی کے ادبی رجحانات وتضادات' کے عنوان سے نورالعین ساحرہ کا تجزیاتی مضمون شمارے کے وقار میں اضافہ کر رہا ہے۔اس مضمون میں اس صدی کے تمام مسائل اور امکانات کو وضاحتی پیرائے میں ساحرہ صاحبہ نے بیان کر دیا ہے۔اس کے بعد تانیثیت پر ۴/مضامین ہیں جو تانیثیت کے مالہ وماعلیہ کو اچھی طرح واضح کر رہے ہیں۔مشتاق احمد نوری کا مضمون 'تانیثیت کیا ہے' ایک علمی اور تجزیاتی مضمون ہے۔

اس کے بعد شمارے میں کل ۳۳/مضامین اور ۳۲/افسانے ہیں۔اس خصوصی شمارے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اقبال حسن آزاد نے اس شمارے میں ان تمام حضرات کو شامل کیا ہے جو نسائی ادب کے متعلقات پر لکھتے ہیں خواہ وہ نئے ہوں یا پرانے۔سبھی لکھنے والوں کو انھوں نے حسب مراتب جگہ دی ہے۔ افسانوں کی خاص بات یہ ہے کہ تمام افسانے عورت کی ہمہ جہت صلاحیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔کوئی بھی افسانہ ایسا نہیں ہے جو سماج کے اندر کسی فرقہ یا مذہب وملت کی دل آزاری کرتا ہو۔بیشتر افسانے ایسے ہیں جو کہ عورت کے اوپر ہو رہے مظالم کو بیان کرتے ہیں۔عورت جو گھریلو تشدد کی شکار ہے، ان کے حقوق کا اتلاف ہوا ہے، قانونی اعتبار سے وراثت میں حصہ داری سے محروم ہے، ان تمام زاویوں سے بھی افسانے اس میں شامل ہیں۔ یہاں پر ہر ایک مضمون یا افسانے پر تبصرہ تو ناممکن ہے۔البتہ کوشش کر رہی ہوں کہ کچھ مخصوص مضامین اور افسانے پر سرسری سا تبصرہ کر دوں۔'مہمان اداریے' کے طور پر ڈاکٹر افشاں ملک کا مضمون 'اردو کا نسائی ادب...ایک جائزہ' شامل ہے جو بہت ہی مدلل اور تاریخی نوعیت کا حامل ہے۔ پورا

اداریہ پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ گویا اردو افسانے کی پوری تاریخ سمیٹ دی گئی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ یہ مضمون طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کے لئے بہت مفید اور کارآمد ہے۔عنوان گرچہ 'اردو کا نسائی ادب...ایک جائزہ' ہے مگر اس میں نسائی ادب کی پوری تاریخ تفصیلی طور پر سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

'عورت اور معاشرہ' کے عنوان سے شموئل احمد کا مضمون تنقیدی نوعیت کا ہے اور تحقیقی بھی۔ظاہر ہے عورت کے مسائل کو شموئل جس انداز میں بیان کر سکتے ہیں کسی اور سے یہ امید نہیں کی جا سکتی۔اس مضمون میں عورت کے ساتھ ہو رہی سماجی ناہمواریوں کو پرکشش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔انھوں نے عورت کی ذاتی زندگی سے متعلق ان کی خواہشات اور ایام زندگی کے نشیب وفراز کو عام قاری سے روشناس کرانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔متمدن معاشرے میں عورتوں کا کیا مقام رہا ہے، اس کی ضرورت واہمیت سے بھی واقف کرایا ہے۔

'قرۃ العین حیدر اور آگ کا دریا' اقبال حسن آزاد کے قلم کا مرہون منت ہے جو ایک عمدہ اور تنقیدی وتجزیاتی مضمون ہے۔اس میں ناول کی خصوصیات، قصہ نگاری، مکالمہ نگاری وغیرہ کے ساتھ ساتھ اس کی تاریخی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔سماجی اعتبار سے اقبال حسن نے اس ناول پر مشتمل مضمون کے ذریعے قرۃ العین حیدر کی ذاتی زندگی سے جڑے واقعات کو ایک لڑی میں پرو کر بیان کیا ہے۔چونکہ ناول کا پلاٹ بیک وقت کئی مسائل سے آگہی عطا کرتا ہے، اس لیے کوئی اسے ہندوستان کی تاریخ کے خانے میں شمار کرتا ہے تو کوئی اسے عینی آپا کی تخیلات کی کارفرمائی کہتا ہے۔اس تناظر میں اقبال حسن نے ان تمام مغالطوں کا سد باب کیا ہے۔ڈاکٹر صالحہ صدیقی کا مضمون 'طنز ومزاح کی تاریخ میں خواتین قلم کاروں کی خدمات' بھی ایک عمدہ اور تاریخی وتنقیدی نوعیت کا مضمون ہے۔خواتین کی خدمات ادب کے ہر میدان میں رہی ہے، یہ ایک سچائی ہے۔اس بات سے انکار ادب کو نقصان پہنچانے کا سبب بنتا ہے لیکن افسوس کہ خواتین کی خدمات کو بالائے طاق رکھ کر ادب کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔

افسانے کی دنیا میں خواتین نے شاید مردوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے، اس شمارے کو پڑھنے کے بعد کچھ ایسا ہی گمان ہوتا ہے۔کیونکہ اس شمارے میں خواتین کے افسانے خواتین کی زندگی پر خود خواتین کے قلم سے لکھے ہوئے پڑھنے کو مل رہے ہیں، اس لیے ایک ایک افسانہ کہیں نہ کہیں انسانی زندگی کے کسی پہلو کو جھنجھوڑنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کوشش میں کامیاب بھی ہے۔یہ اس لئے بھی کہ عورت ہی انسانی زندگی کے ہر مسائل کا بڑی پامردی، ہمت اور بہادری سے مقابلہ کرتی رہی ہے جو کہ ایک مرد کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ یہاں پر یہ بات میں اس لئے بیان کر رہی ہوں کہ ایک عورت ہی ایک عورت کے دکھ درد کو سمجھ سکتی ہے اور ان افسانوں میں عورتوں نے اس بات کو سچ ثابت کر دکھایا ہے۔'دو نیناں' (ڈاکٹر رینو بہل)، 'رشتوں کی دیمک' (سلمیٰ جیلانی)،

'آدھی خودکشی' (فارحہ ارشد)، 'آدھی عورت' (گل ارباب)، 'طوائف کہانی' (مونا شہزاد) اور 'مایا' (ناہید طاہر) جیسے کچھ افسانے تو اس میں ایسے بھی پڑھنے کو ملے جس کو پڑھتے ہوئے ہم اپنے آنسوؤں کو روک نہیں پائے۔ مجموعی اعتبار سے اگر کہا جائے تو 'ثالث' کا یہ شمارہ بہت عمدہ اور بیش قیمت ہے اور ایک تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ اسے ادب کے ایک نایاب ذخیرے کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ اس کا اندازہ شمارے میں آخری صفحات پر شائع خطوط سے بھی ہوتا ہے، جس میں ملک اور بیرون ملک سے قارئین نے اپنی آرا کا اظہار کیا ہے۔

رسالے کا سرورق 'محمد نعیم یاد (پاکستان) نے ڈیزائن کیا ہے جو بہت ہی دلکش اور جاذب نظر ہے۔ کمپوزنگ کی غلطی بھی پہلے صفحے سے لے کر آخری ورق تک نظر نہیں آتی۔ یہ چیز کسی بھی کتاب یا رسالے کی مقبولیت کے لیے بے حد ضروری ہوتی ہے اور یہ خوش بختی 'ثالث' کے حصے میں آئی ہے جو خوش آئند ہے۔ اپنی بات اس امید و یقین کے ساتھ ختم کرتی ہوں کہ 'ثالث' کا یہ شمارہ ہماری ادبی تاریخ میں زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے حوالے سے ایک سنگ میل ثابت ہوگا، کیوں کہ نسائی ادب کے فروغ میں جس خلا کو عرصے سے محسوس کیا جا رہا تھا، اسے 'ثالث' کا یہ شمارہ پُر کرتا نظر آ رہا ہے۔ پانچ سو صفحات کے رسالے کی قیمت پانچ سو روپے رکھی گئی ہے جو بہت زیادہ نہیں ہے۔ اس لیے نسائی ادب کے شیدا قارئین سے رسالہ خرید کر پڑھنے کی گزارش کی جاتی ہے۔ ناشر کے نمبر (8210498674) پہ رابطہ کر کے مطبوعہ کاپی حاصل کی جا سکتی ہے۔ امید ہے دلِ مضطر اسے شوق کے ہاتھوں قبول کریں گے۔ رہے نام اللہ کا۔

Jalapur, Ambedkar Nagar(U.P)

◀◀ ● ▶▶

سہ ماہی ''انتساب''	بزم ادب
سرپرست: انل اگروال	مدیرہ: ہما خلیل
مدیران: ڈاکٹر سیفی سرونجی، آفاق سیفی، محمود	صفحات: ۲۷۲
ملک، استوتی اگروال	قیمت: ۱۰۰/روپے
صفحات: ۳۰۰ قیمت: ۱۰۰/روپے	رابطہ: مکان نمبر۔۴/۱۳۶۷
رابطہ: سیفی لائبریری، سرونج۔۴۶۴۲۲۸	سرسید نگر، علی گڈھ۔۲۰۲۰۰۲
9977955000	9837323320

مکتوبات

● ثالث کا عالمی خواتین نمبر موصول ہوا۔ اس عنایت کا شکریہ۔ اس بات کا بھی شکریہ کہ آپ نے میرے مضمون کو جگہ دی۔ مجلّہ پڑھنے میں وقت لگے گا۔ آپ نے تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے۔ ریسرچ اسکالر استفادہ کریں گے اور مجھ جیسے لوگوں کو تانیثی ادب سمجھنے میں مدد ملے گی۔ آپ کا اداریہ دلچسپ ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ عورت بات بات پر مردانگی نہیں دکھائی۔ وہ مرد پر تھپڑوں کی بارش نہیں کرتی۔ میری ایک دوست کی ماں اپنے شوہر کو پٹخ دیتی تھی اور اس کے سینے پر بندوق رکھ کر چڑھ جاتی تھی اور کہتی تھی۔ 'اب بول۔' لیکن شوہر کو لذیذ اور مقوی غذا بھی کھلاتی تھی۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ مارتی ہے لٹھی کی مار اور کھلاتی ہے سونے کا نوالہ۔ افشاں ملک نے نسائی ادب کا عمدہ جائزہ لیا ہے۔ نسیم سید کی نظم جو تیور رکھتی ہے اس تیور کی ضرورت آج کے نسائی آدب کو ہے۔ شموئل احمد (حیدرآباد، انڈیا)

● ابھی ابھی ثالث کا خواتین نمبر موصول ہوا۔ بہت بہت شکریہ۔ اس ہمالیائی کارنامے کے لیے دل کی گہرائیوں سے آپ کے لیے دعائیں نکل رہی ہیں، اور میں آپ کو مبارک باد بھی دل کی گہرائیوں سے دے رہا ہوں۔ بہار کی سطح پر خواتین ادباء کا ایسا تفصیلی اور بھاری بھرکم، ضخیم جائزہ پیش کرنے والا، اب تک ثالث کے علاوہ کوئی دوسرا رسالہ نہیں ہے۔ اس اولیت کے لئے بھی مبارک باد۔ حسین الحق (گیا، انڈیا)

● بھائی اقبال حسن آزاد کی محبت ثالث کے عالمی خواتین نمبر کی شکل میں دستیاب ہوئی۔ یہ شمارہ نمبر۔۱۵۔۱۶ ہے اور اشاعت جنوری تا دسمبر ۲۰۲۰ء کی ہے۔ ۵۰۰/صفحات کے اس شمارے میں کم و بیش ۱۰۰/تخلیقات شامل ہیں جن میں مضامین افسانے اور شعری تخلیقات شامل ہیں۔ اس کی طباعت ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی سے ہوئی ہے جو پورے ملک میں کتابوں کی بہترین اشاعت کے لیے مشہور ہے۔ اس خوبصورت اور باوقار رسالے کی قیمت صرف ۵۰۰/روپے ہے اور اسے شاہ کالونی۔ شاہ زبیر روڈ۔ مونگیر ۸۱۱۲۰۱ بہار سے شایع کیا گیا ہے۔ آزاد صاحب کے موبائل نمبر 9430667003 اور 8210498674 پر رابطہ کر کے حصولیابی کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ اس کا سرورق پاکستان کے محمد نعیم یاد نے تیار کیا

ہے۔تخلیق کاروں کی تصاویر سے مزین یہ رسالہ بہت دیدہ زیب بھی ہے۔ میں اقبال حسن آزاد کی کاوشوں کو سلام کرتا ہوں اور انہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

مشتاق احمد نوری (پٹنہ، انڈیا)

- بہت عمدہ شمارہ آپ نے شایع کیا بلکہ بہترین کہ میں اس کی تعریف نہیں کر پا رہی ہوں۔ بہت محنت سے اور کسی سے متاثر ہوئے بغیر آپ نے اسے شایع کیا ہے۔ جو صحیح صحافیانہ ذمہ داری ہوتی ہے اس کو آپ نے پورا کیا ہے، نبھایا ہے۔ اور اس سے آپ کی شخصیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ آپ کسی بھی قسم کی ادبی پالیٹکس میں شامل نہیں ہیں۔ میں نے پورے رسالے کی ورق گردانی کی اور مجھے محسوس ہوا کہ آپ نے واقعی بہت بڑا کام کیا ہے۔ بڑی محنت اس میں آپ نے کی ہے۔ آپ کے اداریہ کو میں نے پہلے سرسری طور پر پڑھا تھا لیکن جب دوبارہ پڑھا تو اس میں آپ نے عورت کے بارے میں جو لکھا ہے وہ تو اردو میں بڑے بڑے نہیں لکھ پائیں گے۔ آپ کا خاص نکتہ جو دینی فکر کے تحت آتا ہے کہ عورت کی عظمت کو ہمارے دین نے بہت بلند مقام دیا ہے، مجھے بہت پسند آیا۔ اس کی جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔ بہت ہی خوبصورتی سے، بڑی جد و جہد کے بعد آپ نے اس رسالے کو شایع کیا ہے۔ میں بالکل unvoiced ہوں۔ میں آپ کی بہت زیادہ قدردان ہوں۔ ابھی اور کارنامے انجام دینے ہیں آپ کو۔ مجھے شایع کر پانا جوئے شیر لانا ہے۔ میں نے تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے، ہمہ جہت ہوں۔ لیکن کئی اصناف کے ذکر میں میرا نام نہیں ہے۔ میرے ادبی قد کا تعین ہما شما کے بس کی بات نہیں۔ آپ نے میرا افسانہ منتخب کیا جبکہ شر پسندوں نے فورم پر جملے بازی کی تھی۔ میں آپ کی بے انتہا شکر گزار ہوں۔ نجمہ محمود (دبئی)

- کتابی سلسلہ ''ثالث'' مونگیر کا تازہ شمارہ ''عالمی خواتین نمبر'' موصول ہوا۔ اس عنایت کے لیے رادرم ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

''ثالث'' آج کے ان معدودے چند قابل مطالعہ اردو رسائل میں شامل ہے جو نمائندہ ہمعصر شعری ونثری تخلیقات وتحریرات کے خوبصورت اور ایک حد تک معیاری کتابی سلسلہ کی شکل میں پابندی کے ساتھ شائع ہوتا رہتا ہے۔ تازہ شمارے کا قابل تحسین پہلو یہ ہے کہ اس کی اشاعت ایک نہایت دل شکن اور بلا خیز دورانیے میں ہوئی ہے جس میں تمام ذہنی وجسمانی کاوشیں اور علمی وعملی کوششیں ایک صبر آزما تعطل وتساہل کا شکار ہیں۔ اس لحاظ سے اقبال حسن

آزاد صاحب خصوصی تحسین وتبریک کے مستحق ہیں۔ میں انتہائی مسرت ومحبت وتشکر کے احساس کے ساتھ انہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں اور آرزومند ہوں کہ ثالث مستقبل میں مزید قابل ذکر فتوحات کی تاریخ مرتب کرے گا۔ عین تابش (گیا، انڈیا)

- آپ کا بھیجا ہوا تازہ شمارہ عالمی خواتین نمبر موصول ہوا۔ اب کیا کہوں اس شمارے کے بارے میں، میرے پاس الفاظ کم پڑ گئے۔ ایک ہی بات کہوں گی.....واہ واہ.....لاجواب۔ دنیا کے ہر کونے سے آپ نے ادبی ستاروں کو ایک جگہ سجا دیا۔ ایک سے بڑھ کر ایک افسانہ، افسانوں کا انتخاب بھی کمال معیاری بھی، دلچسپ بھی۔ اس کامیابی کے لئے آپ مبارکباد کے نہیں، ستائش کے بھی حقدار ہیں۔ جیتے رہیں، خوش رہیں اور اسی طرح لاجواب شمارے نکالتے رہیں۔ (رینو بہل، چنڈی گڈھ، انڈیا)

- کتابی سلسلہ ثالث کا نیا شمارہ ۱۵۔۱۶ (عالمی خواتین نمبر) نظر نواز ہوا۔ مدیر محترم اقبال حسن آزاد صاحب ہر نئے شمارے کے ساتھ قاری کو خوشگوار حیرتوں سے ہم کنار کر رہے ہیں۔ اس شمارے کی قراءت سے اندازہ ہوتا ہے کہ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا پر وقت کی بربادی اور کتاب بیزاری کے اس دور میں بھی خواتین ادب کو کیسے کیسے شاہکار سے نواز رہی ہیں۔ ایک طرف جہاں اس خوبصورت اور ضخیم شمارے میں خواتین قلم کاروں کے فن اور شخصیت پر عمدہ اور کارآمد مضامین ہیں، وہیں سماج کے سلگتے ہوئے مسائل، معاشرت اور انسان کی ذات کے اندرون پلنے والے کرب اور دیگر اہم موضوعات پر عالمی اردو بستی میں بسنے والی فی زمانہ موجود خواتین افسانہ نگاروں کے ذریعے لکھے گئے عمدہ اور لائق مطالعہ افسانے شامل ہیں۔ مجموعی طور پر کہا جائے تو ادب کے ایک سنجیدہ قاری کی ضیافت کا مکمل انتظام کیا ہے مدیر محترم نے.....!!! امید ہے کہ اردو حلقوں میں ثالث کا یہ شمارہ تادیر یاد رکھا جائے گا۔

وسیم احمد فدا (ہاپوڑ، انڈیا)

- آج کی رجسٹری ڈاک سے ''ثالث'' شمارہ نمبر ۱۵۔۱۶ (عالمی خواتین نمبر) موصول ہوا۔ اس کرم فرمائی کے لیے ممنون ہوں۔ اپنا ساخبط آپ کے اندر پا کر تحیر خیز فرحت محسوس کرتا ہوں کہ اب ہم جیسے جیالے بھی کہاں اس بے چاری زبان کو میسر آئیں گے۔ خدا آپ کی محنت اور لگن کو قبول فرمائے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

وسیم فرحت علیگ، (مدیر رسالہ ''اردو'' امراوتی، انڈیا)

● اقبال حسن آزاد صاحب سب تو پڑھ ہی نہیں پائی کہ سر کا درد زیادہ مطالعہ کرنے نہیں دیتا۔ جتنا پڑھا ہے اس لحاظ سے بہت ہی عمدہ پیش کش ہے۔ افسانے، مضامین خاص طور پر شموئل احمد صاحب کا انٹرویو اور افشاں ملک صاحبہ کا ''اروکا نسائی ادب'' کا مضمون بہت پسند آیا. تمام افسانہ نگاروں نے بہترین افسانے اس شمارے میں بھیجے۔ نورالعین ساحرہ کا ''پاپولر فکشن کے حوالے سے اکیسویں صدی کے ادبی رجحانات اور تضادات'' ایک اچھی کاوش ہے۔ یہ شمارہ آپ کی دن رات کی محنت اور لگن کا خوبصورت عکس ثابت ہوا۔ اللہ آیندہ بھی اس کام میں ترقی اور کامیابی عطا کرے آمین! (فرحین جمال، بیلجیم)

● ارزاں کرے نہ کوئی متاع سخن کہ ہم لفظوں کا اعتبار بڑھانے کو آئے ہیں
(اختر پیامی)

آپ کی عرق ریزی کا انعکاس ''ثالث'' کا نیا شمارہ موصول ہوا۔ یہ عالمی خواتین نمبر بلاشبہ حسن اور معیار کا سنگم ہے۔ مونگیر کا نام ادبی دنیا میں مستحکم کرنے کی جد و جہد میں آپ ہمہ تن مصروف ہیں۔ ایک مخصوص تہذیبی پس منظر رکھنے والا یہ شہر اردو دنیا میں اب خاصا جانا پہچانا جانے لگا ہے۔ ''ثالث'' کے ہر شمارے کو خوب سے خوب تر بنانے کی آپ کی کوشش نے اس ادبی سفر کو آغاز ہی سے پُر وقار بنا دیا ہے۔ سچ پوچھئے تو شروع میں تو مجھے نہیں لگا تھا کہ اس کا پہلا شمارہ ایک ایسا سنگ بنیاد ثابت ہوگا جس پر تعمیر ہونے والا مینار ادب ہر لمحہ بلند سے بلند تر ہوتا جائے گا۔

اس بار شمارہ دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ کیا خوبصورت بساط ادب سجائی ہے آپ نے۔ میں ذاتی طور پر ادب کو تخلیق کاروں کی جنس کے اعتبار سے تقسیم کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ تاہم یہ بات بھی سچ ہے کہ بعض خواتین تخلیق کاروں نے ادب کو عورت کی نفسیات کی ان دِشاؤں سے متعارف کرایا ہے جہاں تک مرد تخلیق کاروں کی رسائی ممکن ہی نہ تھی۔ بیشتر مشمولات معیاری ہیں اور آپ کے حسن انتخاب کی دلیل۔ آپ کی جدت پسند طبیعت نے اس نمبر کو ایک ایونٹ بنا دیا ہے۔

آپ کے اداریوں میں بڑے پتے کی باتیں ہوتی ہیں۔ آپ کے علم کی یہ خوبی ہے کہ مشکل سے مشکل نکتے کو بھی آسانی اور سادگی کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں جنہیں پڑھ کر اذہان آسودگی پاتے ہیں، علم کے پیاسوں کی سیرابی ہوتی ہے اور سوچنے والوں کے لیے نئی راہیں کھلتی ہیں۔ اس بار کے اداریے میں آپ نے ایک طرح سے ثالث کی نہج اور رفتار کا تعین کیا ہے اور گوشے کی اشاعت کے سلسلے میں بے حد اہم باتیں کہی ہیں۔ آپ کا وژن بالکل

صاف ہے۔ آپ اگر اردو کی روٹی کھاتے ہیں تو پوری سنجیدگی اور سپردگی کے ساتھ اردو زبان و ادب کی خدمت کا جذبہ بھی اپنے اندر رکھتے ہیں ورنہ زیادہ تر لوگ تو اسی درخت کو کاٹ رہے ہیں جس کی شاخ پر ان کا آشیانہ ہے۔

اردو آج بھی میڈیا اور عوام کی زبان ہے لیکن وہ لوگ جن کی مادری زبان اردو ہے وہ اپنی زبان سے لاتعلق ہوتے جا رہے ہیں۔ نہ اردو سیکھنا چاہتے ہیں اور نہ ہی پڑھنا۔ انہیں حرف تہجی کی کچھ خبر ہے نہ رسم الخط کا کچھ پتہ ہے۔ اپنے ہی ملک میں اپنوں ہی کے ہاتھوں یہ در بدری کا شکار ہو رہی ہے۔ جس صوبے میں اسے سب سے پہلے سرکاری زبان کا درجہ ملا وہیں اسے کبھی اسکول سے نکالا جاتا ہے اور کبھی نصاب سے۔ معاملہ اتنا بگڑتا جا رہا ہے کہ اس پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ایک افسوس ناک پہلو یہ بھی ہے کہ اردو دنیا بھر میں پھل پھول رہی ہے۔ اس کی خوبصورتی اور شیرینی کے سبھی قائل ہیں لیکن.....؟

زیر نظر شمارے کی ایک واضح خصوصیت کورونا کے دل شکن اور بلا خیز وبائی دور میں اس کی اشاعت ہے۔ زندہ رہنا انسان کے لیے کبھی آسان نہیں تھا لیکن زندہ رہنے کے لیے مسلسل مرنے کا عمل کچھ ہمارے عہد کی ہی دین ہے۔ ہم اردو والے ایک زمانے سے اس بات پر فخر کرتے آ رہے ہیں کہ کیسا ہی قحط کیوں نہ پڑے، ہم عشق کرنے اور شعر کہنے سے باز نہیں آئیں گے۔ شاید اس کی ایک وجہ ہماری وہ ہٹ دھرمی ہے جو زندگی کو اس کی موجودہ شکل میں قبول کرنا تو درکنار اس کو دیکھنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتی۔ تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح اس وبائی دور میں آپ کی یہ پیش کش قابلِ تعریف ہی نہیں قابل صد ستائش ہے اور آپ اس کے لیے خصوصی تحسین و تبریک کے مستحق ہیں۔ آپ نے اس نسائی شعری و نثری ادب کے دستاویز کو شایع کر کے علمی و ادبی حلقے کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ یہ شعر شکیب جلالی نے شاید آپ کے لیے ہی کہا تھا۔

شکیب اپنے تعارف کے لیے یہ بات کافی ہے
ہم اس سے بچ کے چلتے ہیں جو رستہ عام ہو جائے

یہ ایک بے حد رسمی بات ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ مجھے یہ شمارہ بہت پسند آیا ہے.....اس لیے یہ سب نہیں کہوں گا۔

تعریف حسن اصل میں توہین حسن ہے

میں ''ثالث'' جیسے رسالے کو اردو کے دامن پر خوشنما گلاب تصور کرتا ہوں جس میں پھول بھی

ہوتے ہیں اور کانٹے بھی ، نیرنگی بھی ہوتی ہے اور تازگی بھی ، شگفتگی بھی ہوتی ہے اور رعنائی بھی ، خوشبو بھی اور جاذبیت بھی .....اس کے حسن سے دل و دماغ مہکتا بھی ہے اور چمکتا بھی ۔ مبارکباد دینے کے لیے بھی شبدوں کا سہارا چاہئے ۔ کاش ، محسوس کیا ہوا ہر جذبہ بیان کیا جاسکتا ۔ برادرم شہپر رسول کا یہ شعر شاید میرے جذبے کی ترجمانی کر سکے ۔

وہ بے زباں نہیں ہے تو کم نظر ہوگا
جو چشم و لب ترے دیکھے مگر غضب نہ کہے

آپ ادب پر اچھی نظر رکھتے ہیں اور اس کی تیز رفتار تبدیلیوں سے اچھی طرح واقف ہیں ۔ آپ ایک تخلیقی فنکار ہیں ۔ ایک اہم افسانہ نگار.....آپ جیسے تخلیقی فنکاروں کی مجموعی خدمات کا ملک گیر پیمانے پر اعتراف ہونا چاہیے ۔ آپ پر بھی گوشہ آنا چاہیے ۔ آپ کا بھی حق ہے کہ آپ کے فن اور شخصیت پر مقالے لکھے جائیں ۔ حق داروں کی یہ حق تلفی تا کے؟

ڈاکٹر ارشد رضا (مدیر اندیشہ، بھاگلپور، انڈیا)

● عروج آدم نسواں سے ہم انگشت بدنداں ہیں

اقبال حسن آزاد نے تازہ بہ تازہ اور بہترین ادب پاروں سے مزین مقبول رسالہ ''ثالث'' کا عالمی خواتین نمبر مرحمت فرمایا ہے ۔ ان کا بہت شکریہ ۔

''ثالث'' کا یہ شمارہ ، سرورق کی دلکشی ، نگارشات اور موضوعات کے تنوع اور ترتیب و تدوین کی خوش سلیقگی کے لحاظ سے جاذب نظر اور فکر انگیز دستاویزی حیثیت کا حامل ہے ۔

عجیب المیہ گزرا ہے کہ عرصہ تک عورت کے مقام و مرتبہ کے تعین میں افراط و تفریط سے کام لیا گیا ۔ عورت کو ملعون اور قابل گردن زنی ٹھہرایا گیا ۔ اسے شیطان کی ایجنٹ اور معصیت کا سبب قرار دیا گیا ۔ حتیٰ کہ آدم کے جنت سے نکلنے کا ذمہ دار بھی عورت کو گردانا گیا ۔ لیکن اسلام نے انقلاب آفریں افکار کے ذریعے عورت کو پُر وقار اور باعث تکریم حیثیت عطا کی ۔ قرآن کہتا ہے ۔ ''بے شک مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست (مددگار) ہیں ۔'' اور رسول رحمت (ص) نے فتح مکہ کے بعد فرمایا ''آبگینوں کے ساتھ نرمی اور ملائمیت کا سلوک کرو ۔'' اسلام کی ان تعلیمات نے ہی عورت کو معاشی اور تمدنی حقوق عطا کئے ۔ عورت کو ماں ، بہن ، بیٹی ، بیوی کی صورت میں پُر وقار اور باعزت طور پر سماج میں متمکن کیا ۔ اور اب عورت روحانی ، اخلاقی اور انسانی اعتبار سے اہمیت اور مرتبہ پا کر اپنے جنس مخالف یعنی مرد کے شانہ بہ

شانہ زندگی کے ہر شعبے اور خطے میں ، اس کی ہم رکاب ہے ۔ خواتین نے ادب و شعر کی دنیا میں بھی اپنے جوہر کو جس طرح برتا ہے اور اپنے اسلوب ، طرز ادا اور موضوعات کی دلکشی اور تنوع کے سحر انگیز مینار خلق کئے ہیں اس کی واضح مثال یہ شمارہ ''عالمی خواتین نمبر'' ہے ۔ ذہنی اُتھل پتھل اور بے چینی کی کیفیت ''فنکار'' کے حصے میں کچھ زیادہ ہی آئی ہے ۔ وہ لمحہ بہ لمحہ اپنے تصورات کی تشکیل و تکمیل میں ایک ''عجیب ادبی حریصانہ'' طبیعت کے زیر اثر تبدیلیاں کرتا رہتا ہے ۔ اختر الایمان کی معرکہ آرا نظم ''وہ لڑکا'' متعدد بار لکھنے اور رد کرنے کے عمل سے گزرنے کے بعد پائے تکمیل کو پہنچی ۔ اسی طرح اقبال حسن آزاد بھی ، اس مجلّہ کی پیش کش کے سلسلے میں کئی مرحلے سے گزرے ۔ اور کئی تبدیلیوں کے بعد موجودہ صورت میں یہ مجلّہ تشکیل پا سکا ۔ ان کے اداریہ کے مطابق پہلے ''خواتین گوشہ'' کا خیال رہا ۔ اس کے بعد ''خواتین نمبر'' کا ارادہ ہوا اور بالآخر بہترین معیار اور تنوع کی چاہت نے اسے ''عالمی خواتین نمبر'' کی صورت پائے تکمیل کو پہنچایا ۔ مہمان اداریہ کے طور پر ڈاکٹر افشاں ملک کا ، اس موضوع پر ، تحقیقی انداز فکر کے ساتھ تاریخی سچائیوں کو واضح کرتا مبسوط مضمون ''اردو کا نسائی ادب.....ایک مختصر جائزہ'' گویا قابل قدر اور پُر وقار سفر کی روئیداد ہے ۔ اس مضمون سے سچائیوں سچائیوں سے لبریز ، معصومانہ اور پُر اثر ڈاکٹر فریحہ ظفر کے ''ایک خط علی گڈھ سے.....'' تک تخلیقات کی دلکش اور لائق ستائش دنیا آباد ہے ۔ اس تمکنت انگیز ادب کی یکجائی کے لئے اقبال حسن آزاد کو مبارکباد!

عشرت ظہیر (گیا، انڈیا)

● آج سویرے جناب اقبال حسن آزاد کے توسط سے ''ثالث'' کا تازہ شمارہ ہاتھ لگا تو کچھ فرصت ملتے ہی پڑھنے بیٹھا ۔ سبین علی کا افسانہ ''سیلمون فش'' جیسے ہی نظر سے گزرا تو اپنا گزشتہ ہفتے کا واقعہ یاد آ گیا اور پھر افسانہ مکمل پڑھے بغیر نہ رہ سکا ۔ ہوا کچھ یوں کہ چند ضروری امور کے سلسلہ میں مجھے شہر سے باہر اک ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا ۔ بکنگ وغیرہ مکمل ہو چکنے کے بعد شام کو مینو دیکھا تو کچھ بھی حلال نہ ملا ۔ اب وہ مقام اور وقت ایسا کہ دیگر کوئی آپشن نہ بچی اور رات گے ہونے کے سبب بھوک بھی زوروں پہ تھی ۔ خیر پیٹر (منیجر) سے بات چیت سے پتہ چلا کہ صرف ''سیلمون مچھلی'' سے ہی کام چلے گا ۔ مسلسل دو راتیں اسی مچھلی سے پیٹ پوجا کی اور ذائقہ بھی مناسب رہا ۔ افسانہ پڑھتے ہوئے مچھلی کا ذائقہ مسلسل ساتھ رہا ، کہانی کی بنت کا عکس دیتا عنوان قابل توجہ ہے ۔ آپ دوست جب افسانہ پڑھیں تو دھیان میں رکھیں کہ یہ مچھلی کی وہ

قسم ہے جو پیدا تازہ پانیوں (دریا) میں ہوتی ہے اور پھر نمکین پانی (سمندر) میں سیزن گزارتی ہے۔ جب بچے دینے کا وقت آتا ہے تو واپس تازہ پانیوں کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ کہانی کے اکثر کردار سیلمون فش جیسے ہیں مگر واپس تازہ پانیوں کی طرف تب لوٹتے ہیں جب تک بانجھ پن یا زرخیزی کی عمر سے آگے بڑھ چکے ہوتے ہیں۔ کچھ جملے کاٹ دار ہیں، تلخی ایسی کہ لطف بھی بیک وقت دے جاتی ہے۔ کہانی کے موزوں عنوان پہ محترمہ سبین علی کو مبارکباد۔

بلال مختار (آسٹریلیا)

- ۱۸ ستمبر کو مجھے ''ثالث'' موصول ہوا۔ اقبال حسن آزاد سر کی بلند ہمتی اور لگن پر رشک آتا ہے۔ انہوں نے اس وبائی دور میں خواتین نمبر نکال کر قارئین لیے دلچسپی کا سامان پیدا کیا ہے۔ اس میں میری نعت کی شمولیت باعث مسرت ہے۔ کولکاتا کے مستند شاعر محترم مسلم نواز سر نے مجھے کال کر کے نعت کی اشاعت کی مبارکباد دی اور مجھے کولکاتا کی شاعرات میں صفِ اول قرار دیا۔ انہوں نے اس شمارے کی بہت تعریف کی اور اس کے مضامین و منظومات کو معیاری و دلچسپ قرار دیا۔ میں اپنے بزرگ شعرا و مدیران کی بے حد ممنون ہوں کہ وہ نئی نسل کی حوصلہ افزاء میں کوئی کمی نہیں کر رہے ہیں۔ ثالث خواتین نمبر کا مطالعہ جاری ہے۔ یہ شمارہ کسی خزانے سے کم نہیں معلوم ہوتا ہے جس میں ساری دنیا سے خواتین قلم کار کی بیش قیمت تصنیفات شامل کی گئی ہے۔ اس نمبر کی شہرت میں، میں روز بروز اضافہ دیکھ رہی ہوں۔ دعا ہے کہ یہ رسالہ اسی طرح اپنی آب و تاب برقرار رکھے۔ آمین! اقبال حسن آزاد سر کی ادب دوستی پر دل نازاں ہے۔

فوزیہ اختر ردا (کولکاتا، انڈیا)

- اقبال حسن آزاد صاحب کی محبتوں کے لئے ممنون ہوں۔ ۴۹۶ صفحات پر مشتمل ''ثالث'' کا یہ ضخیم خاص نمبر (عالمی خواتین نمبر) یقیناً ایک اہم شمارہ ہے۔ ریپر کھولنے کے بعد بیٹھے ہی بیٹھے تین نگارشات پڑھ ڈالیں۔ نئے اور پرانے لکھنے والوں کو یکجا کر کے آپ نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ آپ کی یہ کاوش نہایت قابل تعریف ہے۔ جاوید نہال حشمی (کولکاتا، انڈیا)
- انڈیا سے ضخیم "ثالث'' عالمی خواتین نمبر "شایع ہوے۔ اس میگزین کی اشاعت نے خواتین پر کام کرنے والے محققین اور دیگر سکالرز کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ میرے نزدیک اس اشاعت کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں شایع ہونے والی خواتین کی اکثریت کی فکر کا انداز، ادب کے بارے میں ان کے نظریات، ان کے موضوعات رائج ادبی و سماجی نظریات

سے سراسر مختلف ہیں، بعض کے ہاں تو ادبی و سماجی بغاوت بہت نمایاں ہے۔ اگر یہ لہر طویل ہوئی تو جدید ادب پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوں گے۔ یہ رسالہ بھی تاریخ ساز ہو گا۔ اور بالخصوص ''خواتین ادب'' کے حوالے سے اس کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔

نصرت بخاری (اٹک، پاکستان)

- ''ثالث'' کا تازہ شمارہ جس کا انتظار شدت سے تھا بالآخر موصول ہوا۔ عالمی خواتین نمبر بلاشبہ ایک دستاویزی شمارہ ہے۔ ثالث نے بہت کم وقت میں مقبولیت، شہرت اور قبولیت کی جو مثال قائم کی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ اقبال حسن آزاد صاحب نے ''ثالث'' کو جس محنت، جانفشانی اور اپنی مدیرانہ صلاحیت سے رسالے کو عالمی سطح پہ ایک مقام دلایا اس کی مثال خال خال ہی نظر آتی ہے۔ اس تاریخی شمارے میں اس ناچیز کا بھی ایک مضمون ''مولانا آزاد اور مسلمان عورت'' شامل ہے۔ صدف اقبال (گیا، انڈیا)
- ''ثالث'' کے عالمی خواتین نمبر کے مطالعہ سے یہ احساس ہوا کہ یہ اردو ادب میں عورتوں کی آواز ہے۔ اس میگزن میں شایع تمام تخلیقات خون دل سے لکھی ہوئی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کتاب بھی کبھی کبھی استحصال کرتی ہے اور جو تھیوری ہمارے سامنے آتی ہے ضروری نہیں کہ وہ ہمارے لیے سودمند بھی ہو۔ کتابوں سے ہی ہم دنیا کے بہترین انسانوں کو اور ان کی اچھائیوں کو سمجھ پاتے ہیں۔ اور دنیا کو بہتر بنانے کی ذمہ داری بھی مرد حضرات کی ہے۔ مگر عورت وہ قوت ہے جو اپنے پاکیزہ جذبوں کے ساتھ دنیا کو سنوار رہی ہے..... مبارک باد مدیر اعزازی جناب اقبال حسن آزاد صاحب کو جنہوں نے ایک ساتھ معتبر خواتین کی فکر و نظریات کو پیش کیا۔ شبانہ جاوید (کولکاتا، انڈیا)
- کتابی سلسلہ "ثالث" کا تازہ شمارہ (عالمی خواتین نمبر) آج ہی ڈاک سے ملا۔ شکریہ بھائی اقبال حسن آزاد۔ کورونا کال میں جہاں بڑے بڑے کاروباری گھرانوں کے رسالے لڑکھڑا گئے یا دم توڑ گئے وہیں ثالث کے ۴۹۶ صفحات پر مشتمل اس بھاری بھرکم شمارے کی اشاعت ایک اچھی خبر ہے اور اس کے لیے بے شک اس رسالے کے مدیر اعزازی ڈاکٹر آزاد مبارکباد کے مستحق ہیں۔ فی الحال ''ثالث'' کے لیے نیک خواہشات!

سریش کمار (علی گڑھ، انڈیا)

◀◀ ● ▶▶